شمارہ ۔ [لاہور [جنوری

اس شمارہ میں

مدیر { پروفیسر سراج الدین
پروفیسر ایم ۔ اے ۔ مخدومی

معاونین { عبدالغفور چوہدری
فضل احمد

تعلیمی ماہ نامہ

آموزش

لاہور

جنوری سنہ ۱۹۵۶ء

جلد ——————— ۸

شمارہ ——————— ۱۰

سالانہ چندہ

پاکستان کے لیے ۶ روپے

غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز

یونی ورسٹی بک ایجنسی لاہور

آر۔ ایچ۔ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس میں طبع کرا کے
یونی ورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

اداریہ

"اگر ہم انسانی معاشرے میں باعزت شہریوں کی طرح زندگی گذارنا چاہتے ہیں تو ہمیں انسانی علم میں اپنے حصے کا اضافہ کرنا ہوگا۔ صرف دوسرے لوگوں کے سائنسی کارناموں سے فائدہ اٹھانے اور ان کی تقلید کر لینے سے ہم انسانی بھائی چارے میں کوئی مقام حاصل نہیں کر سکتے"!

یہ وہ الفاظ ہیں جو پاکستان کے وزیراعظم چوہدری محمد علی نے لاہور میں ایک سائنسی نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے کہے۔ جدید سائنسی دور میں یہ مشورہ جو اہمیت رکھتا ہے اس کے متعلق کسی لمبی چوڑی شرح کی ضرورت نہیں۔ آج قوموں کی قوت کا مدار محض ان کے صنعتی کارخانوں، اور لوہے اور فولاد کی جنگی مصنوعات پر نہیں بلکہ اس بات پر بھی ہے کہ ان کے ہاں کس پایہ کے سائنس دان اور انجینئر موجود ہیں اور ان کی یونی ورسٹیوں میں کس سطح پر تحقیقی کام ہو رہا ہے۔

دورِ حاضر کے سائنسی علوم نے انسانی زندگی کو ایک نئی تر و تازگی بخشی ہے، یہ درست ہے کہ سائنس کی بعض ایجادات ہلاکت آفرینیوں میں اپنی مثال آپ ہیں۔ لیکن یہ سائنس کا قصور نہیں، اس سے کام لینے والوں کی غلطی ہے۔ سائنس نے انسانی زندگی سہل اور خوش تر بنانے کے لیے بڑا کام کیا ہے۔ آج شہروں کی گہما گہمی اور دیہات کے مناظر دونوں سائنس سے متاثر نظر آتے ہیں۔ سائنس نے علم طب اور اصول علاج میں جو انقلاب پیدا کیا ہے اس نے انسانی زندگی کی مسرت میں بھاری اضافہ کیا ہے۔ زندگی کا کوئی بھی شعبہ ایسا نہیں جس نے سائنس سے

فائدہ نہ اٹھایا ہو۔ سائنس نے انسان کے طرز فکر تک کو بدل ڈالا ہے۔

غیر ترقی یافتہ ملکوں کے اکثر لوگ سائنس کے کرشموں کو حیرت سے دیکھنے پر اکتفا کر لیتے ہیں حالاں کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ حیرت انگیز کرشمے انہیں دعوت فکر دیں۔ سائنسی عجائبات کے سلسلے میں غور طلب سوال یہ ہونا چاہیے کہ آخر وہ کونسی قوت ہے جو انہیں وجود میں لائی؟ اس سوال کا جواب بالکل واضح ہے۔ سائنس کو ترقی دینے والی قوت وہ عمیق نگاہ ہے جو ہر قسم کے تعصبات اور صدیوں سے چلے آنے والے مفروضات کو چیرتی ہوئی حقائق کے چہرے تک پہنچنا چاہتی ہے سائنس کی تاریخ بڑی شدت سے اس بنیادی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ ترقی کا راز اس کے سوا کچھ نہیں کہ ذہن و فکر کی پرانی سرحدوں کو توڑ کر آگے پیش قدمی جاری رکھی جائے سائنس ٹکنالوجی اور طب کے میدانوں میں آج جو حیرت انگیز ترقی نظر آرہی ہے وہ اسی حقیقت کی منہ بولتی شرح ہے۔ سائنسی ترقی دراصل انسانی روح کو ہر قسم کی غلط بندشوں سے آزاد کر دینے ہی سے ممکن ہو سکتی ہے۔ یہ اس بات کا پیہم مطالبہ کرتی ہے کہ انسان اللہ کے سوا باقی ہر قسم کے خوف کو دل سے نکال کر فطرت کے بھیدوں کو جراءت سے حل کر لینے کی کوشش کرے۔

سائنس کے میدان میں رہنمائی کرنے کا کام ہماری یونیورسٹیوں کے ذمے ہے، مغربی ملکوں نے سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں جو کارنامے انجام دیے ہیں ان میں وہاں کی یونیورسٹیوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ پاکستان ایک نیا ملک ہے وہ نسبتاً ایک پسماندہ اور مفلس ملک ہے۔ وہ بجا طور پر اس بات کی آرزو رکھتا ہے کہ قومی تعمیر میں جو پیسہ بھی صرف ہو اس کی پوری پوری قیمت وصول ہو یونی ورسٹی تعلیم کی اولین غایت فکر و عمل کی نئی نئی راہوں کا کھوج لگانا ہے۔ ابھی ہماری یونیورسٹیوں کو اس بات کا ثبوت بہم پہونچانا باقی ہے کہ وہ اس قومی ضرورت کو اچھی طرح پورا کر رہی ہیں۔

یونیورسٹیوں کو اعلیٰ علوم اور تحقیق کے مراکز کے سوا اور کچھ نہ ہونا چاہیے۔ اس اہم فریضہ کی بجا آوری کے لیے یونیورسٹی طلبہ کو انفرادی فکر اور جراءت عمل کا سبق ملنا ضروری ہے۔ وزیر اعظم پاکستان نے اپنی تقریر میں اس نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ امید ہے پاکستانی یونیورسٹیاں ان کے مشورہ پر کان دھریں گی۔

نگلستان میں دینی تعلیم

مل احمد

انگلستان کے ۱۹۴۴ء کے قانون تعلیم کی رو سے نہ صرف دینی تعلیم لازمی قرار دی گئی ہے بلکہ
بھی لازمی قرار دیا گیا ہے کہ ہر مدرسے میں طلبہ روزانہ ایک بار عبادت میں شرکت کریں، اس قانون
مذہبی تعلیم کو نصاب میں اہم جگہ دی ہے۔ عیسائی مذہب کے مختلف فرقوں میں اعتقادی اختلافات
نے ہیں، ان کے باوجود مذہبی تعلیم کے متفق علیہ نصاب تیار کیے گئے ہیں، جن کی غایت طلبہ
عیسائی دین کے بنیادی معتقدات کی تعلیم دینا ہے، دینی تعلیم کے بارے میں اب بھی کافی اختلاف
ئے موجود ہے بعض کا خیال ہے کہ اس کا کام اس کے سوا کچھ نہ ہونا چاہیے کہ عیسائی دین کے
تعلق معلومات بہم پہونچائے، اس کے برعکس بعض اس بات کے حامی ہیں کہ دینی تعلیم کو پختہ
ہبی عقائد پیدا کرنے چاہئیں۔

تاہم ملک بھر میں اس معاملہ پر بڑی حد تک ہم آہنگی موجود ہے کہ دینی تعلیم کی بنیادی
یت کیا ہو۔ کلیسائے انگلستان کے ایک مشہور رہنما نے اس بنیادی نوعیت کو ان الفاظ میں
ان کیا ہے -

"مقصد کے معاملے میں کوئی اختلاف رائے موجود نہیں، تمام مسیحی فرقوں کی خواہش ہے
قومی نظام تعلیم اپنی روح۔ اپنی فضا اور اپنے مندرجات کے بارے میں بالکل مسیحی ہو"

اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ انگلستان میں اس بات کا تصور بھی نہیں
یا جا سکتا کہ ملکی نظام تعلیم کو مسیحی دینی روایات سے الگ کر دیا جائے۔ انگلستان میں کسی ایسے
رسے کا چلانا محال ہے جس میں عبادت اور دینی تعلیم کو کوئی جگہ حاصل نہ ہو۔ مذہبی تعلیم پر
س طرح زور دینے سے یہ مطلب نہیں کہ اس تعلیم کے عملی نتائج کے بارے میں بھی اتفاق رائے

موجود ہے، دینی تعلیم کی عام طور پر مسلمہ اہمیت کے باوجود اس کے نہائی عملی مقاصد کے متعلق اختلافات باقی ہیں۔

اس بارے میں تقریباً سبھی یک زبان نظر آتے ہیں کہ مسیحی دین کا فہم تعلیم کا سب سے پہلا مقصد ہونا چاہیے۔ لیکن فہم کے معانی کی تعیین کرتے وقت راہیں الگ الگ ہو جاتی ہیں۔ بعض کا کہنا ہے کہ فہم سے مراد صرف معلومات اور علم ہے اور بس، مدرسے کو اس سے آگے نہ جانا چاہیے۔ یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے وہ چاہتے ہیں کہ انجیل کا گہرا مطالعہ ہو، مسیحی دین کی تاریخ اچھی طرح پڑھائی جائے اور حواریوں کے اعتقادات کے مطالب اچھی طرح واضح کیے جائیں۔

تاہم ایک بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے جو مذہبی فہم کے اس تصور کو بالکل ناکافی سمجھتے ہیں، ان کا کہنا یہ ہے کہ اس طور پر دینی تعلیم مدرسے کے دوسرے مضامین سے چنداں مختلف نہیں رہتی، ان کے خیال میں دینی فہم دو اجزا سے مرکب ہونا چاہیے۔ (ا) دینی ادراک اور (ب) اس ادراک کے مطابق عملی زندگی۔ ان لوگوں کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ "مدرسوں کے بچوں کو جماعتی عبادات میں ایسی باقاعدگی سے شامل ہونا چاہیے اور انہیں مسیحی دین اور طرز زندگی کی تعلیم اس منظم طریق سے ملنی چاہیے کہ انہیں کم از کم یہ پتہ چل جائے کہ عیسائیت کیا ہوتی ہے" اس کے ساتھ ہی یہ لوگ اس پہلو پر بھی زور دیتے ہیں کہ مسیحی زندگی کے واردات جمہوری نظام کے لیے لازمی ہیں، کیوں کہ ان کے خیال میں صرف یہی واردات آدمی کو اس قابل بناتے ہیں کہ وہ اپنی پسند میں پورے طور پر آزاد ہو۔ دینی تعلیم کے اس نقطۂ نگاہ کے مطابق یہ بات مدرسے اور استاد کی ذمہ داری میں شامل ہو کہ وہ بچوں کو مسیحی اجتماعی زندگی بسر کرنے کے مواقع بہم پہونچائیں، کیوں کہ اس کے بغیر بچے کو پسند کی آزادی حاصل نہ ہوگی، اسے یہ خبر ہی نہ ہو سکے گی کہ مسیحی زندگی کس طرح کی ہوتی ہے۔ سوائے اس صورت کے کہ وہ ایک ایسے گھر سے آیا ہو جہاں مسیحی زندگی کی حکمرانی ہے، بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو پسند کی آزادی حاصل کرنے کا ذریعہ محض کسی خاص مسیحی فرقہ کے اعتقادات کو قرار دیتے ہیں، ان کے برعکس

ایسے لوگ بھی بہت ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ دینی تعلیم کا ایک اہم پہلو رواداری کا جذبہ ہونا چاہیے اسی مدرسے کو فراخ دلی اور رواداری کی تعلیم دینی چاہیے، یہ لوگ کہتے ہیں کہ کسی خاص مسیحی فرقہ کے ساتھ لگاؤ نہ پیدا کرنے کے راستے میں دشواریاں ضرور ہیں، لیکن یہ راستہ بہت فائدہ بخش ثابت ہو سکتا ہے اس سے یہ ہوگا کہ مختلف فرقوں کے درمیان ہمدردانہ فہم پیدا ہوگا اور یہ احساس زور پکڑے گا کہ دیانت دارانہ اختلاف رائے بھی کوئی چیز ہے اور دانا آدمی اختلاف کے باوجود ایک بنیادی مقصد پر جمع ہو سکتے ہیں، اس خیال کے حامیوں کا یہ بھی خیال ہے کہ یہ خطرہ بالکل بے بنیاد ہے کہ کسی مخصوص فرقہ کی تعلیم نہ ملنے سے لادینی پیدا ہوگی۔

دینی تعلیم کے بارے میں اس طرح کے خیالات کو عام طور پر ناکافی سمجھا جاتا ہے بعض ان کو بہت سطحی قرار دیتے ہیں بعض غیر منضبط اور ایک بڑی تعداد انہیں غیر فیصلہ کن کا نام دیتی ہے ان لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ فرد کی نجات اور قوم کی بہبود دونوں کا انحصار اس بات پر ہے کہ زندگی کی عمارت واضح روحانی معتقدات پر اٹھائی جائے، مثلاً لندن کے بشپ کے الفاظ میں "۱۹۴۴ء قانون محض اس لیے وضع اور منظور کیا گیا تھا کہ ملک کی مضبوطی کو قائم رکھا جائے اور یہ مقصد کسی ایسی تعلیم سے حاصل نہیں ہو سکتا جس کی بنیاد دین پر نہ ہو" اس کے ساتھ ہی یہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ آزادی کا وہ ورثہ جس پر مغربی تہذیب کی بنیاد ہے عیسائی دین کے سہارے زندہ ہے، یہ عقیدہ محض مذہبی رہنماؤں کا نہیں بلکہ برطانوی وزارت تعلیم کا بھی ہے۔ اس وزارت کے ایک حالیہ کتابچے کے الفاظ میں "عیسائی اعتقادات اور اعمال ہی وہ واحد بنیادیں ہیں جن پر ایک سچی اور پائیدار شہرت کی عمارت کھڑی کی جا سکتی ہے"

بہت سے لوگ یہ یقین رکھتے ہیں کہ مدرسوں کے لیے مسیحی دین کا جو متفق علیہ نصاب تیار کیا گیا ہے وہ مسیحی اعتقادات کی تعلیم کا ایک موثر ذریعہ ہے، اس بات سے بہت کم لوگ انکار کرتے ہیں کہ اس نصاب کے تمام حصے مسیحی دین کی روح سے بھرپور ہیں اور اس سے عیسائیت کے مرکزی اصولوں کو کوئی ضعف نہیں پہونچتا، ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ متفق علیہ

نصاب میں مرکزی اعتقادات ناقابل فہم بن کر رہ گئے ہیں اور جب تک انہیں کسی خاص عیسائی فرقے کے رنگ میں پیش نہ کیا جائے وہ اس وقت تک دھندلے ہی رہتے ہیں ایسے لوگوں کا خیال ہے کہ ہر مدرسہ کسی خاص فرقہ سے متعلق ہونا چاہیے تاکہ مسیحی عبادات اور مسیحی دین کے مختلف عناصر پُرتاثیر طور پر بچے کے سامنے جلوہ گر ہو سکیں اور دین کی روحانی حقیقت پورے طور پر اثر انداز ہو سکے۔ اس کے جواز میں وہ یہ دلیل بھی دیتے ہیں کہ مدرسے کو کسی خاص فرقہ کے ساتھ منسلک کیے بغیر یہ کس طرح ممکن ہے کہ اس کے عبادت گذاروں کو ایک جماعت کا درجہ دیا جائے!

اس استدلال کا ایک اگلا قدم یہ ہے کہ مذہبی تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ہر بچہ کسی خاص فرقہ کے ساتھ قطعی لگاؤ پیدا کرے۔ رومن کیتھولک فرقہ خاص طور پر اس چیز کے حق میں ہے، اس فرقہ کی دینی اور دوسری تعلیم کا سارا زور اس بات پر صرف ہوتا ہے کہ بچہ ہمیشہ کے لیے کیتھولک عقائد کے ساتھ وفاداری پیدا کرے، کلیسائے انگلستان کے بعض حامی بھی اس قسم کے خیالات رکھتے ہیں، مثلاً لورپول کے محکمہ تعلیم نے دینی تعلیم کا جو متفق علیہ نصاب تیار کیا ہے اس میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ "مدرسہ ایک ایسا معاشرہ ہے جس میں تدریس اور زندگی کو مستحکم ایمان کے مرکزی نقطہ کے گرد جمع کیا جانا چاہیے، ہمارا یقین ہے کہ یہ مرکزی نقطہ مسیحی دین ہے جو افراتفری اور نامرادی سے بھرپور دنیا کو پکار پکار کر کہتا ہے کہ خدا نے تمام کائنات اور اس میں ہر فرد کے لیے ایک مقصد مقرر کر رکھا ہے۔ مسیحی دین کے بانی نے صاف طور پر یہ دعویٰ کیا تھا کہ 'میں اس لیے آیا ہوں کہ انہیں زندگی ملے اور انہیں اس کی فراوانی نصیب ہو'، ہمارا عقیدہ ہے کہ یسوع مسیح کی بدولت انسانوں کی رسائی ایک ایسی روحانی قوت تک ہو سکتی ہے جو انہیں ایک بھرپور اور رنگارنگ ذاتی زندگی عطا کر سکتی ہے۔ ایسی زندگی جو ایک نئے انداز کی ہے خدا ہمیں ایک ابدی منزل کی طرف پکارتا ہے ہمیں اس بات کی طرف بھی بلاتا ہے کہ ہم اس کے ساتھ مل کر انسانی معاشرے کو ایک

نئی شکل دیں، ایسی شکل جو یسوع مسیح کے بیان کردہ مقصد کے مطابق ہو۔

دینی تعلیم ایک وسیع تر کام ہے۔ ایسا کام جو نصاب اور تقسیم اوقات سے بہت آگے جاتا ہے، اس کام میں لگاتار کوشش یہ ہونی چاہیے کہ بچے کو خدا۔ اس کے گرجے اور اس کی دنیا کا تجربہ ہو۔ ایسا تجربہ جس کی بنیاد عبادت۔ رفاقت اور خدمت پر ہو، یہ وسیع تر ذمہ داری گھر۔ گرجے اور سارے معاشرت پر عائد ہوتی ہے۔

یہ غرض حاصل کرنے کے لیے کہ مدرسہ کے استادوں اور دینیات کے معلموں کو اس بات کا اہل اور اس بات کے لیے رضامند ہونا چاہیے کہ یہ ذمہ داری اپنے اوپر لیں، والدین کو مدرسے کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے، جس کی صورت یہ ہے کہ وہ اپنے بچوں کو کسی عیسائی فرقہ کے سرگرم رکن بنائیں۔ مدرسے میں جو دینی علوم اور اقدار سکھائی جائیں گی انہیں نجی اور سماجی زندگی میں عملی جامہ پہنانے کی صرف یہی ایک صورت ہے۔"

دینی تعلیم کے عملی مقاصد کے متعلق یہ اختلاف رائے بالکل واضح اور غالباً قدرتی ہے لیکن مدرسے کی مختلف منزلوں کے لیے اس تعلیم کے جو مقاصد عموماً لازمی قرار دیے جاتے ہیں ان میں بھی بہت کچھ اختلاف نمایاں ہے، حال ہی میں ابتدائی مدرسے، گرامر اسکول اور جدید ثانوی مدرسے میں دینی تعلیم کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ اس صورت حال کی نشاندہی کرتا ہے۔ ابتدائی مدرسے میں مقصد یہ قرار دیا گیا ہے کہ بچے کے دل میں مسیحی طرز زندگی کی محبت پیدا کی جائے، جوں جوں بچے کی پختگی اور ذہنی بالیدگی اجازت دے اس میں یہ احساس پیدا کرنا چاہیے کہ فی الحقیقت زندگی کے سارے کام عبادت کا درجہ رکھتے ہیں اس کے برعکس جدید ثانوی مدرسے میں دینی تعلیم کا جو مقصد بیان کیا گیا ہے اس کا لب ولہجہ مختلف ہے۔ یہاں مقصد یہ ہے کہ انجیل کو نوخیز نوجوانی کے حسب حال دکھایا جائے اور مسیحی پیغام کو ایسا جامہ پہنایا جائے جو اس عمر کے لوگوں سے پُرمعنی ہو یہاں استاد کی یہ ذمہ داری ہرگز نہیں کہ مسیح کی زندگی کو ایک زندہ حقیقت کا رنگ دے، گرامر اسکول میں دینی تعلیم کا مدعا یہ بیان کیا گیا ہے

کہ ایک متوازن شخصیت کے روحانی پہلو کو بڑھنے پھولنے میں مدد دیں۔ یہ امر قابل غور ہے کہ گرامر اسکول میں روزافزوں پختگی اور گہرے مطالعہ پر جس قدر زیادہ زور دیا جاتا ہے اسی قدر عقیدے اور فرقہ وارانہ اعتقاد پر زور گھٹ جاتا ہے۔ ان تمام باتوں کو دیکھ کر یہ نتیجہ اخذ کرنا بالکل درست ہے کہ جہاں انگلستان میں اس امر پر پورا اتفاق رائے موجود ہے کہ تمام تعلیم کی بنیاد مسیحی دین کے مرکزی اصولوں پر ہو وہاں دینی تعلیم کی نوعیت اور اس کی عملی صورتوں کے متعلق بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔

دینی تعلیم کے برطانوی رہنما بالعموم یہ کہتے ہیں کہ برطانیہ میں مروجہ دینی تعلیم کے متعلق باہمی کوئی رائے قائم کرنا قبل از وقت ہے۔ اس کی قدروقیمت کا اندازہ کرنا تاریخ کا کام ہے۔ گو اس خیال میں صحت موجود ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ۱۹۴۴ء کا قانون تعلیم کوئی فوری طور پر رونما ہونے والا واقعہ نہ تھا بلکہ طویل قومی روایات کی پیداوار تھا۔ اس ضمن میں ایک اور بات بھی کہی جاتی ہے جو نسبتاً زیادہ درست ہے اور وہ یہ کہ دینی تعلیم کے اثرات کو دیگر مؤثرات کے نتائج سے الگ کر کے دیکھنا نہ جائز ہے اور نہ ہی ممکن۔ یہ بات بڑی حد تک ٹھیک ہے۔ بچوں اور نوجوانوں کی زندگیوں پر طرح طرح کے مؤثرات کام کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک عامل دینی تعلیم بھی ہے۔ مؤثرات کے اس الجھے ہوئے تانے بانے کی ایک ایک تار کی قدروقیمت کا الگ الگ اندازہ لگانا بالکل بے معنی ہے۔ اس کے باوجود یہ امر ناقابل انکار ہے کہ انگلستان کے مذہبی رہنما اور دوسرے لوگ لگاتار دینی نصابوں کی افادیت کا اندازہ لگاتے ہیں اور ان کی قطع برید کرتے رہتے ہیں۔ ان لوگوں کے اندازے دوسروں کو بہت پرمعنی معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔

اب ہم ان معیاروں کو ایک نظر دیکھیں گے جو برطانیہ میں دینی تعلیم کے حسن کارکردگی کے تول ماپ کے لیے برتے جا رہے ہیں۔ یہ بجا ہے کہ دینی تعلیم کے مقاصد بذات خود ایک ایسا ترازو فراہم کرتے ہیں جس کی مدد سے عملی افادیت کی کمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان کے علاوہ بعض دوسرے پیمانے بھی استعمال میں لائے جاتے ہیں۔

دینی تعلیم کی کامیابی کو ماپنے کا سب سے آسان اور کثرت سے استعمال ہونے والا پیمانہ یہ ہے، کہ معلوماتی مواد کس حد تک ختم کیا گیا ہے۔ پروٹسٹنٹ فرقے عموماً اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ طلبہ انجیل سے باخبر ہو جائیں اور دین کے بنیادی اصولوں کو سمجھ جائیں جو عملاً حواریوں کے عقائد پر مشتمل ہیں، اس نقطۂ نگاہ کی توضیح پادریوں کی کونسل کے اس بیان سے ہو جاتی ہے جو اس نے مسیحی دین کی نشریات کے متعلق دیا تھا، وہ بیان یہ ہے "کیا ایسی صورت میں مذہبی نشریات کوئی فائدہ رکھتی ہیں جب سننے والوں کا گرجے کے ساتھ مضبوط رابطہ قائم نہ ہو ؟ یقیناً ایسی صورت میں بھی ان کی قیمت کافی ہے، اس سے عوام کو مسیحی دین کے موٹے موٹے خدوخال سے باخبر رکھا جا سکتا ہے، وہ کچھ دینی الفاظ و محاورات اخذ کر لیتے ہیں اور موجودہ دنیا میں دین کی اہمیت کا کچھ نہ کچھ احساس بھی حاصل کر لیتے ہیں۔ سال بھر کی نشریات سے انہیں مسیحی دنیا کے بڑے بڑے تہواروں سے واقفیت ہو جاتی ہے، صرف یہی بات بعض لوگوں کو اس خطرے سے آگاہ کرنے کے لیے کافی ہے جو مسیحی دین کے پوری طرح بھلا دینے سے پیدا ہو سکتا ہے۔

ایک عام خیال یہ ہے کہ دینی تعلیم کی تاثیر کو جانچنے کا مؤثر پیمانہ یہ ہے کہ کتنے نوجوان مردوں اور عورتوں نے مختلف دینی فرقوں کے ساتھ سرگرم واسطہ پیدا کیا ہے کیتھولک اور پروٹسٹنٹ دونوں فرقے یہ سمجھتے ہیں کہ جس قدر گرجاؤں میں حاضری زیادہ بھاری اور زیادہ باقاعدہ ہوگی اور جس قدر دینی رسوم کا زیادہ اجتماع ہوگا اسی قدر دینی تعلیم کی تاثیر دلوں میں کارفرما سمجھی جائے گی، ان کے خیال میں اگر یہ ظواہر بعض دوسرے عوامل کی پیداوار بھی ہوں تو بھی یہ بات دینی تعلیم کی کامیابی کی دلیل ہی سمجھی جائے گی، ایک متفق علیہ دینی نصاب میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ "مدرسے میں دی جانے والی دینی تعلیم کا بہترین ثمر یہ ہونا چاہیے کہ فارغ التحصیل طلبہ کسی عبادت گذار جماعت کے باقاعدہ اراکین بن جائیں اگر دینی تعلیم انہیں اس بات پر نہیں ابھارتی تو اسے ناکام سمجھا جائے گا"

بعض لوگ دینی تعلیم کی کامیابی کا اندازہ اس بات سے کرتے ہیں کہ نصاب مدرسے میں اسے کیا اہمیت حاصل ہے، یہ تعلیم دینے والے استاد کس تعلیمی قابلیت کے مالک ہیں، کتنے لوگ دینیات کی تعلیم دینے کے لیے تربیت حاصل کر رہے ہیں۔ طلبہ عموماً اس مضمون کو کیا اہمیت دیتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

دینی تعلیم کی تاثیر کا ایک پیمانہ یہ بھی ہے کہ مدرسے کی مجموعی زندگی پر اس نے کیا اثر ڈالا ہے۔ یہ عام یقین ہے کہ دین کا عام اثر مدرسے کے دوسرے مشاغل میں بھی منتقل ہونا چاہیے اس سے طلبہ کا عام رویہ بلند تر ہو جانا چاہیے اور مدرسے کی عام زندگی کو پہلے سے اونچی سطح پر آجانا چاہیے۔ چنانچہ کیمبرج شائر کے متفق علیہ نصاب میں یہ خیال یوں ظاہر کیا گیا ہے "اگر کسی مدرسے میں دینی تعلیم دی جاتی ہو تو اس کی ایک صورت یہ ہے کہ مدرسے کی عام زندگی اور اس کی ساری تدریس کو اس کا ذریعہ بنایا جائے۔ مدرسے کو ایک چھوٹی دنیا کی شکل ملنی چاہیے جہاں ایک دوسرے کے ساتھ جو مراسم قائم ہوں وہ دین کی جیتی جاگتی تصویر ہوں، دین کو سیکھنے اور اور اس پر عمل کرنے کی یہ سب سے اچھی صورت ہے" اس نقطۂ نظر کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ دینیات کی تدریس کسی خاص استاد کی نہیں بلکہ عام استادوں کی یکساں ذمہ داری ہونی چاہیے۔ دینی تعلیم اس طرح ملنی چاہیے کہ اس کی روح مدرسے کی ساری زندگی میں کام کرتی نظر آئے۔

بعض کا یہ خیال ہے کہ دینی تعلیم کی تاثیر پرکھنے کی کسوٹی صرف یہ ہونی چاہیے کہ اس کے پیدا کردہ افراد بالغ زندگی کس نہج پر گذارتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ ہر نظام تعلیم کی قیمت کا اندازہ ان لوگوں کی زندگیوں ہی سے کیا جا سکتا ہے جو اس کے زیر اثر آئے ہوں، ان کی رائے میں ختم کردہ نصاب اور حاصل کردہ معلومات کو پیمانہ قرار دے کر کوئی فیصلہ کرنا بالکل ایک سطحی فیصلہ ہوگا اس طرح ان کا یہ بھی خیال ہے کہ کسی فرقے کی رکنیت دینی تعلیم کی تاثیر کا قابل اعتماد پیمانہ نہیں۔ اس طرح ان لوگوں کی رائے میں دینی تعلیم کا یہ ایک بہت محدود تصور ہوگا۔ اگر اس کی تاثیر کو محض مدرسے کی زندگی ہی سے جانچا جائے، اس کی تاثیر کا سچا پیمانہ وہ اعمال

میں جو اس تعلیم سے بہرہ ور ہونے والے بعد کی زندگی میں انجام دیتے ہیں۔ اس تاثیر کی پیمائش کے لیے یہ دیکھنا چاہیے کہ انہوں نے بالغ زندگی کے بوجھ اٹھانے کے بعد قومی ذمہ داریوں کو کس طرح نباہا؛ انہوں نے سماجی زندگی کے فرائض کس طرح انجام دیے؛ چنانچہ وزارت تعلیم کے الفاظ میں: ۔ "اگر دین کا مفہوم سوجھ بوجھ کے ساتھ واضح کر دیا جائے اور یہ کام ایسے لوگ انجام دیں جو ایمان اور علم کے باعث اس کے اہل ہوں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ عام تعلیم میں بھی ضمیر، ذاتی ذمہ داری اور خدمت الناس کے عناصر پر اس طرح زور دیا جانے لگے گا جو نصاب مدرسے کے کسی دوسرے مضمون کے بس میں نہیں"

بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ دینی تعلیم کی تاثیر جانچنے کے لیے مندرجہ بالا معیار سے بھی زیادہ بنیادی معیار سے کام لینا چاہیے۔ اس معیار کو ہماری قوم کے لیے "بلند تر اخلاقی فضا" کا نام دیا گیا ہے۔ غالباً یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ مقصد مندرجہ بالا تمام مقاصد میں نہاں ہے۔ مگر ان میں وضاحت سے یہ ذکر نہیں کہ دینی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ زندگی کے لیے ایک بلند تر اور نئی نگاہ پیدا کرے۔ جو لوگ اس نقطہ نگاہ کے حامی ہیں وہ معلومات کو تسلی بخش پیمانہ قرار نہیں دیتے، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ دینی تعلیم سے یہ توقع رکھنا عبث ہے کہ وہ کردار میں کوئی انقلابی تبدیلی پیدا کر دے گی۔ مثلاً یہ کہ اس کے طفیل جرائم اطفال میں نمایاں کمی ہو جائے، کیونکہ ایسی چیزوں کی جڑیں ایسی گہری ہوتی ہیں کہ نصاب مدرسہ کا کوئی مضمون انہیں اکھاڑ نہیں سکتا۔ یہ لوگ ان دونوں انتہاؤں کے بین بین راہ پسند کرتے ہیں۔ وہ یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ دینی تعلیم پڑھنے والوں کو زندگی کا ایک نیا فلسفہ عطا کرے تاکہ وہ اسے ایک نئے رنگ میں دیکھنے لگیں اور نئے ذہن پیدا ہوں۔ یہ درست ہے کہ اس قسم کے پیمانے سے کام لینا آسان نہیں لیکن اس کے حامیوں کا یہ کہنا ہے کہ صرف یہی وہ نتیجہ ہے جو دینی تعلیم کی سعی کے لیے وجہ جواز بن سکتا ہے۔

استادوں کا نقطہ نگاہ | اب ہم یہ دیکھیں گے کہ دینی تعلیم کے متعلق انگلستان کی مختلف جماعتوں کے خیالات کیا ہیں۔ پہلے تعلیمی ماہروں کے زاویہ نگاہ کو لیا جاتا ہے۔ انگلستان میں بہت کم ماہرین تعلیم یا استاد ایسے ہوں گے جنہوں نے

مذہب کے بغیر تعلیم کو کبھی ممکن خیال کیا ہو۔ استاد انفرادی اور جماعتی ہر دو طور پر ۱۹۴۴ء کے قانون سے مطمئن نظر آتے ہیں، اس قانون نے دینی تعلیم کے بارے میں جس ابہام و تفہیم سے کام لیا ہے۔ اسے اس اہم سوال کا اچھا حل سمجھا جاتا ہے۔ اس بارے میں کچھ کلام نہیں کہ حالیہ سالوں میں برطانوی استاد نصاب مدرسہ اور مدرسے کی زندگی میں دینی تعلیم کے مقام کو خوب اچھی طرح سمجھنے لگے ہیں جس سرگرمی اور خلوص سے آج انگریزی مدرسوں میں دینی تعلیم دی جا رہی ہے، وہ پہلے کے مقابلہ میں بڑی خوش گوار تبدیلی کا ثبوت ہیں۔ ٹیلرایکٹ کے باعث اب دینی تعلیم کی پیشہ ورانہ حیثیت بہت بلند ہے، اس ضمن میں اکثر مدرسے اپنی ذمہ داری کو بہت خوبی سے پورا کر رہے ہیں۔

۱۹۴۴ء کے قانون میں دینی تعلیم کے متعلق جس مفاہمت سے کام لیا گیا ہے اس پر کئی استادوں کو اعتراض ہے۔ مثلاً بہت سے استاد اور تعلیمی ماہر روزانہ لازمی عبادت کو اس قانون کا غیر پسندیدہ پہلو قرار دیتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ دینی تعلیم اور عبادت لازمی نہیں بلکہ اختیاری چیزیں ہونی چاہئیں۔ ایک تعلیمی ماہر نے یہاں تک کہا ہے کہ لڑکوں کو روزانہ گرجے میں عبادت کے لیے جانے پر مجبور کرنے سے ہم نے ان کے دلوں میں دین سے تنفر پیدا کر دیا ہے۔

ایک اور اختلافی سوال دینی تعلیم اور عبادت کی نگرانی کا ہے، ۱۹۴۴ء کے قانون میں اس قسم کی نگرانی کا واضح ذکر ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ اگر معلم دین کو یہ معلوم ہو کہ اس کے کام کا معائنہ ہوگا تو اس سے دینی تعلیم کی حیثیت بڑھے گی، اس کے برعکس بعض لوگ بڑی شدت سے یہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ دینی تعلیم ایسا مضمون نہیں جس کا دوسرے مضامین کی طرح معائنہ کیا جا سکے۔ نیز یہ فرض کر لینا بڑی نادانی ہے کہ کوئی شخص فی الواقع اس قسم کا معائنہ کرنے کی اہلیت رکھتا ہے، ان کا یہ بھی خیال ہے کہ اگر دینی تعلیم کے سر پر معائنہ کا خطرہ لہراتا رہے گا تو اس سے اس کی تاثیر میں کمی واقع ہوگی، دینی تعلیم کے لیے خارجی امتحانات

سترد کرنے کے خلاف اسی قسم کی دلیلیں دی جاتی ہیں۔

دینی نصابوں پر استادوں نے جو تنقید کی ہے وہ مقابلتہً زیادہ پرمعنی ہے، اس بارے میں بھی مروجہ متفق علیہ نصابوں اور طریقہ ہائے کار کے متعلق عام طور پر اطمینان کا اظہار کیا جاتا ہے بہت سے استاد اس بات کے حامی ہیں کہ معلومات کی بجائے تیقین اور اعتقادات پر زیادہ زور دیا جانا چاہیے، ایسے استادوں کا خیال ہے کہ موجودہ متفق علیہ نصابوں کی جگہ واضح طور پر فرقہ وارانہ نصابوں کو ملنی چاہیے۔ یہ احساس بڑھ رہا ہے کہ ایک عام نوعیت کا دینی نصاب کئی باتوں میں استاد اور طالب علم دونوں کے فہم سے بالاتر رہتا ہے۔ انجیل کی باریکیاں مدرسے کی دنیا میں آسانی سے سمجھی نہیں جا سکتیں، اس لیے اگر بچوں کو صاف طور پر فرقہ وارانہ عبادات اور رسوم کی تعلیم دی جائے تو زیادہ اچھا ہو۔

اس مسئلہ میں ایک اور رجحان بھی ظاہر ہو رہا ہے وہ یہ کہ جوں جوں بلند تر تعلیمی قابلیت کے استاد دینی تعلیم کے ذمہ دار بنتے جا رہے ہیں اسی قدر انجیل پر بھی متفق علیہ نصاب ناکافی نظر آنے لگے ہیں، یہ استاد صاف طور پر یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ انجیل کو دینی تعلیم کی ساری بنیاد قرار دینے میں کونسی دانائی ہے؟ اس نقطۂ نگاہ کے مطابق روکیا تعصب سے آزاد ذہن کو یہ صاف دکھائی نہیں دیتا کہ انجیل کے اکثر حصوں کی تصنیف کرنے والے لوگ عہد حاضر یا ماضی قریب کے بہت سے مصنفوں کے مقابلہ میں بہت کم صاحب الفا تھے؛ نصاب تعلیم کے باب میں استادوں کا یہ اختلاف رائے ابھی بہت محدود ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ کسی دن یہ مرکزی حیثیت اختیار کرلے

برطانوی استادوں کے مذہبی نقطۂ نگاہ میں جو قابل ذکر تبدیلی ہوئی ہے وہ یہ ہے، کہ دوسری عالمی جنگ سے پہلے اکثر استاد مذہب میں چنداں دلچسپی نہ رکھتے تھے بلکہ بعض واضح طور پر مذہب کے مخالف تھے۔ زمانہ قبل از جنگ میں مدرسوں میں جو دینی تعلیم دی جاتی تھی اس پر اس چیز کا نمایاں اثر تھا۔ آج استاد من حیث الجماعت اس بات پر اتفاق رکھتے ہیں کہ نظام تعلیم میں مذہب کو مرکزی حیثیت ملنی چاہیے۔ ۱۹۴۷ء میں استادوں کی عام رائے کا ایک جائزہ

لیا گیا تھا جس سے ظاہر ہوا تھا کہ صرف دس فی صد اساتذہ ایسے ہیں جو نصاب مدرسہ سے دینی تعلیم کے اخراج کے حامی ہیں۔ اس سے بعد اساتذوں کے ردعمل کے جو جائزے لیے گئے ہیں وہ بتاتے ہیں کہ مخالفت قطعی طور پر ختم ہو چکی ہے اور بعض صورتوں میں دینی تعلیم سے پرخلوص لگاؤ نمایاں ہے۔

پادریوں کا ردعمل

انگلستان میں گرجے، ریاست اور مدرسے کے درمیان اس وقت جو رشتہ ہے اس کے متعلق پادریوں کے ردعمل کا درست اندازہ لگانا کچھ مشکل ہے، رومن کیتھولک فرقہ کو چھوڑ کر باقی مذہبی فرقوں میں دینی تعلیم کے موجودہ انتظام کے متعلق اتفاق رائے سرے سے ناپید ہے، جہاں تک مدرسوں میں دینی تعلیم اور عبادت کے لازمی قرار دیے جانے کا تعلق ہے۔ پادریوں کو اس پر کچھ اعتراض نہیں، تھوڑی گنتی والے فرقے قانونی تعلیم کی اس دفعہ سے بالکل مطمئن ہیں جس نے دینی تعلیم اور عبادت کو طلبہ اور ان کے والدین کے ضمیر کی پسند پر موقوف رکھا ہے۔ کسی بھی مذہبی حلقہ کی طرف سے مذاہب کے تقابلی مطالعہ کی تائید نہیں کی گئی۔ مسیحی دین کا متقابلہ اگر کبھی کیا بھی جاتا ناپسند کیا جاتا ہے تو سائنسی انسانیت نوازی سے اور بس۔ پادری عموماً اس بات پر یک زبان ہیں کہ جدید زندگی میں مذہب کی ضرورت کو پوری طرح واضح نہیں کیا گیا۔ ان باتوں کے علاوہ مختلف مسیحی فرقوں میں دینی تعلیم کے مسئلہ پر کسی قسم کا اتفاق رائے نہیں۔

طلبہ کا ردعمل

اب ہم طلبہ کے ردعمل کا جائزہ لیتے ہیں۔ گرامر اسکول کا ایک مشہور ہیڈ ماسٹر مروجہ دینی تعلیم کے متعلق طلبہ کے ردعمل کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتا ہے "اس وقت دینی تعلیم طلبہ کے سامنے مسیحی مذہب کا پرانا روائتی تصور پیش کر رہی ہے۔ بعض لوگوں کو اس خیال سے بھی دکھ ہوگا کہ اس تصور کو چھوڑ دیا جائے۔ لیکن زود و بدیر ایسا کرنا ضرور پڑے گا اس لیے جتنی جلدی ہو اسی قدر اچھا ہے، یہ خیال غلط ہے کہ نیا نقطۂ نگاہ پیش کرنے سے ہم بچوں کو ہاتھ سے کھو بیٹھیں گے، کیوں کہ وہ پہلے ہی ہمارے ہاتھ میں نہیں"

سنہ ۱۹۴۴ء کے قانون تعلیم کے بعد مدرسوں میں لازمی دینی تعلیم کا جو اجرا ہوا ہے اس کے متعلق طلبہ کے ردِ عمل کو معلوم کرنے کا کوئی قابل اعتماد ذریعہ موجود نہیں۔ ملک کے دوسرے طبقوں کی طرح طلبہ بھی دینی تعلیم کے بغیر تعلیم کا تصور نہیں کرتے لیکن اکثر استادوں اور پادریوں کا کہنا ہے کہ طلبہ دینی تعلیم کو عموماً نصاب کا ایک زائد مضمون خیال کرتے ہیں۔ طلبہ کی اکثریت کے نزدیک ابھی دینی تعلیم کو وہ مقام حاصل نہیں جو تاریخ، ریاضی یا نصاب کے دوسرے مضامین کو میسر ہے استادوں کی عام رپورٹ یہ ہے کہ عموماً جوں جوں ایک طالب علم عمر میں بڑا ہوتا ہے مذہب میں اس کی دلچسپی گھٹتی جاتی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو نوخیز جوانی کی ذہنی الجھنیں ہو سکتی ہیں۔ دوسری وجہ خود طلبہ کی بیان کردہ یہ ہے کہ دینی تعلیم بعض ایسی معلومات اور سرگرمیوں پر مشتمل ہے جو بار بار دہرائی چلی جاتی ہیں۔ تاآں کہ ان کی ساری دلچسپی اور کشش ختم ہو جاتی ہے، انجیلی کہانیوں اور گرجے کی تاریخ کو ابتدائی جماعتوں میں شروع کیا جاتا ہے اور یہی چیز بعد کے سالوں میں دہرائی چلی جاتی ہے۔ یہ درست ہے کہ اونچی جماعتوں میں اسلوب بیان اور زبان زیادہ مشکل ہو جاتی ہے، لیکن خود موضوعات میں قطعاً کوئی زندگی باقی نہیں رہتی، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ثانوی جماعتوں کے طلبہ دینی تعلیم کے بارے میں عموماً بددل ہو جاتے ہیں۔

سیانے طلبہ کا عام ردِ عمل یہ ہے کہ جو دینی تعلیم انہیں دی جاتی ہے وہ ان کی ذاتی زندگیوں میں کچھ مدد نہیں دیتی۔ ان کے ذاتی مسائل پر اس سے کچھ روشنی نہیں پڑتی، حال ہی میں ریڈنز یونیورسٹی نے سولہ سو کے قریب طلبہ کا امتحان دینی تعلیم میں لیا۔ ان کی عمریں سولہ اور انیس سال کے درمیان تھیں۔ نتائج سے یہ بات بالکل عیاں تھی کہ ان لوگوں نے دینی تعلیم کے نصاب کو سرے سے اخذ ہی نہیں کیا، اس قسم کے کچھ اور امتحانات بھی ہوئے ہیں اور ان کے نتائج بھی بالکل اسی قسم کے تھے۔

دینی تعلیم کے متعلق طلبہ کے ردِ عمل کا اندازہ ایک اور چیز سے بھی ہوتا ہے۔ ثانوی تعلیم کے خاتمہ پر جو طلبہ یونیورسٹی میں داخلہ لینا چاہتے ہیں انہیں یونیورسٹی کا ایک آزمائشی امتحان پاس

کرنا ہوتا ہے، اس امتحان میں وہ اپنی پسند کے مضامین لے سکتے ہیں۔ مختلف یونیورسٹیوں نے پچھلے چند سالوں میں اس قسم کے جو امتحان لیے ہیں وہ اس امر کی آئینہ داری کرتے ہیں کہ دینی تعلیم کا انتخاب نسبتاً کم طلبہ کرتے ہیں۔ مثلاً شمالی انگلستان کی ایک یونیورسٹی کے اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ سنہ ۱۹۵۱ء اور ۱۹۵۳ء کے درمیان جہاں امتحان دینے والوں کی تعداد میں تیس فی صد اضافہ ہوا وہاں دینیات کو بطور اختیاری مضمون لینے والوں کی تعداد بقدر پچیس فی صد گھٹ گئی۔

طلبہ عموماً دینی تعلیم کو نصاب کا ایک لازمی جزو سمجھتے ہیں، انہیں اس کے لازمی قرار دیے جانے پر بھی اعتراض نہیں، اگر وہ اس مضمون کے متعلق سرگرمی کا اظہار نہیں کرتے تو نصاب کے دوسرے مضامین کے متعلق بھی یہی بات کہی جا سکتی ہے لیکن قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس مضمون میں طلبہ کی دلچسپی رفتہ رفتہ گھٹنے لگتی ہے، اور جب اسے اختیاری مضمون کا درجہ ملتا ہے تو اسے پسند کرنے والوں کی گنتی یک دم گھٹ جاتی ہے۔ کچھ عرصہ ہوا طلبہ کے ایک نمائندہ گروہ کو ایک سوالنامہ جاری کیا گیا تھا، جس میں پوچھا گیا تھا کہ نصاب کا کونسا مضمون تمہارے لیے سب سے زیادہ فائدہ مند ثابت ہوا۔ ۲۸ فی صد نے تاریخ کے مطالعہ کو پسندیدگی کی سند دی جب کہ صرف ایک فی صد طلبہ نے انجیل کے مطالعہ یا دینی تعلیم کو پسند کیا۔

خاتمۂ کلام | برطانیہ میں دینی تعلیم کو تعلیم کا لازمی جزو بنانے کے لیے جو تجربہ کیا گیا ہے اس کا مختصر سا حال اوپر بیان ہو چکا ہے، ابھی اس تجربے کے متعلق کوئی آخری رائے قائم کرنا ناممکن ہے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس تجربے سے ان ملکوں کو مفید رہنمائی مل سکتی ہے جو اپنے یہاں دینی تعلیم کو لازمی قرار دینا چاہیں۔ اگرچہ انگلستان کے حالات اور وسائل ہمارے ہاں سے بہت مختلف ہیں۔ تاہم برطانوی تجربے کی روشنی میں چند باتیں بالکل طے شدہ نظر آتی ہیں۔

(۱) دینی تعلیم کو نصاب کا باقاعدہ جزو بنا کر اسے دوسرے مضامین کی ہی سطح پر لایا جا سکتا ہے۔ برطانیہ کا تجربہ ثابت کرتا ہے کہ دینیات پڑھانے والے قابل اساتذہ ضروری تعداد میں دستیاب ہو سکتے ہیں اور ان اساتذہ کی حیثیت ہر لحاظ سے دوسرے اساتذہ کے برابر

ہو سکتی ہے ۔

(۲) برطانیہ میں سرکاری تائید و مدد نے مذہبی تعلیم کو ایک خاص مقام عطا کیا ہے ۔ ہر اس مدرسے کے لیے جو سرکاری مدد چاہتا ہو ضروری ہے کہ دینی تعلیم کا بندوبست کرے ۔ یہ طریقہ دینی تعلیم کو ملک گیر بنانے کے لیے مؤثر ترین صورت ہے ۔ ہمارے یہاں ایسے غیر ملکی مدرسے موجود ہیں جو پاکستانی خزانہ سے زرِ اعانت وصول کرتے ہیں لیکن تعلیم ایسی دیتے ہیں جو اسلام کی جڑیں کاٹنے والی ہے ۔

(۳) برطانیہ میں دینی تعلیم صرف مسیحی دین تک محدود ہے ۔ بالائی جماعتوں میں بھی مذاہب کے تقابلی موازنہ کا کوئی انتظام نہیں ، اس کے جواز میں یہ کہا جاتا ہے کہ دینی تعلیم کی اصل غایت وہ مخصوص نقطۂ نگاہ پیدا کرنا ہے جو ملکی ثقافت کی بنیاد ہے ، یہ امر پاکستان کے لیے خاص طور پر سبق آموز ہے ، کیوں کہ یہ مملکت وجود میں لائی ہی اس لیے گئی تھی کہ ہندی مسلمانوں کی ثقافت کا تحفظ کرے ؛

جغرافیہ

"چلی کا حال" (سبقوں کے خاکے)

عبدالغفور چوہدری سلسلہ نمبر ۲

جماعت چھٹی - لڑکیوں کی اوسط عمر ۱۱ / ۱۲ سال

جغرافیہ کے طالب علموں کے لیے چلی کا ملک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ ۳۹ درجے عرض بلد پر پھیلا ہوا ہے۔ اس کی لمبائی ۲۶۰۰ میل سے کم نہیں۔

چلی میں سخت گرم سے لے کر سخت سرد تک ہر قسم کی آب و ہوا ملتی ہے۔ ملک کی سب سے بڑی دولت اس کی معدنی پیداوار ہے۔ سبق میں مندرجہ ذیل باتیں قابل توجہ ہیں۔

(ا) تعارف (ب) نقشہ کا استعمال (ج) سابقہ معلومات سے ربط (د) لڑکیوں کے جوابات کی اصلاح (ہ) لڑکیوں کی سبق میں دلچسپی اور اشتراک عمل۔

سبق کی روداد پڑھنے کے بعد مندرجہ ذیل باتوں پر غور کیجیے۔

(ا) اس سبق کے ذریعہ کیا خاص تربیت دی گئی ہے (ب) کیا یہ تربیت دوسرے مضامین میں کام آسکتی ہے (ج) جغرافیہ کے آئندہ سبقوں میں اس سے کیا مدد مل سکتی ہے (د) قوت فکر کی تربیت کہاں تک ہوئی (ہ) سبق کے آخری حصہ میں استاد نے اپنا طریق تدریس کیوں بدلا (س) اس طریق تدریس کی خامیاں کیا ہیں اور انہیں کیسے دور کیا جائے؟

استانی - جنوبی امریکہ کا براعظم ہمارے نصاب میں شامل ہے۔ خاص کر ارجنٹائن اور برازیل اب ہم چلی کا حال پڑھیں گے۔ جنوبی امریکہ کا حال پڑھنے سے پہلے ہمیں اس کی الف بے ضرور سمجھنی چاہیے۔ یہ ہیں تین ملک۔ ارجنٹائن، برازیل اور چلی۔

(استانی تختہ سیاہ پر جنوبی امریکہ کا خاکہ بناتی ہے) دیکھیے یہ ہے ہمارے براعظم کا خاکہ اب ہم اس کے اندر چلی کی حدیں قائم کرتے ہیں۔ اس کی شکل کیسی ہے؟

لڑکی :- بہت لمبی اور تنگ۔

استانی :- ہاں چلی کی شکل کے مطالعہ کے بعد اس کے بارے میں ایک ضروری بات کا پتہ چلتا ہے۔

لڑکی :- اس کے مختلف موسم۔

استانی :- میرے خیال میں اس کے لیے یہ لفظ موزوں نہیں۔

لڑکی :- اس کی مختلف قسم کی آب و ہوا۔

استانی :- ہاں۔ آب و ہوا کا لفظ زیادہ موزوں ہے۔ تم دیکھتی ہو کہ چلی کا ملک منطقہ حارہ تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ کس عرض بلد تک پھیلا ہوا ہے؟

لڑکی :- ۱۷ درجے جنوب سے ۵۶ درجے جنوب تک۔ کل پھیلاؤ ۳۹ درجے ہے۔

استانی :- ہم دیکھتے ہیں کہ چلی کا پھیلاؤ ۳۹ درجے عرض بلد ہے۔ اس سے ہم چلی کی لمبائی معلوم کر سکتے ہیں۔ لیکن اس سے پہلے ہمیں یہ معلوم کر لینا چاہیے کہ ایک درجے میں کتنے میل ہوتے ہیں۔ کیا کوئی لڑکی بتا سکتی ہے کہ زمین کا محیط کتنا ہے؟

لڑکی :- چوبیس ۲۴۰۰۰ ہزار میل۔

استانی :- ہاں اندازاً چوبیس ہزار میل۔ اس دائرے کو دیکھو۔ اس میں کتنے درجے ہیں؟

لڑکی :- تین سو ۳۶۰ ساٹھ درجے

استانی :- اس لیے ایک درجے میں کتنے میل ہوں گے؟

لڑکی :- ہم چوبیس ہزار کو تین سو ساٹھ پر تقسیم کر دیں تو جواب آ جائے گا۔

استانی :- ہاں تقریباً ۷۰ میل۔ اگر محیط ۲۵۰۰۰ میل ہو تو ایک درجہ عرض بلد میں ۶۹ میل ہوں گے۔ اب بتاؤ ۳۹ درجے عرض بلد میں کتنے میل ہوں گے؟

لڑکی :- ۶۹ کو ۳۹ میں ضرب دیجیے۔ (لڑکی سوال کو تختہ سیاہ پر حل کرتی ہے)

استانی :- اچھا تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ چلی کی لمبائی تقریباً ۲۵۰۰ میل ہے۔ ہم نے اس کی لمبائی سے نتیجہ نکالا کہ چلی میں مختلف قسم کی آب و ہوا ہو گی۔ ہم آپ کی سابقہ معلومات کی بنا پر کہہ

سکتے ہیں کہ جنوبی امریکہ کے اس شمالی خطے میں کس قسم کی آب و ہوا ہو گی۔ اب اس کے اسباب معلوم کرو۔ میں تمہاری رہنمائی کروں گی۔ اس کو حل کرنے کے لیے ایک بڑی اہم چیز خطِ جدی ہے۔ جو ملک کے وسط میں سے گذرتا ہے۔ اس کا عرض بلد ½ ۲۳ درجے جنوب ہے۔ وہ تمام مقامات جو اس خط کے شمال میں ہیں ان کی آب و ہوا کیسی ہو گی؟

لڑکی:- ان مقامات کی آب ہوا گرم ہو گی۔ بشرطیکہ سطح سمندر سے ان کی بلندی تقریباً یکساں ہو۔

استانی:- کیا اس خط کے شمال میں کوئی ایسی جگہ ہے جس کی آب و ہوا گرم نہیں؟

لڑکی:- کوہستان انڈیز

استانی:- کیوں؟

لڑکی:- اس لیے کہ وہ سطح سمندر سے اونچے ہیں۔ پہاڑ آب و ہوا کو سرد بناتے ہیں۔

دوسری لڑکی:- جوں جوں سطح سمندر سے بلندی بڑھتی جاتی ہے۔ ہوا زیادہ سرد ہوتی جاتی ہے۔

استانی:- ہاں عام طور پر پہاڑ سرد ہوتے ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ اونچائی آب و ہوا کو بدل دیتی ہے اگر ساحل پر ایک مقام کا درجہ حرارت ۹۰ درجے ہو تو کوہ انڈیز پر ۹۰۰۰ فٹ کی بلندی پر درجہ حرارت ساٹھ درجے ہو گا۔ درجہ حرارت میں تفاوت۔ بلندی میں تفاوت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اب نقشہ میں کوہستان انڈیز بتاؤں گی (استانی کوہستان انڈیز کو نقشہ پر ظاہر کرتی ہیں) یہ کوہستان انڈیز ہے۔ تم دیکھتی ہو کہ چلی کی شرقی حد کوہستان انڈیز کی چوٹی پر سے گذرتی ہے۔ ہم نے ابھی یہ معلوم نہیں کیا کہ چلی کی زمین ہموار میدان ہے یا سطح مرتفع۔ لیکن ملک کا یہ حصہ کوہستان انڈیز جتنا اونچا نہیں۔ پس ہم اسے گرم آب و ہوا والا خطہ کہیں گے۔ اگر کوئی مقام منطقہ حارہ میں واقع ہو تو ہم اس کی آب و ہوا کو گرم آب و ہوا کہتے ہیں۔ ہم نے درجہ حرارت کے متعلق پڑھ لیا ہے۔ لیکن ابھی بارش کے متعلق نہیں پڑھا۔ آب و ہوا کا انحصار زیادہ تر دو چیزوں پر ہوتا ہے۔ وہ کیا ہیں؟

لڑکی:- درجہ حرارت اور بارش۔

استانی :- بھلا بتاؤ اس حصہ میں بارش کب ہوتی ہے ؟

لڑکی بارش پورا سال ہوتی ہے ۔

دوسری لڑکی :- نہیں یہاں پورا سال بارش نہیں ہوتی ۔

استانی :- تو پھر کس موسم میں ہوتی ہے ؟

لڑکی یہاں بارش بالکل نہیں ہوتی کیوں کہ یہاں تجارتی ہوائیں چلتی ہیں ۔

استانی :- دیکھو اسے خطِ استوا سمجھو۔ خطِ استوا اور خطِ جدی کے درمیان اور اسی طرح خطِ استوا اور خطِ سرطان کے درمیان خاص قسم کی ہوائیں چلتی ہیں ان ہواؤں کا کیا نام ہے ؟

لڑکی :- انہیں مغربی ہوائیں کہتے ہیں ۔

استانی :- نہیں انہیں مغربی ہوائیں نہیں کہتے ۔ البتہ بعض اور علاقے ایسے ہیں جہاں مغربی ہوائیں چلتی ہیں۔ مغربی ہوائیں منطقہ معتدلہ میں چلتی ہیں۔ لیکن اس وقت تو ہم منطقہ حارہ کے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں، وہاں کس قسم کی ہوائیں چلتی ہیں ؟

لڑکی :- گرجنے والا چالیسہ ۔

استانی :- نہیں گرجنے والا چالیسہ تو مغربی ہواؤں کی مانند ہے ۔ منطقہ حارہ میں خاص قسم کی ہوائیں چلتی ہیں ، اس منطقہ میں چلنے والی ہواؤں کی سمت کو ظاہر کرنے کے لیے میں یہ تیروں کے نشانات بنا دیتی ہوں ۔

لڑکی :- جنوب مشرقی ہوائیں ۔

استانی :- ان کا پورا نام کیا ہے ؟

لڑکی :- جنوب مشرقی تجارتی ہوائیں ۔

استانی :- میں اس کی وضاحت نہیں کروں گی کہ جنوب مشرقی تجارتی ہوائیں اس سمت میں کیوں چلتی ہیں ۔ یہ تمہیں بعد میں بتایا جائے گا ۔ لیکن اگر ہمیں ان کی سمت معلوم ہے تو ہم تھالی چلی میں بارش کے متعلق ایک نہایت ضروری بات معلوم کریں گے ۔

لڑکی:- وہاں بارش بالکل نہیں ہوتی، کیوں کہ ہواؤں میں نمی نہیں ہوتی۔

دوسری لڑکی:- ہوائیں ساری نمی کو کوہستان انڈیز کی دوسری طرف لے جاتی ہیں۔

استانی:- دیکھو تجارتی ہوائیں یہاں سے چلتی ہیں۔ یہ ہوائیں کوہستان انڈیز میں بالکل نہیں چلتیں۔ بارش نہ ہونے کی کیا وجہ ہے؟

لڑکی:- ہوائیں بارش برسائے بغیر اس پر سے گزر جاتی ہیں۔

استانی:- اس پر سے گزرنے والی ہوائیں بارش کیوں نہیں برسائیں؟

لڑکی:- وہی ہوا بارش برساتی ہے جس میں کافی نمی ہو۔

استانی:- ہاں اگر ہوا دور تک خشکی پر سے گزر کر آئے تو اس میں نمی کم ہوگی۔ یا بالکل نہیں ہوگی۔ بارش کے لیے ضروری ہے کہ ہوا سمندر سے آئے، جب ہوا کسی پہاڑ سے ٹکراتی ہے تو کیا ہوتا ہے؟

لڑکی:- وہ اوپر اٹھتی ہے۔

استانی:- اور جب ہوا اوپر اٹھتی ہے تو کیا ہوتا ہے؟

لڑکی:- ہوا کے بخارات منجمد ہو جاتے ہیں۔

استانی:- لیکن بخارات منجمد ہونے سے پہلے ہوا میں کچھ تبدیلی بھی ہوتی ہے؟

لڑکی:- وہ سرد ہو جاتی ہے۔

استانی:- ہاں پہاڑ کی چوٹی اس کے نچلے حصہ کی نسبت ہمیشہ سرد ہوتی ہے۔ تم اس کا اندازہ ان تصویروں سے لگا سکتی ہو جن میں برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں والے پہاڑ دکھائے گئے ہیں۔ جس ہوا کا ہم ذکر کر رہے تھے، اس کے بخارات منجمد ہو جاتے ہیں۔ اور بارش بن کر برستے ہیں۔ چلی میں جب ہوا ساحل کی طرف چلتی ہے تو وہ نمی کو ساتھ اڑا کر لے جاتی ہے، اس لیے شمالی چلی میں زمین نہایت خشک اور بنجر ہے، ایسی زمین کو کیا کہتے ہیں؟

لڑکی:۔ خشک صحرا

استانی:۔ ٹھیک ہے۔ ہم پہلے رنگ کے چاک سے نقشہ میں خشک صحرا لکھ دیں گے۔ یہ صحرائے اٹیکا کاما ہے۔ اب دیکھو یہ شمالی امریکہ ہے اور یہ جنوبی امریکہ۔ تم ابھی عرض بلدوں میں کوئی اور صحرا معلوم کر سکتی ہو؟ ذرا اپنی آنکھوں کو دیکھو تو معلوم ہوگا کہ جنوبی نصف کرہ میں انہی عرض بلدوں میں صحرا ملک کے مغرب میں ہیں اور تم یہ بھی دیکھو گی کہ اس خطہ میں تجارتی ہوائیں ساحل کی طرف چلتی ہیں۔ یہ دیکھو جنوبی افریقہ میں صحرائے کالاہاری ہے اور شمالی افریقہ میں صحرائے اعظم۔ اب تمہیں معلوم ہو گیا ہوگا کہ ہواؤں کی سمت کسی ملک کے لیے کتنی اہم ہے۔ چلی کی بہت سی دولت جو آج اسے میسر ہے۔ صحرائے اٹیکاما سے حاصل ہوتی ہے۔ شمالی چلی کا صحرا ہے وہاں زمین میں کچھ نہیں اگتا پھر اسے دولت کہاں سے حاصل ہوتی ہے؟

لڑکی:۔ معدنیات سے۔

استانی:۔ ذرا وضاحت سے بیان کرو۔

لڑکی:۔ لوگ کانیں کھودتے ہیں اور زمین سے معدنیات نکالتے ہیں۔

دوسری لڑکی:۔ وہاں شورہ نکلتا ہے اور دوسرے ملکوں کو بھیجا جاتا ہے۔

تیسری لڑکی:۔ شورے سے مشقوس کی دولت ہے۔

استانی۔ ہاں شورے کی ساری دنیا میں بڑی مانگ ہے۔ یہ اہمیت پاتا ہے۔ اس کا کوئی اور استعمال بھی بتاؤ؟

لڑکی:۔ اسے بارود بنانے میں استعمال کیا جاتا ہے۔

استانی:۔ ہمیں معلوم ہوا کہ شمالی چلی کے لوگوں کا سب سے بڑا پیشہ کان کنی ہے۔ کیا وہاں کان کا کام آسان ہے؟ اگر آسان نہیں تو کیوں؟

لڑکی:۔ زمین ناہموار اور بہت بلند ہے اس لیے کان کنی آسان کام نہیں۔

دوسری لڑکی۔ وہاں پانی کی کمی ہے

تیسری لڑکی۔ وہاں پانی دوسری جگہوں سے لانا پڑتا ہے۔

چوتھی لڑکی۔ ذرائع آمد و رفت نہایت مشکل ہیں۔

استانی۔ لیکن وہاں ریلیں بن سکتی ہیں۔ اگرچہ جب راستہ میں پہاڑ حائل ہوں تو ریلیں بنانا آسان نہیں۔ دیکھو یہ بحرالکاہل ہے اور یہ کوہستان انڈیز کی پہلی گھاٹی۔ یہاں سطح سمندر تک زمین کی ڈھلان نمودار ہے، اور اس جگہ پانی میں بندر یا پشتہ بنانا آسان نہیں کیوں کہ یہاں پختہ اور محفوظ بنیادیں نہیں۔ چناں چہ جہازوں کو کھلے سمندر میں ساحل سے دور ٹھہرنا اور سامان اتارنا اور لادنا پڑتا ہے۔ کوہستان انڈیز کی ڈھلان اس قدر عمودی ہے کہ ریلیں بنانا بالکل ناممکن ہے۔ یہاں ایک ایسی ساحلی سطح مرتفع ہے جسے ایک نہایت تنگ گھاٹی سمندر سے جدا کرتی ہے۔ اور اس گھاٹی اور سمندر کے درمیان ڈھلان تقریباً عمودی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اگرچہ سطح مرتفع پر ریل بنانا ممکن ہے۔ لیکن انجینیر اسے سمندر تک لے جانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے اس لیے بے چارے کان کنوں کو سخت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن یہ ساری دشواریاں اور زیادہ اخراجات اس لیے ہنسی خوشی برداشت کر لیے جاتے ہیں کہ ان دھاتوں کی مانگ بہت ہے۔ شورے سے بارود تیار کیا جاتا ہے اور جب دو قوموں میں جنگ چھڑ جائے تو اس کی بکری خوب ہوتی ہے۔ پچھلی جنگ میں چلی نے بڑی تعداد میں شورہ باہر بھیجا تھا۔ شورے اور نائٹریٹ کے علاوہ کوہستان انڈیز میں اور دھاتیں بھی ملتی ہیں۔ کیا تمہیں کسی دھات کا نام معلوم ہے۔

لڑکی:۔ تانبا اور چاندی۔

استانی:۔ ہاں چاندی۔ اور جب تم چاندی کا نام لو۔ تو تم ٹین کا نام بھی لے سکتی ہو۔ کیوں کہ یہ دو نوں دھاتیں عموماً اکٹھی ملتی ہیں ×

انگریزی تعلیم (ایک بچہ اسکول کی سیر)

محمد عبدالعزیز
مسلسل نمبر ۲

نصاب اور طریق تدریس

ہر ثانوی تعلیمی حکومت ہیڈ ماسٹر پر اعتماد کرتی ہے اور نصاب اور طریق تدریس میں نہ مداخلت کرتی ہے اور نہ رائے دیتی ہے، اس کا کام محض نگرانی اور ہیڈ ماسٹر کی اعانت کرنا ہے۔ ہیڈ ماسٹر خود ہم کار اساتذہ کے تعاون اور مشورے سے ہر جماعت کے لیے ایک نصاب متعین کرتا ہے۔ نصاب کی تعیین کے بعد وہ سب یہ بھی طے کر لیتے ہیں کہ اس دورہ (TERM) میں اتنا حصہ پڑھایا جائے گا دوسرے میں اتنا اور تیسرے میں اتنا۔ پھر وہ اس کے مطابق باقاعدگی سے چلتے رہتے ہیں۔

ابتدائی دو جماعتوں میں پڑھنے لکھنے کا کام محض واجبی واجبی ہوتا ہے، زیادہ تر بچوں کو اسکول آنا، اٹھنا، بیٹھنا، بولنا وغیرہ اور اس قسم کے دوسرے آداب معاشرت کی تربیت دی جاتی ہے۔ اسکول کے وقت ناشت میں ان کے کھیل کے اوقات تدریسی اوقات سے زیادہ ہوتے ہیں، جب بچہ قدرے مانوس ہو جاتا ہے اور اسکول کے ماحول سے اسے دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے تو رفتہ رفتہ اسے الفاظ ہجا اور گنتی سکھائی جاتی ہے، ستمبر سے دسمبر تک یہی سلسلہ جاری رہتا ہے، جنوری سے انہیں باقاعدہ الفاظ کا لکھنا اور پڑھنا سکھایا جاتا ہے۔ انگریز۔ انگریزی بہت خراب بولتا ہے لیکن اتنی خراب نہیں جتنی بعض امریکی بولتے ہیں، اس لیے سب و لہجہ اور تلفظ کی طرف ابتدائی مدارج سے بالخصوص توجہ دی جاتی ہے۔ مسٹر پورٹر کے ساتھ ہم لوگ ایک جماعت میں داخل ہوئے۔ یہاں جماعت میں داخل ہونے کے بعد بچوں کے کھڑے ہونے کا طریقہ رائج نہیں ہے، اس لیے بچے نہایت اطمینان سے اس طرح اپنے کام میں مشغول رہے۔ ان بچوں کو پڑھانے والی یا پڑھانے والے فروبل نیشنل کالج کے تربیت یافتہ ہوتے ہیں۔ ان ابتدائی جماعتوں میں بچوں کے مشاغل اور ان کی دلچسپیوں کے پیش نظر بانی تعلّمہ

تدریسی لوازم کا استعمال ہوتا ہے۔ لندن کے اسکولوں میں ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ ان کی عمارتیں دو منزلہ، سہ منزلہ اور بعض اوقات چہار منزلہ ہوتی ہیں اور ان کے ارد گرد میدان نہیں ہوتا۔ اگر چھوٹا بڑا کوئی میدان ہوتا ہے تو اس میں بچے باسکٹ بال کھیلتے ہیں۔ میدان کے نہ ہونے کی وجہ سے اسکول میں کوئی باغ نہیں ہوتا جہاں بچے فطرت کی رعنائیوں کا بچشم خود مشاہدہ کرسکیں۔ اس لیے ان بچوں کو کبھی کبھی مطالعہ قدرت کی خاطر قریب کے پارک میں بھی لے جایا جاتا ہے۔ لندن مضافات (LONDON SUBERBS) کے مدرسوں میں ایک حد تک یہ خامی نہیں ہوتی۔

جونیر کلاس میں درس و تدریس کا سلسلہ باقاعدہ شروع ہو جاتا ہے۔ سال اول سے سال چہارم تک بچوں کو بہت کچھ پڑھا دیا جاتا ہے۔ سال چہارم ابتدائی مدارس کا آخری سال ہوتا ہے۔ اس وقت بچے کی عمر گیارہ سال کی ہوتی ہے۔ میں نے ہر جماعت کو کام کرتے اور پڑھتے دیکھا۔ ان کے اساتذہ سے بعض طریق تعلیم پر تھوڑی بہت بحث بھی کی۔ جو باتیں سمجھ میں نہیں آئیں ان سے پوچھ لیا اور جو مجھے اپنے نقطہ نگاہ سے بری معلوم ہوئیں ان پر اعتراض کیا۔ لیکن مجموعی طور پر میں نے ہر جماعت کے ماحول کو بہت اچھا پایا۔ دراصل اس سارے ماحول کا حاصل کار بچوں کی مستعدی اور ان کا ہر کام پر شفقت ہے۔ جس وقت ہم سال چہارم کی ایک جماعت میں داخل ہوئے۔ بچے مضمون لکھ رہے تھے۔ ہمارے یہاں مدرس مضمون کا ایک خاکہ تختہ پر لکھ دیتا ہے اور بچے اس کی مدد سے مضمون لکھنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن یہ طریقہ بھی غنیمت ہے۔ مدرسوں میں جاری ہوگا ورنہ بالعموم مضمون لکھ دیا جاتا ہے اور بچے سے رٹنے کے لیے کہہ دیا جاتا ہے۔ انگریزی میں یہ فکری بے عملی کسی حد تک قابل معافی ہو سکتی ہے لیکن اردو میں یہ ذہنی پسماندگی اور بچے میں خود کوشی کی عادت نہ ڈالنا ایک بہت بڑا قومی جرم ہے جس کے ہم سب مرتکب ہوتے رہتے ہیں۔ گیارہ سال کی عمر میں ہمارا بچہ اپنی زبان میں اتنا اچھا مضمون نہیں لکھ سکتا۔ میں نے دو چار بچوں کی کاپیاں دیکھیں۔ ان کے مضامین کا ایک دوسرے سے موازنہ کیا۔ بات ایک ہی تھی۔ موضوع ایک ہی تھا۔ لیکن انداز بیان سب کا جدا جدا تھا۔ بچوں کی اس فکری بلندی نے مجھ پر سب سے زیادہ اثر کیا۔

میں نے بچوں کی قرات اور ان کی گفتگو کا بھی جائزہ لیا۔ قرات میں ایک اوسط درجے کا لڑکا ہمارے اوسط درجے کے لڑکے سے بہتر ہوتا ہے، انگریزی زبان ان کی اپنی زبان ہے، اس لیے اس میں مہارت پیدا کرنے میں آسانی ہوتی ہے، لیکن یہ یاد رہے کہ یہ اکثریت کی مادری زبان نہیں ہے۔ ویلز اور اسکاٹ لینڈ والے تو خیر مختلف زبانیں بولتے ہیں لیکن انگلستان کے شمالی اور جنوبی علاقے کی زبان بھی انگریزی نہیں ہے جسے ہم اور آپ سمجھتے اور بولتے ہیں۔ اس کے باوجود گیارہ سال کی عمر میں براؤننگ اور ورڈز ورتھ کی بعض مقبول نظموں کو بڑے اطمینان سے پڑھتے ہیں، یہی نہیں کہ طوطے کی طرح فر فر سناتے جاتے ہیں، بلکہ اس کے ایک ایک لفظ سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ PASSIHG OF ARTHUR انتخاب سال چہارم کی نصابی کتاب میں موجود تھی۔ میں نے ایک بچے سے اسے پڑھوایا، اس کے مطالب پوچھے، اس کی تاریخی واقفیت پوچھی، اس نے سب کچھ سیدھے سادے انداز میں بیان کر دیا۔ بچوں کی ذہنی بلندی اور مدرسے کے حسن کار کو دیکھ کر میں نے بار بار محسوس کیا کہ جس محنت اور کاوش سے انگریزوں کو انگریزی پڑھائی جاتی ہے، اگر ہمارے بچوں کو اردو پڑھائی جائے تو ان کی ذہنی سطح اگر ان سے اونچی نہیں ہو سکتی تو ان سے کسی طرح کم بھی نہیں رہ سکتی۔ ہم شروع ہی سے بچے کو ایک ایسی زبان پڑھانا شروع کر دیتے ہیں جو اپنے مزاج اور آہنگ میں خالص مغربی ہے جس کے تاریخی، مذہبی اور ادبی پس منظر سے اسے کوئی واقفیت نہیں ہوتی۔ مغربی پاکستان میں گیارہ سال کا بچہ سندھ کے دریائی نظام کو جانتا ہے۔ پہاڑ کی بلندی و بالا، جنوں کے قصے سنتا ہے اکبر اور اورنگ زیب کی داستانیں پڑھتا ہے۔ اس کے گھر ملو ماحول میں مغرب کی نہیں مشرق کی چھاپ ہوتی ہے۔ اسے اس ماحول کی چیزیں پسند آئیں گی کیوں وہ غیر شعوری طور پر ان سے مانوس ہوتا ہے۔ وہ "اے ہمالہ اے کشور ہندوستان" پڑھ کر اس کے ذہن میں ہمالہ کی بلندی کا تصور آ سکتا ہے لیکن ALPINE PEAK تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتی۔ شبلی کی نظم عدل فاروقی پڑھ کر اس کے ذہن میں وہ سارا تاریخی پس منظر آ سکتا ہے جو مسلمانوں کی قوت و جاہت کا ایک اچھا زمانہ کہا جا سکتا ہے لیکن PASSINGOF ARTRUR پڑھ کر پہلے تو الفاظ کے پیچ و خم میں قلابازیاں کھائے

پھر اس کی تاریخی حکایات اور روایاتی حقائق کا جائزہ لینے کی کوشش کرے گا لیکن حق یہ ہے کہ اس کے باوجود ہمیں انگریزی پڑھانے پر اصرار ہے اور یہ محض اس لیے کہ انگریز نے ہمیں صرف انگریزی پڑھائی ہے اور ہمارے ذہن و دماغ پر انگریزی دانی کا ایسا نشہ چڑھا دیا گیا ہے کہ ہم آج بھی اسی نشے میں چور ہیں اور ہمیں اس کا احساس بھی نہیں کہ ہماری موجودہ سیاسی انگریز کی استعماری چالوں سے زیادہ زہرناک ہے۔ لسانی مسائل پر تقریر کرتے ہوئے پچھلے ہفتے پروفیسر لاڈریز نے ہندوستان کی مثال دیتے ہوئے ایک بڑے مزے کی بات کی۔ انہوں نے کہا "اگرچہ یہ صحیح ہے کہ ہندوستانی زبان کو دکن قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ لیکن اگر ہندوستان کو ایک قوم کی حیثیت سے زندہ رہنا ہے تو انہیں ہندوستانی کی تلخ گولی نگلنی ہوگی کیونکہ یہ ایک ایسی زبان ہے جو ہر علاقے میں اگر بولی نہیں تو سمجھی ضرور جاتی ہے" کیا ہمارے ارباب سیاست قومی یک جہتی کے لیے اس قسم کا کوئی قدم اٹھائیں گے، اگر آج وہ اس یک جہتی کو قائم رکھنے میں ناکام رہتے ہیں تو آنے والی نسلیں انہیں جعفر اور صادق سے زیادہ ملعون قرار دیں گی۔

بہر طور سال چہارم کے بچوں کا لسانی معیار میں نے اتنا بلند پایا جو ہمارے یہاں کے پندرہ سولہ برس کے بچوں کا نہیں ہوتا۔ ان کا املا غلط ہوتا ہے اور کہنے کا انداز نہایت بھونڈا ہوتا ہے، اور اس میں جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں بچوں کا قصور کم ہے۔ مدرس اور ماہرین تعلیم کا زیادہ جن کے لیے بہ حیثیت القوم ہم میں سے ہر شخص ذمہ دار ہے۔ یہاں ان ابتدائی جماعتوں میں املا اور خط کی اصلاح کی طرف بالخصوص توجہ دی جاتی ہے۔ بچوں کے پاس اس قسم کی کاپیاں ہوتی ہیں جس میں وہ حروف تہجی کے مطابق غلط الفاظ لکھ لیتے ہیں اور جہاں دوبارہ غلطی کی اس لفظ کو اپنی اس مخصوص کاپی سے دیکھ لیتے ہیں۔ اس طرح دو چار بار کی تکرار کے بعد وہ اسے یاد ہو جاتا ہے۔

جونیئر کلاس کی مختلف جماعتوں میں بچوں کو انگریزی، تاریخ، جغرافیہ اور حساب کے مضامین پڑھائے جاتے ہیں، اس کے علاوہ کچھ دستکاری بھی سکھائی جاتی ہے، موسیقی اور رقص تو ان کی معاشرتی زندگی کا لازمی جزو ہیں، اس لیے ان کی تحصیل کا بھی اہتمام موجود ہے، میں نے دیکھا کہ چھوٹے چھوٹے بچے اس میں بڑے شوق سے حصہ لیتے ہیں۔ ہال میں چھ سال کی عمر کے بچوں کا

رقص بالخصوص دیکھنے کے قابل تھا۔ دراصل اسے فن رقص سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ بچے محض اپنے استاد کی سیٹی کی آواز پر کبھی اچھلتے ہوئے اپنے دائرے میں آگے بڑھتے اور کبھی سیٹی کی آواز پر اپنی جگہ کھڑے ہو جاتے۔ یہاں بھی جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ان کی تنظیم تھی۔

دست کاری بچوں کو ہاتھ سے کام کرنا بھی سکھایا جاتا ہے۔ ابتدائی جماعتوں میں تو نہیں لیکن جونیر کلاسوں میں طلبہ کو گتے سے مختلف چیزیں بنانا سکھایا جاتا ہے اور طالبات کو سینا پرونا اور بننا سکھایا جاتا ہے۔ اس پیریڈ میں طلبہ اور طالبات علیحدہ علیحدہ ہو جاتے ہیں چھوٹے بچے رقص کرتے ہیں۔ غرض ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے احاطۂ عمل میں مصروف کار ہو جاتا ہے دست کاری کے کاموں میں مدرس کی حیثیت محض نگراں کی ہوتی ہے، بچے خود کام کرتے ہیں اور اگر کسی جگہ بھول جاتے ہیں تو مدرس سے پوچھ لیتے ہیں۔

مدرس کی شخصیت یہ تو ایک جانی بوجھی بات ہے کہ بچوں کو پڑھانا سب سے مشکل کام ہے بڑی جماعتوں میں یہ کام نسبتاً آسان ہو جاتا ہے لیکن مبتدی کو حروف شناسی کی منزل سے لے کر آگے چلنا ایک ایسا مشکل مرحلہ ہے جس سے ہر شخص آسانی نہیں گذر سکتا۔ انگریزی نظام تعلیم میں بچوں کی شخصیت کی تہذیب و تربیت کے لیے مدرس کی شخصیت کا بلند و ارفع ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ ایک معاشرے میں معلم کو باوقار دیکھا۔ یہ درست ہے کہ ابتدائی مدارس کا معلم ایک کسان یا کارخانے میں کام کرنے والے مزدور سے کم کماتا ہے مگر وہ قوم کا دماغ سمجھا جاتا ہے، اس لیے اس کی عزت بہی زیادہ قدر ہوتی ہے، کہا جاتا ہے کہ انگریزی معاشرے میں معلم، پادری اور ڈاکٹر (طبیب) سے زیادہ اور کوئی باوقار نہیں، قطع نظر اس سے کہ ان کی آمدنی کتنی ہے یا ان کا معیار زندگی کیا ہے، لیکن اس سے اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے کہ معلم کی معاشی حالت سقیم ہے۔ برن ہم کمیٹی رپورٹ کے مطابق ان کی مالی حالت خاص اچھی ہے۔ تفصیل کے لیے برن ہم کمیٹی رپورٹ کو مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

اس سے میری مراد یہ ہے کہ تعلیم کو ترقی کی اساس قرار دے کر انگریز اپنی تمام تر توجہ

ذہنی تعلیم پر مرکوز کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں ابتدائی جماعتوں میں بھی پڑھے لکھے اساتذہ لئے ہیں مسٹر پوپر کو اپنے پیشے اور اپنے نظامِ کار کے متعلق اتنی وافر معلومات تھیں کہ عام طور پر ہمارے ابتدائی مدارس کے صدر معلم کو نہیں ہوتیں۔ مقامی تعلیمی حکومتیں اساتذہ کے انتخاب میں بڑی احتیاط سے کام لیتی ہیں، انہیں اس بات کا پورا پورا احساس ہے کہ قوم کے بچوں کی ذہنی اور جسمانی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری ہمیں ایسے لوگوں کے سپرد کرنی چاہیے جو اس کام کو بطریقِ احسن انجام دے سکیں چناں چہ ابتدائی مدارس میں بھی جی۔سی۔ای (GENERAL CERTIFICATS OF EDUCATION ADVANCED LEVEL) اور فرد ہل ٹرینڈ اساتذہ ہوتے ہیں۔ جی۔سی۔ای کا یہ امتحان ہمارے یہاں کے انٹرمیڈیٹ معیار کے لحاظ سے اونچا ہوتا ہے۔ جب تعلیمی اخلاقی اور ذہنی لحاظ سے ایسے لوگ کسی ادارے میں کام کریں گے تو ظاہر ہے کہ اس کے نتائج کہیں زیادہ اچھے ہوں گے۔ ہمارے مدرسوں میں مدرس کو اتنی ذہنی آزادی بھی حاصل نہیں ہوتی کہ وہ اپنے طور پر خود کوئی کام کر سکے، بلکہ حق تو یہ ہے کہ اکثریت کو اپنے پیشے سے محبت ہی نہیں ہوتی۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ کوئی مدرس کسی ادارے میں اچھا کام نہیں کر سکتا یہاں ان اداروں کا سالانہ معائنہ بھی نہیں ہوتا۔ لیکن ان کے کاروبار میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔ اس اسکول کا پچھلی جنوری میں پندرہ سال کے بعد معائنہ ہوا تھا۔ ایچ۔ ایم۔ آئی (HER MAJESTYS INSPECTER) کی رپورٹ میں نے شروع سے آخر تک پڑھی۔ رپورٹ کا لہجہ آمرانہ نہیں دوستانہ تھا حتیٰ کہ اس میں نصیحت کا پہلو بھی نہ تھا۔

نظم و ضبط

مدرسین کی خدمت کے ذکر کے ساتھ ساتھ ذہن اسکول کے نظم و ضبط کی طرف منتقل ہو جاتا ہے صرف یہ کہہ دینا کہ اسکول کا نظم و ضبط بہت ہی اچھا ہے اس سے فی الواقع نظم و ضبط کی وضاحت نہیں ہوتی ہے۔ اسکول کے ایک ایک حصے میں ہیڈ ماسٹر کے ساتھ ساتھ اور خود تنہا پھرتا رہا لیکن میں نے کہیں بھی شور و غل نہ دیکھا نہ بچوں کو آپس میں لڑتے جھگڑتے دیکھا نہ کسی کو کاغذ پھینکتے پایا اور نہ کسی کو دیوار پر لکھتے دیکھا۔ کھیل میں بھی شور و ہنگامہ نہ تھا یہ ایک نظام کے تابع اپنا

پنا کام خود ہی کرتے ہیں اور بہت کم شکایت کا موقع دیتے ہیں۔
برطانیہ میں بچوں کو مارنا یا ہر وقت ان کی زجر و توبیخ کرنا ممنوع ہے کیوں کہ اس سے بچے کی شخصیت پر بہت برا اثر پڑ سکتا ہے۔ مدرس کا کام تو بچہ کی شخصیت کو ایک ایسے سانچے میں ڈھالنا ہے کہ اپنی آئندہ زندگی میں کسی دوسرے کا دست نگر نہ ہو بلکہ ایک آزاد ماحول میں اچھی زندگی بسر کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اسکول میں بھی بچوں کی نگہداشت اسی عنوان سے کی جاتی ہے۔ بچوں کو آزادی کا تصور دلاتے ہوئے انہیں نظم و ضبط کا خوگر بنانا ایک بہت بڑا کام ہے۔ جسے برطانوی مدرسے بہ طریق احسن انجام دے رہے ہیں، صبح سے لے کر شام تک بچوں کی زندگی ایسی منظم اور باقاعدہ ہوتی ہے کہ اس میں انہیں ہنسنے بولنے کا بھی موقع ملتا ہے اور کھیل کے میدان میں خوش فعلیوں کا بھی موقع ملتا ہے۔ کھانے پینے کی بھی سہولتیں ہیں اور رقص و سرود کے مواقع بھی، اس ماحول میں وہ چھ سال تک پرورش پاتے ہیں اور گیارہ برس کی عمر میں کسی دوسرے مدرسے میں منتقل ہو جاتے ہیں۔ ہمارے ملک میں نظم و ضبط کا تصور ہی مختلف ہے۔ یعنی بچوں کو جب تک مدرس کی شعلہ بار آنکھوں اور زناٹے ہوئے ہاتھ کا خوف نہ ہو وہ کام نہیں کرتے آخر کیوں، اس لیے کہ انہیں ابتدا ہی سے خوف و ہراس کا خوگر بنایا جاتا ہے، بچہ مدرسے کے باہر پولیس کی مردم آزاری کے تماشے دیکھتا ہے، گھر میں حاکم و محکوم کے قصے سنتا ہے، اس لیے وہ بھی غیر شعوری طور پر اس کا عادی ہو جاتا ہے اور جب اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ مدرس اس قسم کے حربے استعمال نہیں کر سکتا جو ہماری معاشری زندگی میں ایک پولیس والا کرتا ہے تو وہ کام کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ حکم عدولی کرتا ہے اور یا وہ گوئی میں سارا وقت ضائع کر دیتا ہے تو وہ بھی اس سے کام لینے کا وہی طریقہ اختیار کرتا ہے جو ہماری معاشری زندگی کے دوسرے شعبوں میں قائم ہے۔ اس طرح نظم و ضبط قائم رکھنے کا صحیح طریقہ جسمانی سزا بن جاتا ہے تاکہ لڑکے کام بھی کریں اور مدرس کو تنگ بھی نہ کریں۔ لیکن موجودہ معاشری حالات کے پیش نظر جسمانی سزا کے بل بوتے پر نظم و نسق قائم رکھنے کے جواز میں خواہ کتنے وقیع دلائل کیوں نہ پیش کیے جائیں اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس سے بچوں کی شخصیت دب جاتی ہے، ان کی ذہنی اور تخلیقی قوتیں ماری جاتی ہیں۔

اور آگے چل کر ان میں ایک ایسا ردعمل پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ آداب و اخلاق کی حدود پھاند کر بالکل شورہ پشت بن جاتے ہیں۔

میں نے مسٹر پورٹر سے نظم و ضبط کے موضوع پر بڑی دیر تک بات کی جو اصولی کم تھی اور اُن کے اسکول سے زیادہ متعلق تھی، مسٹر پورٹر نے میرے ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ مجھے بھی کبھی کبھی بعض ایسے مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے کہ ایک کج رو بچے کو کس طرح درست کیا جائے لیکن جسمانی سزا کی نوبت نہیں آتی، کیوں کہ جب ہم بچہ کو ایک مذموم حرکت کرتے دیکھتے ہیں اور پھر یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اس کا باربار اعادہ ہو رہا ہے تو ہمیں یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ یا تو بچہ ذہنی طور پر پس ماندہ ہے یا اسکی گھریلو تربیت میں کچھ نقص ہے یا کوئی اور غیر معمولی بات ہے جس نے اس کے ذہن کو ماؤف کر دیا ہے ہم یہ معلوم کرنے کے لئے کہ بچہ ان میں سے کس حادثہ کا شکار ہے ہم اس کی باقاعدہ تحقیق کرتے ہیں۔ پولیس کی طرح نہیں ایک ہمدرد اور رہنما کی طرح۔ ہماری تھوڑی سی اس روداد کے بعد ۹۰ فی صد حالات میں صحیح مرض معلوم ہو جاتا ہے اور جب مرض کی تشخیص ہو جائے تو علاج مشکل نہیں ہوتا۔

اس سلسلے میں مسٹر پورٹر نے ایک واقعہ سنایا، ایک بچہ اس اسکول میں دو سال سے پڑھتا تھا، لیکن اس سے مجھے یا میرے ہم کاروں کو کبھی شکایت نہیں ہوئی، وہ صاف ستھرا بھی رہتا اور وقت پر اپنا کام مکمل کر لیتا، اس کی ذہنی صلاحیتیں بھی بظاہر متوسط درجے کے لڑکے سے بہتر تھیں تیسرے سال دسمبر سے اس میں ایک نمایاں تغیر پیدا ہوا، وہ کچھ چڑچڑا سا ہو گیا تھا، وہ اپنے ساتھیوں سے لڑتا، اپنی کاپی پھاڑ ڈالتا، اور دورانِ تدریس میں اپنی کتاب کو اپنے دانتوں سے نوچتا رہتا۔ اب اس کے چہرے پر نہ پہلی سی شگفتگی تھی اور نہ ہونٹوں پر وہ تبسم، بظاہر اس تغیر کی کوئی وجہ معلوم نہ ہوتی تھی، اس کے استاد نے اسے سمجھایا اور اس بدلے ہوئے تیور کی وجہ پوچھی گئی، وہ خاموش رہا، میں نے بھی اس سے مختلف انداز میں یہی بات پوچھی مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا، میں نے زیادہ اصرار کیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے، اس کی یہ حالت دیکھ کر میں نے موضوع گفتگو ہی بدل لیا اس کی ڈھارس بندھائی اور اسے اس کی جماعت میں بھیج دیا، لیکن چونکہ اس بے کیفی نے مجھے اور

عن نبادیا. اب میں نے اس سے کچھ زیادہ پوچھنا مناسب نہ سمجھا. بلکہ خود ہی اس کے گھریلو حالات
دم کر تا رہا. کوئی پندرہ بیس دن کی مسلسل تگ و دو کے بعد مجھے یہ معلوم ہوا کہ جونز کے امیر باپ نے
نز کی ماں کو طلاق دے دی ہے اور بچے کی تولیت کا مسئلہ عدالت میں پیش ہے، والدین کی
اکشیدگی اور مقدمے کی اس نوعیت نے جونز کو آزردہ کر دیا تھا...... اور یہ ایک طولانی
تان ہے. بہر صورت متعلقہ تعلیمی حکومت کے توسل سے میں نے جونز کے لیے اس کے باپ سے ایک
نقول وظیفہ مقرر کرا کے اسے ایک بورڈنگ ہاؤس میں رکھا دیا اور اس کی ہر طرح پاس داری
رتے رہے. خدا کا شکر ہے کہ ہماری یہ کوششیں بارآور ہوئیں اور جونز آج سال چہارم کے بہت ہی
چھے طلبہ میں شمار ہوتا ہے —— یہ کہتے ہوئے مسٹر پورٹر آگے بڑھے اور دروازہ کھول کر ایک
جماعت میں داخل ہوئے اور استاد سے اجازت لے کر کہا بیٹا جونز یہاں تو آؤ. مسٹر پورٹر کی آواز پر
ایک بہت ہی صاف ستھرا اور باسلیقہ لڑکا ہمارے سامنے کھڑا ہو گیا.

"HERE IS JONES, GENTLEMEN" مسٹر پورٹر نے ہمیں
حضرات یہ ہے جونز
مخاطب کرتے ہوئے کہا -

میں نے اور میرے ایک دو ساتھیوں نے جونز سے باتیں کیں، اس سے ذاتی مشاغل کے متعلق استفسار
کیا. اس نے بڑے اطمینان سے کہا. رونے سے مجھے نفرت ہے. میں پیانو بجا لیتا ہوں اور.....
اس کو قدرے ہچکچاتے دیکھ کر مسٹر پورٹر نے سہارا دیا. ہاں کیا کہنا چاہتے ہو —— یہی کہ گا بھی لیتا
ہوں. فرصت کا میرا یہی مشغلہ ہے، شام کو یہاں سے جا کر میں اپنے چند دوستوں کے ساتھ کشتی رانی
کی مشق کرتا ہوں، مجھے بحری فوج کے سپاہی اور افسر بہت اچھے معلوم دیتے ہیں. اور ذرا جھجکتے ہوئے
THEY SAY, "YOU WILL BE ONE DAY A GOOD NAVAL اس نے پھر کہا
OFFICER, JONES." وہ کہتے ہیں " جونز کسی روز تم بہت اچھے بحری
افسر بنو گے". جس وقت جونز یہ کلمات ادا کر رہا تھا اس کی نگاہیں نیچی تھیں لیکن اس کی آواز میں
ایک وقار تھا. جماعت سے باہر نکل کر ہم سب نے مسٹر پورٹر کو ایک بچے کی زندگی بچانے اور اسے

ایک مخصوص دھارے میں ڈالنے پر مبارک باد دی۔ مسٹر پورٹر نے مسکرا کر کہا۔ یہ تو ایک واقعہ ہے جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے، اس قسم کے واقعات سے ہر مدرس کو دو چار ہونا پڑتا ہے اور یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم بچوں کی رہنمائی کرتے رہیں۔

فلوٹ ٹیچر اس مدرسے میں ایک نووارد کو ایک اور عجیب چیز نظر آئے گی، یعنی بعض جماعتوں میں ایک استاد کی بجائے بیک وقت دو استاد ہوں گے، ان میں ایک کلاس ٹیچر ہوتا ہے دوسرے کو فلوٹ ٹیچر (FLOAT TEACHER) کہتے ہیں۔ ابتدائی مدارس میں ایک مضمون کے مخصوص استاد نہیں ہوتے بلکہ ایک ہی استاد ایک جماعت کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ فلوٹ ٹیچر کلاس ٹیچر کو ان بچوں کی تدریس میں مدد دیتا ہے جو پڑھنے لکھنے میں بالعموم کمزور ہوتے ہیں۔ انگریزی نظام تعلیم میں ہر جماعت کو تین حصوں میں تقسیم کر لیتے ہیں۔ الف۔ ب۔ ج۔ یہ تقسیم دراصل طلبہ کی ذہنی بلندی اور پستی کے مطابق ہوتی ہے۔ گرامر اسکول میں یہی طلبہ علیحدہ علیحدہ کمروں میں بٹھا دیے جاتے ہیں اور ان کے معیار کے مطابق ان کی تدریس کا انتظام کیا جاتا ہے۔ لیکن ابتدائی مدارس میں بچوں کا فرق اتنا زیادہ نہیں ہوتا اس لیے انہیں علیحدہ نہیں کیا جاتا، وہ ایک ہی کمرے میں بیٹھ کر اپنا کام کرتے ہیں صرف ان کی نشست کی قطاریں مخصوص ہوتی ہیں۔ فلوٹ ٹیچر انہی بچوں کو اوسط سطح پر لانے میں کلاس ٹیچر کی امداد کرتا ہے۔

ابتدائی مدارس میں ایک التزام یہ ہے کہ بچوں کو گھر کا کام نہیں دیا جاتا وہ اسکول ہی میں کام کرتے ہیں اور یہیں اپنی ساری چیزیں چھوڑ کر گھر چلے جاتے ہیں، دوسرے دن آکر پھر اسی طرح اپنے کام میں لگ جاتے ہیں، دس گیارہ سال کے بچوں کو البتہ اجازت ہوتی ہے کہ وہ اپنا بستہ ساتھ لے جائیں، کیوں کہ اس عمر میں انہیں ذمہ دار سمجھا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ابتدائی جماعتوں میں بچے کو کھیل کود سے زیادہ اور لکھنے پڑھنے سے کم رغبت ہوتی ہے، اس خیال کے پیش نظر ٹیچر اور فلوٹ ٹیچر مل کر بچوں سے کافی کام لے لیتے ہیں۔

کتب خانہ اس اسکول میں ایک چھوٹا سا خوب صورت کتب خانہ بھی ہے، اس کتب خانے کو دیکھ کر

مجھے پنجاب کے ایک روایاتی ہیڈ ماسٹر صاحب کا خیال آگیا جنھوں نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ ثانوی مدارس میں کتب خانے کی کیا ضرورت، کون کتاب پڑھتا ہے، دراصل لندن کاؤنٹی کونسل کے ہر بورو میں ایک بہت بڑا کتب خانہ ہوتا ہے جس میں لازمی طور پر ایک بچوں کا سکشن بھی ہوتا ہے، لیکن اس خیال سے کہ ہر بچہ کتب خانے میں پہونچ کر ان کتابوں سے استفادہ نہیں کرسکتا کچھ کتابیں اسکول کے کتب خانہ میں منتقل کردی جاتی ہیں، جہاں بچے اپنے اساتذہ کی رہنمائی میں کتابیں لے جاتے ہیں، اور پڑھ کر واپس دے جاتے ہیں۔ گرامر اسکول میں مقامی تعلیمی حکومت کتب خانے کے لیے باقاعدہ گرانٹ دیتی ہے۔

امتحانات

انگریزی ابتدائی مدارس میں امتحان دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک داخلی اور دوسرا خارجی داخلی امتحان تو طلبہ کو ایک جماعت سے دوسری جماعت میں ترقی دینے کے لیے ہوتا ہے جس کا انتظام اسکول کے اساتذہ خود ہی کرتے ہیں اور یہ کوئی ایسی انوکھی چیز نہیں ہے۔ ہمارے مدرسوں میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے، خارجی امتحان البتہ ذرا مختلف ہوتا ہے اس کی وضاحت کے لیے میں مڈل سکس بورو (جس میں ایج ویر اسکول قائم ہے) کی مثال پیش کرتا ہوں۔ اس بورو میں ۲۲ ابتدائی مدارس ہیں اور ہر مدرسہ نصاب۔ نصابی کتابیں اور طریق تدریس میں ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ یعنی جو کتابیں اس مدرسے میں پڑھائی جاتی ہیں ممکن ہے وہ باقی ۲۱ مدرسوں میں اور کہیں نہ پڑھائی جاتی ہوں۔ ان سارے مدرسوں کے آخری سال کا امتحان ایک ہوتا ہے جس کے ممتحن بالعموم گرامر اسکول کے اساتذہ ہوتے ہیں، بظاہر یہ ایک عجیب و غریب بات معلوم ہوتی ہے کہ ایسے مدارس جو مختلف خطوط پر تعلیم و تدریس کا انتظام کرتے ہوں اپنے بچوں کو ایک مشترکہ امتحان میں کس طرح شامل کرتے ہوں گے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ سال چہارم کے لیے ایک معیار مقرر ہے، ہر مدرسہ اس معیار کے مطابق طالب علم کو تیار کرتا ہے جو طلبہ اس امتحان میں کامیاب ہوجاتے ہیں وہ کسی گرامر اسکول میں داخل ہوسکتے ہیں۔

امتحان میں صرف دو مضمون شامل ہوتے ہیں۔ انگریزی اور حساب جن کی باقاعدہ تدریس ہوتی ہے

اس کے علاوہ ایک پرچہ بچوں کی ذہانت کا جائزہ لینے کے لیے بھی ہوتا ہے، امتحان کے پرچے دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک نئے طریقِ امتحان کے مطابق دوسرے روایاتی طریقِ امتحان کے مطابق انگریزی کے پرچے میں ۱۲۰ سوال ہوتے ہیں اور وقت ۴۵ منٹ، ان سوالات کی نوعیت مختلف ہوتی ہے جن میں قواعد اور عام بول چال کے سوال شامل ہوتے ہیں، حساب کا پرچہ دو حصوں میں منقسم ہوتا ہے۔ پہلے جز میں ۵۰ سوال ہوتے ہیں جن کے حل کرنے کے لیے طلبہ کو بیس منٹ ملتے ہیں، دوسرے جز میں روایاتی سوال ہوتے ہیں جن کے لیے ۴۰ منٹ ملتے ہیں۔ ذہانت کے امتحان میں ایسے سوالات ہوتے ہیں جن سے بچے کی قوتِ فہم اور اس کے ادراک کا صحیح اندازہ لگایا جا سکے اس کے علاوہ ایک پرچہ مضمون نویسی کا ہوتا ہے، پرچے میں چند عنوانات درج ہوتے ہیں، بچہ ان میں سے کسی ایک پر ایک مختصر مضمون لکھ سکتا ہے۔

بچوں کے پرچوں کے دیکھنے کے بعد ہر بچے کا اسکول ریکارڈ بھی دیکھا جاتا ہے، کیوں کہ یہ تو ایک واضح بات ہے کہ امتحان کسی کی لیاقت کا آخری جائزہ نہیں، اس میں اختلاف کی بڑی گنجائش ہے، اس لیے یہ ممکن ہے کہ بعض وجوہ کی بنا پر ایک بچہ امتحان کے پرچے اچھے نہ کر سکا ہو لیکن ویسے اس کا ریکارڈ اچھا ہو۔ اس صورت میں بچے کو اگلی جماعت میں ترقی دے دی جاتی ہے، چناں چہ اس انتظام سے یہ فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ جو بچے فی الواقع آگے چل سکتے ہیں یا انھیں چھوٹی موٹی فروگذاشت کی وجہ سے ایک سال مزید اس جماعت میں رہنے سے نجات مل جاتی ہے۔ انگریز بچوں کے ناکام یاب ہونے کو قومی خسارہ سمجھتے ہیں، اور اگر خدانخواستہ کسی مدرسے میں اس قسم کا واقعہ پیش آ جائے تو مزدور کی جھونپڑی سے لے کر حکومت کے بلند و بالا ایوانوں تک ایک ہنگامہ مچ جائے اور مقامی تعلیمی حکومت کو جان کے لالے پڑ جائیں۔ اس لیے ہر شخص اپنی اپنی جگہ اپنے فرض کو فرض سمجھ کر انجام دیتا ہے۔ ہمارے ملک میں امتحانات کی نوعیت بالکل مختلف ہوتی ہے، اگرچہ ہمارے نظامِ امتحانات کا سرچشمہ بھی سرزمین ہے۔ مگر ہمارے ہاتھوں میں وہ اس قدر مسخ ہو چکے ہیں کہ ان سے قوم کو فائدہ کی بجائے نقصان ہی پہونچتا ہے، یہی

ہے کہ ہمارے ملک میں اکثر ذہین اور زیرک بچوں کی زندگی خراب ہو جاتی ہے اور قوم ان کی ذہانت سے فائدہ اٹھانے سے محروم ہو جاتی ہے۔

کھیل لندن کے عام اسکولوں میں کھلے ہوئے میدان نہیں ہیں، اس سے یہ اسکول بھی مستثنیٰ نہیں۔ ایک مختصر سا میدان اسکول کی عمارت کے سامنے ہائی اسٹریٹ پر اسکول کے احاطہ ہی میں واقع ہے، اور ایک کھیل میں اور ایک عمارت کے عقب میں، اس عقبی میدان میں نو سے گیارہ سال کے بچے باسکٹ بال کھیلتے ہیں کھیل میں بالعموم طلبہ اور طالبات کو علیحدہ کر دیا جاتا ہے ہم نے دونوں گروہوں کو باری باری کھیلتے دیکھا۔ کھیل کے لیے جوتے اور اس کے ضروری لوازم اسکول ہی میں رکھے رہتے ہیں حسب ضرورت طلبہ انہیں استعمال کرتے ہیں اور کھیل ختم ہونے کے بعد انہیں پھر ان کی مخصوص جگہوں پر رکھ دیتے ہیں۔ ابتدائی جماعتوں کے علاوہ کھیل کی نگرانی نہیں کی جاتی۔

یہاں ہفتے میں ۵ دن کام ہوتا ہے، اس لیے اسکول میں بھی دو دن کی تعطیل ہوتی ہے ہفتے کے روز بالعموم طلبہ اسکول میں کھیلنے کے لیے آتے ہیں، مسٹر پورٹر نے کھیلوں کے سلسلے میں ہمیں یہ بھی بتایا کہ چونکہ اسکول کے پاس میدان نہیں ہیں، اس لیے بچے قریب کے کلیسا کے میدان میں فٹ بال۔ ہاکی اور کرکٹ کھیلتے ہیں، وہ میدان ان کے لیے کافی ہے۔ یہ کلیسا مڈل سکس پروکا ہے، اس لیے ارباب کلیسا کو اعتراض بھی نہیں ہوتا، بلکہ بچوں کی تعداد کے پیش نظر اگلے سیشن سے سال چہارم کے دونوں فریقوں کو کلب کے دو کمروں میں منتقل کرنے کا انتظام ہو رہا ہے۔

سمعی وبصری تعلیم دورِ حاضر میں سائنس نے جو نمایاں ترقی کی ہے اس کا ایک پہلو تو ایٹم بم ہے دوسرا پہلو زندگی کی آسانیاں ہیں، یہ سائنس ہی کی برکات ہیں کہ فلم اور ریڈیو کی مدد سے تاریخ اور جغرافیہ کے اسباق اس طرح پڑھائے جا سکتے ہیں جیسے وہ واقعہ ان کی اپنی آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے۔ بچے کہانیاں سننے کے شائق ہوتے ہیں اس لیے دوران تدریس میں بی بی سی سے بچوں کا جو پروگرام نشر ہوتا ہے اس کی آواز بچوں کے کانوں تک پہنچائی

جاتی ہے۔ ہر جماعت میں ایک ریڈیو موجود ہے جب پروگرام کا وقت ہوا مدرس نے ریڈیو چلایا
بچے ان کہانیوں کو بڑے انہماک سے سنتے ہیں اور پھر اس پر باقاعدہ تبصرہ بھی کرتے ہیں، اس سے
ان کی قوت فہم قوت سامع اور قوت تجزیہ میں معتدبہ اضافہ ہوتا ہے، بچوں میں اعتماد پیدا ہو جاتا
ہے اور وہ اپنا کام از خود کرنا سیکھ جاتے ہیں۔

ہر کمرہ بہت صاف ستھرا ہوتا ہے، یہ نہیں کہ دیواروں پر دور از کار تصویریں اور چارٹ آویزاں
ہیں جن کی درا صل کوئی تعلیمی افادیت نہیں، ایسے کمروں میں بیٹھ کر پڑھنے کو کیوں نہ جی چاہے
مسٹر پورٹر نے بتایا کہ مستقبل قریب میں ٹیلی وژن کا بھی استعمال ہو جائے گا۔

تعلیمی سیاحتیں لندن ایک شہر نہیں بجائے خود ایک دنیا ہے، یہاں یہ بھی ممکن ہے کہ مشرقی
لندن کا رہنے والا شاید مغربی لندن کبھی نہ گیا ہو، اسے اپنے کاروبار سے
کب فرصت ملتی ہے کہ وہ ایک مقام سے دوسرے مقام کا سفر کرتا رہے، اسے تو اپنے پڑوسی کی
بھی خبر نہیں ہوتی۔ زندگی کے اس پہلو کو نظر میں رکھتے ہوئے بچوں کو مختلف علاقوں کی سیر بھی کرائی
جاتی ہے، عجائب گھر، آرٹ گیلری، پکچر گیلری یہ تو خیر ایسے ادارے ہیں جہاں بچوں کو لے جانا
بہت ہی ضروری سمجھا جاتا ہے، اس سے بچوں کا ذہن بھی بالیدہ ہوتا ہے اور وہ شروع ہی سے
اپنی قوم اور اپنی قومی روایات کے متعلق سوچنا شروع کر دیتے ہیں۔ (مسلسل)

امریکہ میں اعلیٰ تعلیم اور غیر ملکی طلبہ

شاہد اشرف مسلسل نمبر ۴

مالی امداد

دسمبر کے شمارہ میں دیے گئے اخراجات کو کم کرنے یا انہیں بعد میں ادا کرنے کے کئی طریقے ہیں۔ غیر معمولی قابلیت کے طلبہ کو وظیفے اور فیلوشپ مل سکتی ہے۔ بعض اوقات غیر ملکی طلبہ کو قرضہ بھی مل سکتا ہے۔ مالی امداد کی تیسری صورت یہ ہے کہ کالج میں تھوڑا بہت کام کرنے کو مل جائے یا تعطیلات گرما میں کام کر لیا جائے۔ ریاستہائے متحدہ کا مرکزی قومی ادارہ جو غیر ملکی طلبہ کو وظائف۔ اخراجات سفر مفت خوراک اور رہائش وغیرہ کی امداد دیتا ہے، وہ انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل ایجوکیشن کے نام سے موسوم ہے اس کا صدر دفتر نیو یارک ۲۱ میں نمبر ا ایسٹ ۶۷ سٹریٹ پر واقع ہے۔ اس انسٹی ٹیوٹ اور ریاستہائے متحدہ کی حکومت کی مدد اور رہنمائی کے لیے مختلف ملکوں میں ماتحت کمیٹیاں قائم ہیں، نیو یارک میں خط لکھنے سے پہلے اپنے ملک کی ماتحت کمیٹی سے بات چیت کرنی چاہیے اصولاً یہ انسٹی ٹیوٹ انہی طلبہ کے لیے امداد حاصل کرنے کا بندوبست کرتی ہے جن کی درخواستیں ملکی کمیٹی کی معرفت آئی ہوں۔

وظائف اور فیلوشپ

ریاستہائے متحدہ میں اعلیٰ قابلیت کے طلبہ کو وظائف مل سکتے ہیں، میٹرک پاس کرنے کے بعد انڈر گریجوایٹ سطح پر تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھی کچھ وظائف ہیں لیکن زیادہ وظائف ا ن لوگوں کے لیے ہیں جو گریجوایٹ سطح پر تحقیقاتی کام کرنا چاہتے ہوں ان وظیفوں کے لیے گھر سے روانگی سے پہلے بھی درخواست دی جا سکتی ہے لیکن زیادہ بہتر یہی ہے کہ امریکہ میں سال بھر کام کرنے کے بعد وظائف کے موزوں مواقع کی تلاش کی جائے۔ ان وظائف کی نوعیت اور ا

متعلق تفصیلی معلومات حاصل کرنے کے لیے طالب علم انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل ایجوکیشن کی طرف رجوع کرسکتا ہے۔

سب وظیفوں کی مالیت ایک سی نہیں، ان میں سب سے بڑھیا وظیفے وہ ہیں جن میں نہ صرف امریکہ تک آنے جانے کے اخراجات شامل ہوتے ہیں بلکہ پڑھائی کی فیس، خوراک اور رہائش کے بھی۔ ایسے وظیفوں کی تعداد بہت کم ہے۔ بعض وظیفے صرف پڑھائی کی فیس اور رہائشی اخراجات تک محدود ہوتے ہیں اور بعض فیس کے ساتھ خوراک اور رہائش کے اخراجات بھی ادا کرتے ہیں ایسے وظیفے جو محض پڑھائی کی فیس تک محدود ہیں تعداد میں سب سے زیادہ ہیں اور ان کا حاصل کرنا سب سے سہل۔

ریاست ہائے متحدہ کے کئی کالج اور تعلیمی اوقاف غیر ملکی طلبہ کو وظائف پیش کرتے ہیں۔ حالیہ سالوں میں امریکی حکومت نے بھی تبادلہ طلبہ کے منصوبے کے ماتحت بہت سے وظیفے پیش کیے ہیں، بہت سے وظیفوں کے ابتدائی مراحل انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل ایجوکیشن ہو طے کرتی ہے، اس مطلب کے لیے درخواست کا فارم وظیفہ دینے والے تعلیمی ادارے یا اپنے ملک کی متعلقہ کمیٹی سے حاصل کرنا چاہیے، انسٹی ٹیوٹ سے وظائف کے امکانات معلوم کرنے کے لیے ستمبر یا اکتوبر تک درخواست بھیج دینی چاہیے، اس درخواست میں اپنے تفصیلی کوائف اور مزید پڑھائی کے مقاصد وضاحت سے درج ہونے چاہئیں۔

قرضے

بہت سے امریکی طلبہ کو کالجوں کی طرف سے قرضے کی امداد مل جاتی ہے، غیر ملکی طلبہ کے لیے قرضے کی آسانیاں اتنی فراواں نہیں۔ تاہم قرضہ حاصل کرنے کی ایک ضروری شرط یہ ہے، کہ غیر ملکی طالب علم نے ایک سال امریکی کالج میں گذارا ہو، قرضے کی بہت عام صورت یہ ہے۔ کہ فیس کی ادائگی تعلیم ختم ہونے تک ملتوی کردی جائے، ڈگری کے حصول پر یہ قرض سود کی ایک معمولی شرح کے ساتھ واپس کردیا جاتا ہے، غرض کالجوں کی طرف سے جو قرضہ مل سکتا ہے اسکی

دار بہت تھوڑی ہے اور اس کی ادائیگی بھی جلد کرنا پڑتی ہے، رہائشی اخراجات کے لیے عموماً قرض نہیں ملتا، اور اگر کہیں ایسی گنجائش ہو بھی تو بھی اس قرض کی مقدار کل اخراجات کی ایک چوتھائی سے بڑھنے نہیں پاتی۔

اپنی مدد آپ

امریکی قوم دوسروں سے مدد مانگنے کی بجائے اپنی مدد خود کرنے کی زیادہ قائل ہے۔ امریکی سیاست، صنعت اور تعلیم میں کئی ممتاز شخصیتیں ایسی گذری ہیں جنہوں نے خود کام کر کے تعلیم حاصل کی پڑھائی کے زمانہ میں انہوں نے دارالطعام میں کھانا کھلانے برتن صاف کرنے فرش دھونے یا ہوسٹل میں کام کاج کرنے سے روپیہ کمایا اور تعلیمی اخراجات پورے کیے۔ بعض نے دکانداروں کا ہاتھ بٹایا یا درس گاہ کے قریب چھوٹی موٹی دکان کھول لی اور اس طرح تعلیمی اخراجات پورے کر لیے بعض نے کوآپریٹو اقامت گاہوں میں رہ کر وقت پورا کر لیا۔ یہ ایسی اقامت گاہیں ہیں جہاں طلبہ کھانا پکانے کا سارا کام خود کرتے ہیں جس سے اخراجات میں بڑی کمی آ جاتی ہے۔ امریکہ میں طلبہ اس قسم کی محنت مزدوری کو گھٹیا نہیں سمجھتے۔ بلکہ طالب علم کے لیے خود کفیل ہونا ایک خوبی سمجھی جاتی ہے۔ ریاست ہائے متحدہ کے غیر ملکی قوانین اور انکم ٹیکس قوانین کی رو سے غیر ملکی طلبہ کے لیے محنت مزدوری کے مواقع محدود ہیں، لیکن اگر اس کے پاس روپیہ کافی نہ ہو تو ایک سمسٹر گذار لینے کے بعد وہ اپنے تعلیمی اخراجات کا کچھ حصہ خود کما سکتا ہے، ہر کالج میں طلبہ کے لیے ایک دفتر روزگار موجود ہوتا ہے۔ اس طرح ہر کالج میں بعض تنظیمیں ایسی ہوتی ہیں جو غیر ملکی طلبہ کی دستگیری کے لیے قائم کی گئی ہوتی ہیں۔ مثلاً "بین الاقوامی مرکز" یا "غیر ملکی طلبہ کا مشیر" یا "امریکی دوست"، یہ جماعتیں کام تلاش کرنے میں مدد دیتی ہیں۔

غیر ملکی طالب علم بعض اوقات اپنے ثقافتی پس منظر یا مخصوص قابلیت کے باعث ایسے ذرائع سے بھی آمدنی پیدا کر سکتا ہے جو امریکی طلبہ کے لیے کھلے نہیں۔ کالج کے اخبار میں اشتہار دے کر یا نوٹس بورڈ پر اطلاع چسپاں کر کے یا کالج کے دفتر روزگار میں نام درج کرا کے غیر م

ب علم خواہش مند لوگوں کو اپنی زبان پڑھا سکتا ہے۔ بعض طلبہ اپنے ملکوں پر تقریریں کر کے یا رسالوں
مضامین لکھ کر بھی روپے کما سکتے ہیں۔

ائی کام

پڑھائی کے ساتھ ساتھ محنت مزدوری کرنے سے طالب علم کی پڑھائی میں کچھ نہ کچھ ہرج
رہو گا لیکن اگر وہ تعطیلات گرما میں کوئی کام اختیار کرے گا تو اس سے یہ قباحت پیدا نہ ہو گی
کے ساتھ ہی اسے امریکی زندگی کو زیادہ قریب سے دیکھنے اور انگریزی زبان بلا تکلف بولنے
ی موقع ملے گا لیکن اس میدان میں بھی غیر ملکی طالب علم کے لیے مواقع محدود ہیں۔ گرمائی کام
کی طلبہ کی تعلیم و تربیت کا ایک اہم جزو ہے۔ تعطیلات گرما میں کام کرنے کے لیے وہ دور دور شہروں
نکل جاتے ہیں، یہ کام فنی نوعیت کا بھی ہو سکتا ہے اور غیر فنی نوعیت کا بھی، دوسری صورت
کام اس قسم کا ہو گا جیسے کسی ہوٹل یا بڑی دکان پہ کام کرنا، یا کسی کسان کو کام میں مدد دینا
عتی کام کے لیے اجرت کم ملتی ہے لیکن اس سے زراعتی تکنیکوں کی اچھی طرح خبر ہو جاتی ہے
نے پینے کی فراوانی ہوتی ہے اور وقت کھلی ہوا میں کٹتا ہے۔ کارخانوں میں کام کرنے سے
نعتی تنظیم اور مزدوروں کی زندگی کے حالات معلوم ہوتے ہیں، فنی کام زراعتی اور انجینئرنگ
دانوں میں مل سکتا ہے لیکن اس کا حاصل کرنا عام طور پر مشکل ہے۔ گرمائی کیمپ کام کا ایک
چھا موقع پیش کرتے ہیں، یہ کیمپ پہاڑی مقامات یا دوسری پرنظارہ جگہوں میں ملک بھر میں
منعقد کیے جاتے ہیں، ان کی غایت یہ ہوتی ہے کہ امریکی بچے کچھ ہفتے کھلی ہوا اور صحت بخش
ماں میں گذار کر تنومند ہو جائیں، جو لوگ ان کیمپوں کی نگرانی پر مامور ہوتے ہیں ان کے ذمہ یہ
م ہوتا ہے کہ بچوں کی دیکھ بھال رکھیں، ان کی کھیلوں اور دوسری سرگرمیوں میں شریک ہو کر
نمائی کریں، انہیں دست کاری اور جسمانی کرتب سکھائیں وغیرہ، ان کیمپوں میں کام کرنے
مواقع کے متعلق روٹری کلب، غیر ملکی طلبہ کے مشیر یا دوستوں سے واقفیت حاصل کی جا سکتی ہے
یاستہائے متحدہ میں داخلہ۔ امریکی کالج میں داخلہ کا سرٹیفکیٹ موصول ہو جانے کے بعد

حکومت سے پاسپورٹ حاصل کرنا چاہیے، بہتر یہ ہے کہ پاسپورٹ کم از کم ایک سال لیے ہو کیوں کہ امریکہ میں داخلہ اور قیام کی تاریخ عموماً پاسپورٹ کی تاریخ سے ساٹھ دن ختم ہو جاتی ہے۔ امریکی سرزمین پر قدم رکھنے کے بعد فوراً آبکاری کا افسر طالب علم کے پاسپورٹ پر ایک مہر ثبت کرے گا۔ ویزا لے لے گا اور ملک میں داخلے کا اجازت نامہ دے گا اس اجازت نامہ میں وہ تاریخ درج ہو گی جب تک قیام امریکہ کی اجازت دی گئی ہے، یہ اجازت نامہ بے حد اہم ہے اور پاسپورٹ کے ہمراہ رہنا چاہیے۔

"یچا سیم" کے ملک میں داخلہ ایک خاص پیچیدہ سوال ہے، عام جہازی کمپنیاں اور ہوائی جہازوں کی کمپنیاں امریکہ پہونچنے سے کچھ دیر پہلے اپنے تمام مسافروں کو ایک چھپا ہوا کتابچہ تقسیم کر دیتی ہیں، جس میں تمام ضروری ضوابط کا ذکر ہوتا ہے، غیر ملکی طالب علم کے لیے یہ بھی ممکن ہے کہ پہلے سے نیویارک کی کمیٹی موسومہ "غیر ملکی طلبہ کے ساتھ مراسم اخلاص" کو خط لکھ دے کمیٹی کا نمائندہ اسے بندرگاہ یا ہوائی اڈے پر ملے گا اور مناسب رہنمائی کرے گا۔

سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ طالب علم کے پاس تمام ضروری کاغذات مناسب حالت میں موجود ہوں، جو افسر نوواردوں کی پڑتال پر مامور ہیں ان کا صرف یہی فرض نہیں کہ ریاستہائے متحدہ کے لوگوں کے بچاؤ کا خیال رکھیں بلکہ ان کے ذمہ یہ فرض بھی ہے کہ نوواردوں کی سہولت کو بھی پیش نظر رکھیں، اس لیے جس معاملہ میں شک محسوس ہو اس کے متعلق سوال پوچھنے میں جھجک محسوس نہ کرنی چاہیے۔ تقریباً ہر بندرگاہ، ہوائی اڈے اور بس کے بڑے اسٹیشن پر "انجمن امداد مسافرین" کے نمائندے موجود رہتے ہیں، جہاں کوئی دقت محسوس ہو انکی مدد حاصل کرنی چاہیے۔

نووارد کو سب سے پہلے صحت عامہ کے افسروں سے واسطہ پڑے گا، وہ اس کی صحت کی رپورٹ اور اس کے سینے کے ایکس رے فوٹو کو دیکھیں گے، اگر کسی وجہ سے اس شخص کی صحت کے متعلق کوئی شک پیدا ہو گیا تو اسے فوراً ریاستہائے متحدہ کے سرکاری شفاخانہ میں معائنہ

اور علاج کے لیے بھیج دیا جائے گا، اگر صحت عامہ کے افسروں نے اسے ٹھیک ٹھاک سمجھا تو اب وہ آبادکاری کے افسروں کے سامنے حاضر ہوگا، اگرچہ امریکی قونصل خانے ویزا جاری کرتے وقت تمام ضروری باتوں کے متعلق اطمینان کر لیتے ہیں پھر بھی امریکہ میں داخلہ کی اجازت دینے کی آخری ذمہ داری دفتر آبادکاری پر ہے جو امریکہ کے محکمہ عدل کے ماتحت ہے۔ طالب علم کے پاس نہ صرف پاسپورٹ اور ویزا ہونا چاہیے بلکہ کالج یا یونیورسٹی میں قبولیت کی تحریری شہادت اخراجات کی کفالت کا ثبوت اور واپسی کے تسلی بخش انتظامات کا بھی ثبوت موجود ہونا چاہیے۔ اگر کسی وجہ سے ان کاغذات میں کوئی خامی ہے تو طالب علم کی راہ میں رکاوٹ پیدا ہو جائے گی۔ بعض غیر معمولی حالتوں میں یہ رکاوٹ دنوں یا مہینوں کی طوالت پکڑ سکتی ہے، ایسی صورت میں اپنے کالج یا یونیورسٹی کو فوراً اطلاع دینی چاہیے، امریکہ میں داخلہ پر طالب علم کو آٹھ ڈالر غیر ملکی ٹیکس بھی ادا کرنا ہوگا، جہازی کمپنیاں عموماً یہ رقم کرایہ کے ساتھ ہی وصول کر لیتی ہیں، لیکن ہوائی کمپنیاں ایسا نہیں کرتیں، جب یہ مرحلے طے ہو لیں گے تو آبادکاری کا افسر تاریخ داخلہ کی مہر پاسپورٹ پر ثبت کر دے گا۔

اب دفتر محاصل کی طرف سے پڑتال شروع ہوگی، اس دفتر کی طرف سے ایک مطبوعہ اعلان نامہ طالب علم کے حوالے کیا جائے گا جس میں اسباب کی نوعیت پوچھی گئی ہوگی۔ اگر طالب علم کے پاس ذاتی ضرورت کی چیزوں کے سوا اور کچھ نہیں تو وہ اس پر لکھ دے گا "ذاتی استعمال کی اشیا"، اس اعلان کے بعد غالباً کوئی لمبی چوڑی باز پرس نہیں ہوگی۔ لیکن اگر طالب علم کے پاس کوئی ایسی نئی چیزیں موجود ہیں جو بیچی جا سکتی ہیں تو ان کا اعلان کرنا چاہیے اور محصول ادا کرنا چاہیے، خوردبینوں طبی آلوں اور ایسے سائنسی سامان کے لیے جو ریاستہائے متحدہ سے باہر بنا ہو محصول کی شرح غیر معمولی طور پر بھاری ہے، اعلان نامہ کو ہاتھ میں پکڑے ہوئے طالب علم اپنے اسباب کے پاس کھڑا رہے گا تا آنکہ محاصل کا افسر اس کے ٹرنک کھلوا کر اسباب کو الٹ پلٹ کر دیکھ لے اور اسباب کے ہر نگ پر ایک مہر ثبت کر دے۔ اب اسے اجازت ہے کہ اپنا اسباب اٹھائے اور ریاستہائے متحدہ میں

جہاں چاہے چلا جائے۔

امریکہ کو روانگی سے قبل طالب علم اپنا روپیہ "مسافروں کے چیک" میں تبدیل کرائے گا لیکن کوئی پچاس ڈالر نقد حاصل کر لینے چاہئیں تاکہ امریکہ میں داخلہ کے بعد فوری ضرورتوں کے کام آئیں بعض اوقات آباد کاری کے افسر یہ رقم نقد صورت میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ تاہم اپنے ملک سے کالج تک کا ٹکٹ، چلنے سے پہلے خرید لیا جائے تو بہتر ہے، اس سے ایک تو زرِ مبادلہ کی کفایت ہو جائے گی، دوسرے اس ٹیکس کی بچت ہو جائے گی جو امریکہ میں بکنے والے ہر ٹکٹ پر لگتا ہے اگر کچھ چھوٹے امریکی سکے بھی پاس ہوں تو اچھا ہے، امریکہ میں قلیوں کی اجرت فی نگ پندرہ سے پچیس سینٹ (کوئی سوا روپے سے پونے دو روپے) ہے ٹیکسی ڈرائیوروں، ہوٹل کے ملازموں اور اس قسم کے دوسرے خدمت گاروں کو معمولی انعام دینے کا بھی رواج ہے اور یہ انعام عموماً دس سے پندرہ سینٹ تک ہے۔

امریکہ میں قیمتوں کی عام سطح اتنی اونچی ہے کہ غیر ملکی طالب علم کو اول اول یہ دیکھ کر حیرت ہوگی کہ ڈالر کے عوض میں کتنی تھوڑی چیز خریدی جاسکتی ہے، جب تک وہ ڈالر کو اپنے قومی سکے میں منتقل کر کے قیمتوں کو دیکھے گا، اس وقت تک اس کی یہ حیرت بدستور باقی رہے گی مثال کے طور پر چند عام ضروریات زندگی کی قیمتیں درج ذیل ہیں۔

زیر زمین ریل سے ایک جگہ سے دوسری جگہ کا کرایہ	دس سینٹ
〃 〃 〃 〃 〃 بس کے ذریعہ	پندرہ سینٹ
قہوہ کی ایک پیالی	دس سینٹ
ایک وقت کا معقول کھانا	ایک ڈالر
ہوٹل کا کمرہ فی شب	اڑھائی ڈالر
بال کٹائی (مردوں کے لیے)	ایک ڈالر سے
〃 (عورتوں کے لیے)	سوا ڈالر سے

قمیص ایک عدد (مردانہ) . . . . تین ڈالر

نائلن جرابوں کا ایک جوڑا . . . . ۸۰ سینٹ سے دو ڈالر

کالج کی ایک کتاب . . . . تین سے پانچ ڈالر

ٹیکنیکل کتابیں زیادہ مہنگی ہیں۔

نوٹ :- پاکستانی سکے میں ایک ڈالر کی قیمت اس وقت کوئی پانچ روپے ہے۔ ایک ڈالر میں ۱۰۰ سینٹ ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے ایک سینٹ پانچ پیسے کے برابر ہوا۔

ریاستہائے متحدہ میں سفر

بندرگاہ یا ہوائی اڈہ سے ریلوے اسٹیشن یا بس کے اڈے تک جانے کے لیے ٹیکسی لے لینی چاہیے، بالخصوص جب کچھ سامان بھی ساتھ ہو۔ ٹیکسی کے میٹر یا ٹیکسی کے اندر آویزاں نقشہ کے ذریعہ کرائے کا علم ہو سکتا ہے۔ سامان کے لیے تھوڑی سی رقم زاید لی جاتی ہے کالج میں پہونچ جانے کے بعد کہیں آنے جانے کی ضرورت ہو تو واپسی ٹکٹ خریدنے میں بچت رہتی ہے، واپسی ٹکٹ عموماً تیس دن سے زائد عرصہ کے لیے کارآمد ہوتے ہیں۔ ریاستہائے متحدہ میں تمام ایسے ٹکٹوں پر جن کی قیمت ۷۵ سینٹ سے زیادہ ہو ٹیکس عائد ہوتا ہے۔ سفر کے لیے پہلے سے جگہ ریزرو کرالینی چاہیے۔ اگر کسی وقت کوئی فوری مشکل پیش آجائے تو "انجمن امداد مسافراں" سے رجوع کرنا چاہیے۔ اگر ہوائی جہاز سے سفر کرنا ضروری نظر آئے تو سپیشل ہوائی کوچ کے کرائے خاصے کم خرچ ہیں۔ ہوائی سفر کی صورت میں بھاری اسباب ریلوے ایکسپریس کی معرفت بھجوا دینا چاہیے۔

ریلوے میں سفر کرنے کے لیے صرف دو درجے ہیں۔ دوسرے درجے میں عام امریکی اور غیر ملکی طلبہ سفر کرتے ہیں اس میں جگہ ریزرو نہیں کرائی جا سکتی۔ اب بعض شہروں کے درمیان کلی طور پر دوسرے درجے پر مشتمل گاڑیاں چلنے لگی ہیں جن میں جگہ ریزرو ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ صورت بہت شاذ ہے۔ دوسرے درجے کا کرایہ کم ہے لیکن اس میں رات کو سونے کا

انتظام نہیں۔ رات بھر اپنی جگہ بیٹھے رہنا پڑتا ہے، اگرچہ سیٹیں ایسی ہوتی ہیں کہ آرام کرسی کی طرح ٹیک لگائی جا سکے، ڈبے کی آخری دیوار پر نوٹس لگا ہوگا جس سے معلوم ہو سکے کہ آیا سگریٹ پینے کی اجازت ہے یا نہیں۔

اول درجے کے ڈبوں کا کرایہ دوسرے درجے سے ڈیوڑھا ہے، ان میں رات کو سونے کا بستر مہیا کیا گیا ہوتا ہے، اول درجے کو امریکی عرف عام میں "پل مین" کہا جاتا ہے۔ پل میں میں بھی زیریں بستر کا کرایہ بالائی بستر سے قدرے زیادہ ہوتا ہے۔ پل مین ڈبوں کے ملازم جو بستر بچھاتے ہیں عموماً انعام کی توقع رکھتے ہیں جس کی عام شرح نصف ڈالر فی شب ہے، شکاگو کے مغرب میں بعض لائنوں پر خاص سیاحوں کے لیے سونے کی گاڑیاں بھی چلتی ہیں جن کے کرائے "پل مین" سے بقدر ایک تہائی کم ہیں، "پل مین" اور دوسری گاڑیوں میں جگہ ہمیشہ پیشگی ریزرو کرانی چاہیے تمام گاڑیوں کے ساتھ دارالطعام موجود ہوتا ہے جہاں سے ہر قسم کے مسافر کھانا خرید سکتے ہیں بس سے سفر کرنے میں ریل کی نسبت وقت زیادہ لگتا ہے۔ لیکن بس کا کرایہ نسبتاً کم ہے۔ نیز بس میں سفر کرنے سے ملک کو زیادہ اچھی طرح سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اگر وقت اجازت دے تو راستے کے مقامات کی سیر کے لیے مختلف جگہوں پر ٹھہرا جا سکتا ہے۔ بسیں آسانی سے ٹھہرنے کی اجازت دیتی ہیں، یہ رات دن چلتی رہتی ہیں، بس کا ٹکٹ اس کی روانگی سے کم از کم آدھ گھنٹہ پہلے خرید لینا چاہیے۔

اگر بھاری سامان ساتھ ہو تو اسے ہوائی اڈہ یا بندرگاہ سے ریلوے اسٹیشن تک پہونچانے کا کام شرکت حمل و نقل کے سپرد کر دینا چاہیے جو فی نگ دو ڈالر وصول کرتے ہیں۔ بار بار قلیوں سے اٹھوانے کی نسبت اسباب کو اسٹیشن تک پہونچانے کا بعض اوقات یہ زیادہ باکفایت طریق ثابت ہوتا ہے۔ ریلوے اور بس دونوں ایک ٹکٹ پر ۱۵۰ پونڈ تک سامان مفت لے جاتی ہیں۔ ریلوے کے ملازمین اس اسباب کو بک کرانے کا طریق بتا دیں گے (امریکہ میں بک کرانا نہیں بلکہ چیک کرانا کہا جاتا ہے) سو ڈالر تک کی مالیت کا اسباب از خود بیمہ شدہ سمجھا جاتا ہے۔ اس سے زیادہ مالیت کے اسباب کے لیے معمولی قیمت پر بیمہ کرایا جا سکتا ہے۔ بک کیے ہوئے (چیک شدہ

اسباب کی رسید سنبھال کر رکھنی چاہیے کیوں کہ اسے دکھا کر ہی منزل مقصود پر اسباب لیا جا سکے گا اگر اسباب منزل پر پہلے پہنچ جائے (جب اسباب کا مالک راستہ میں رک گیا ہو) تو یہ حفاظت کے ساتھ جمع رہے گا اور اس حفاظت کے لیے معمولی سی فیس فی یوم وصول کی جائے گی۔ شرکتِ حمل ونقل اسباب کو اسٹیشن سے جائے اقامت تک پہونچا سکتی ہے، جب تک نئی جگہ پر مستقل رہائش کا بندوبست نہ ہو جائے، اس وقت تک سامان کو ریلوے اسٹیشن یا بس کمپنی والوں کی حفاظت ہی میں رہنے دینا چاہیے کیوں کہ یہ صورت زیادہ کم خرچ ہے۔ تقریباً سبھی ریلوے اسٹیشنوں اور بس کے اڈوں پر چھوٹے موٹے اسباب کو حفاظت سے رکھنے کے لیے آہنی الماریاں موجود ہیں۔ ان الماریوں میں کچھ خانے چھوٹے ہوتے ہیں اور کچھ بڑے۔ ایک چھوٹے خانے کو صرف دس سینٹ کے عوض چوبیس گھنٹے تک استعمال کیا جا سکتا ہے۔ بڑے خانے کا کرایہ پچیس سینٹ فی چوبیس گھنٹہ ہے۔ قفل کے سوراخ میں دس سینٹ یا پچیس سینٹ کا سکہ ڈالیے اور چابی گھما کر قفل کھول لیجیے۔ اب اسباب اندر رکھ کر قفل لگا دیجیے، اور چابی جیب میں ڈال لیجیے۔ چوبیس گھنٹے جہاں جی چاہے گھومیے اور واپس لوٹ کر اسباب نکال لیجیے۔

عارضی رہائش کے لیے بہترین صورت یہ ہے کہ وائی۔ ایم۔ سی۔ اے یا وائی۔ ڈبلیو۔ سی۔ اے میں چلے جائیں۔ صاف ستھری رہائش اور واجبی نرخوں کے لحاظ سے دوسری جگہیں عموماً ان کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ اگر ان کے پاس جگہ موجود نہ ہو گی تو وہ کسی دوسری جگہ انتظام کرا دیں گے۔ اس سلسلے میں "انجمن امداد مسافراں" بھی مدد دے سکتی ہے۔

امریکی مناظر سے لطف اندوزی

اگر امریکہ میں داخلہ کے مقام سے کالج اور یونیورسٹی بہت فاصلہ پر واقع ہے تو راستہ میں رک کر اہم مقامات اور قدرتی مناظر کو دیکھنے کا یہ ایک بہت اچھا موقع ہے۔ مثلاً اگر ایک پاکستانی طالب علم نیویارک میں اترا ہے اور اسے کیلی فورنیا کی کسی یونیورسٹی میں جانا ہے تو اسے اس تین ہزار میل کے سفر میں دل چسپی کے مقامات میں سے یونہی نہ گزر جانا چاہیے۔ کرایہ کا ایک پیسہ

زائد دیے بغیر وہ راستہ میں جہاں چاہے رک سکتا ہے۔ بھاری سامان سیدھا چیک کرا دیا جائے اور خود بعد میں جگہ جگہ ٹھہرتے ہوئے پہنچا جائے۔

راستہ میں مناظر دیکھنے کے علاوہ اہم لوگوں سے ملاقاتیں بھی کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً جہاں رکے اس شہر یا بستی کے مشہور صنعت کاروں تعلیمی یا مذہبی رہنماؤں اور دوسرے اہم لوگوں سے بھی تبادلہ خیالات کر لیا۔ ان لوگوں کے پتے انجمن امداد مسافراں کے نمائندے یا ٹیلیفون کی کتاب سے معلوم کیے جا سکتے ہیں۔ ریاستہائے متحدہ میں سرکاری افسروں کی ملاقات کے لیے کوئی رسمی آداب مقرر نہیں اس لیے ان سے ملنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ ان لوگوں کی مدد سے راستہ میں واقع کارخانوں تعلیمی اداروں اور قدرتی مناظر کی سیاحت میں بڑی آسانی ہو سکتی ہے اور امریکہ میں کئی دوستیاں پیدا کی جا سکتی ہیں۔ پٹرول کے کسی پمپ (گیسولین سٹیشن) سے ملک کے ہر حصے کے عمدہ نقشے مل سکتے ہیں۔

بیماری اور حادثے کا بیمہ

ریاستہائے متحدہ میں طبی علاج بڑا مہنگا ہے۔ اگر کوئی غریب غیر ملکی طالب علم اتفاقیہ طور پر سخت بیمار پڑ جائے یا کسی حادثہ میں زخمی ہو جائے تو یہ مالی بوجھ اس کی کمر توڑ دے اس اضطراری اور اتفاقیہ ضرورت کا بہترین حل یہ ہے کہ امریکہ پہونچتے ہی صحت اور حادثہ کا بیمہ کرا لیا جائے۔ انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ ایسے طلبا کے لیے جو اس کی زیر نگران ہوں ۲۴ ڈالر سالانہ کے عوض صحت اور بیمہ کی پالیسی حاصل کر دیتی ہے، دوسرے غیر ملکی طلبہ کو یہ پالیسی معمولی سی زائد رقم پر مل سکتی ہے، اس پالیسی کے ماتحت بیماری یا حادثہ کی صورت میں طالب علم کو پہلے دس ڈالر خود ادا کرنے پڑتے ہیں، اس کے بعد اگلے اخراجات میں سے ۵۰۰ ڈالر کی انتہا تک کمپنی ادا کرتی ہے۔ بیماری یا حادثے سے موت رونما ہو جانے کی صورت میں پسماندگان کو ایک ہزار ڈالر کی رقم مل سکتی ہے۔

صحت اور حادثہ کا بیمہ جس حد تک ناگزیر ہے اس کی توضیح ایک مثال سے ہو جائے گی

۱۹۵۲ء کے سرما میں راقم جب استادوں کی ایک جماعت کے ساتھ امریکہ گیا تو دفتر تعلیم نے سب کو مشورہ دیا کہ تیرہ ڈالر خرچ کر کے چھ ماہ کے لیے صحت اور حادثہ کی پالیسی خرید لو سب نے بخوشی ایسا کر لیا۔ کراچی سے گئے ہوئے ایک صاحب مولویانہ منطق چھانٹنے لگے اور بیمہ کے معاملے میں پس و پیش کیا۔ بہرحال یہ معاملہ ہر شخص کی آزادانہ رائے پر موقوف تھا، چند دن بعد دوستوں نے انہیں دل سوزی سے سمجھایا کہ یہ پردیس کا معاملہ ہے، اگر خدانخواستہ کوئی تکلیف ہو گئی تو نہ معلوم کیا مشکل پیش آئے، آخر یہ بات ان کی سمجھ میں آ گئی اور پالیسی خرید لی گئی، خدا کی کرنی دیکھو کہ پالیسی کے ختم ہونے میں صرف چند دن باقی تھے کہ انہیں اپنڈکس کے درد کا سخت دورا پڑا جس کے لیے اپریشن کرانا پڑا۔ کوئی مہینہ بھر ہسپتال میں کٹا اور تین چار سو ڈالر سے زیادہ بل بنا۔ یہ صاحب صرف دس ڈالر ادا کر کے بچ گئے۔ اگر بیمہ نہ کرایا ہوتا تو خوب شامت آتی۔

غیر ملکی ضوابط

ریاستہائے متحدہ امریکہ کی حکومت نے غیر ملکی طلبہ کے لیے بعض ضوابط وضع کر رکھے ہیں جنکی پابندی لازمی ہے، ان کے متعلق تفصیلی معلومات اپنے کالج یا یونیورسٹی کے مشیر غیر ملکی طلبہ سے حاصل کرنی چاہئیں۔ یہاں ان کے متعلق چند ضروری باتیں درج کی جاتی ہیں۔

ہر تین ماہ کے بعد طالب علم کو اپنے رہائشی پتہ کی اطلاع محکمہ عدل کے محکمہ اندراج واقع واشنگٹن ڈی سی کو دینی چاہیے، جب کبھی رہائشی تبدیلی کی جائے تو نئے پتہ کی اطلاع پانچ دن کے اندر اندر دے دینی چاہیے، یہ اطلاع ایک مطبوعہ کارڈ پر درج کر کے بھیجنی چاہیے۔ یہ کارڈ ریاستہائے متحدہ کے ہر ڈاک خانہ سے مل سکتے ہیں۔

جن طلبہ کو ہر (F) نشان کا طالب علمی آویزا ملا ہو انہیں یہ اجازت نہیں کہ تعلیمی عرصہ میں اجرت کے عوض یا رہائش اور خوراک کے عوض کسی قسم کا کام کریں۔ تاوقتیکہ ان کی مالی حالت نا تسلی بخش نہ ہو۔ اگر کوئی طالب علم مالی طور پر مجبور ہو اور کام کرنا چاہے تو اسے مشیر غیر ملکی طلبہ کی وساطت سے ضلع کے حاکم آبادکاری کو درخواست دینی چاہیے۔ مشیر کی سفارش پر یہ اجازت عموماً مل جاتی ہے۔

جن طلبہ کا ویزا (J) نشان رکھتا ہو یعنی تبادلہ اشخاص کے پروگرام کے تحت جاری کیا گیا ہو ان کو صرف اسی صورت میں کام کرنے کی اجازت مل سکتی ہے اگر ان کے مخصوص تعلیمی پروگرام میں کام کرنے کی گنجائش موجود ہو۔ ایسے طلبہ کو بھی مشیر غیر ملکی طلبہ سے مشورہ کرنا چاہیے۔

تعطیلات گرما کے کام کی نوعیت قدرے مختلف ہے۔ اس ضمن میں اب تک طریق کار یہ رہا ہے کہ دفتر آباد کاری غیر ملکی طلبہ کے مشیر کو اس امر کی کھلی اجازت دے دیتا ہے کہ غیر ملکی طلبہ کو کام تلاش کر دیں۔ لیکن اس اجازت کا اطلاق صرف ان طلبہ پر ہوتا ہے جن کا ویزا F یا (J) نشان رکھتا ہے۔ اور جنہیں اگلی پت جھڑ کے موسم تک مزید پڑھائی کے لیے ٹھہرنا ہو۔

اگر کوئی طالب علم سال بھر میں ۶۰۰ ڈالر سے زیادہ رقم بطور اجرت حاصل کرے تو اسے وفاقی حکومت کے انکم ٹیکس کا ایک مطبوعہ فارم پُر کرنا ہوگا، یہ فارم ہر ڈاک خانہ سے مل سکتا ہے۔ اس پر ہدایات درج ہوں گی جن کی مدد سے اندراجات مکمل کیے جا سکیں گے۔ اگر کسی طالب علم نے تدریسی کام میں مدد دے کر اپنے اخراجات کا کچھ حصہ کمایا ہو تو اسے بھی چاہیے کہ امریکہ چھوڑنے سے کافی عرصہ پہلے وفاقی محکمہ انکم ٹیکس سے لکھا پڑھی کر کے بے باقی کی سند حاصل کرلے ورنہ عین روانگی کے وقت اسے مشکل کا سامنا ہوگا۔ طالب علم کو جو آمدنی وظیفے یا فیلوشپ سے ہوئی ہو اس پر کوئی ٹیکس عائد نہیں ہوتا۔

کالج کی تبدیلی

جن طلبہ کے پاس F یا (J) ویزا ہو وہ اپنے ضلع کے حاکم آباد کاری کی اجازت سے ایک کالج یا یونیورسٹی سے دوسرے منظور شدہ کالج یا یونیورسٹی میں داخلہ لے سکتے ہیں، ایسی تبدیلی کے لیے کم از کم تیس دن پہلے درخواست بھیجنی چاہیے، اس درخواست کے ساتھ دونوں متعلقہ یونیورسٹیوں کی تحریری رضامندی بھی ہونی چاہیے جو ظاہر کرے کہ انہیں طالب علم کی نقل مکانی منظور ہے۔

جو طلبہ (J) ویزا رکھتے ہوں وہ ایک تعلیمی ادارہ چھوڑ کر دوسرے میں صرف اسی صورت میں جا سکتے ہیں اگر ان کے پہلے سے طے شدہ پروگرام میں اس امر کی گنجائش موجود ہو، اس صورت میں بھی

دونوں اداروں کی باہمی رضامندی ضروری ہے۔
جن طلبہ کو معینہ میعاد سے زیادہ عرصہ ٹھہرنے کی ضرورت پڑ جائے انہیں چاہیے کہ توسیع میعاد کے لیے اس ضلع کے حاکم آبادکاری کو درخواست دیں جس میں ان کا کالج یا یونی ورسٹی واقع ہے، یہ درخواست اصلی میعاد کے خاتمہ سے اندازاً تیس دن پہلے بھیجنی چاہیے، اس تحریری درخواست کے ہمراہ طالب علم کا پاسپورٹ بھی ہونا چاہیے اور یونی ورسٹی یا کالج کی طرف سے ایک سرکاری چٹھی بھی جس میں یہ وضاحت ہو کہ طالب علم کا نام ابھی اس کے طلبہ کے رجسٹر میں درج ہے اور اسے اس قدر توسیع قیام کی ضرورت ہے جس کے لیے درخواست دی گئی ہے۔
(۲) نشان کا ویزا رکھنے والے طلبہ کو توسیع قیام حاصل کرنے کے لیے اس ادارہ کی تصدیق حاصل کرنا ہوگی جو ان کے امریکہ بھیجنے کا ذمہ دار ہے، درخواست اور دوسرے کاغذات بذریعہ رجسٹری بھیجنے چاہئیں تاکہ گم ہو جانے کا امکان نہ رہے۔ ضلعی حاکم آبادکاری کے فیصلہ کے خلاف مرکزی دفتر آبادکاری واقع واشنگٹن ڈی سی میں اپیل کی جا سکتی ہے۔ پاسپورٹ کی میعاد بہرصورت توسیع شدہ میعاد قیام سے ساٹھ دن زیادہ ہونی چاہیے۔ اگر ایسا نہیں تو طالب علم کو فوراً چاہیے کہ اپنے ملک کے سفارت خانہ سے پاسپورٹ میں ضروری توسیع کرالے۔
اپنی روانگی سے زیادہ سے زیادہ دس دن پہلے طالب علم کو چاہیے کہ قریب ترین شہر میں واقع امریکی دفتر محاصل کو اپنا پاسپورٹ اور واپسی ٹکٹ دکھا کر محکمہ خزانہ سے روانگی کا اجازت نامہ حاصل کرلے، اگر اس نے دوران قیام میں کچھ کمایا ہے تو اسے اپنی کل آمدنی اور ادا کردہ انکم ٹیکس کی اطلاع بھی کرنی ہوگی۔ اسے مشیر غیر ملکی طلبہ اور ضلعی دفتر آبادکاری کو بھی اپنی روانگی کی تاریخ کی اطلاع دینی چاہیے اور اس جہاز کا نام بھی بتانا چاہیے جس میں وہ سفر کرے گا۔

خاص سہولتیں

امریکی کالجوں اور یونی ورسٹیوں نے غیر ملکی طلبہ میں اس قدر دلچسپی لینا شروع کردی ہے، کہ اب تقریباً ہر بڑے ادارے میں ایک شخص غیر ملکی طلبہ کی خصوصی دیکھ بھال کے لیے مقرر ہے

اسے مشیر غیر ملکی طلبہ کا نام دیا جاتا ہے، یہ عموماً ایک پروفیسر یا انتظامی افسر ہوتا ہے جو غیر ملکی طلبہ کے مسائل کی نگہداشت کے ساتھ ساتھ تدریسی یا انتظامی کام بھی کرتا ہے لیکن بعض درس گاہوں میں غیر ملکی طلبہ کی تعداد اتنی ہے کہ "مشیر" ان کی دیکھ بھال کے سوا اور کچھ کام نہیں کرتا، ہر غیر ملکی طالب علم کو چاہیے کہ داخل ہونے کے ساتھ ہی مشیر کے ساتھ مراسم پیدا کرے، مشیر اس کی کئی طرح مدد کر سکتا ہے، وہ رہائش کا انتظام کرنے میں ہاتھ بٹا سکتا ہے، صحت کے معاملہ میں رہنمائی کر سکتا ہے، انتخاب مضامین میں کارآمد مشورہ دے سکتا ہے، اس کے علاوہ کئی کالجوں میں بین الاقوامی مرکز قائم ہیں ان مرکزوں کا مقصد یہ ہے کہ دوسرے ملکوں سے آنے والے طلبہ کو امریکی ماحول کے سمجھنے اور اس کے ساتھ نباہ کرنے میں مدد دیں، ان مرکزوں میں امریکی اور غیر ملکی طلبہ مل جل کر طرح طرح مجلسی سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہیں، اس کے علاوہ چودہ درس گاہوں میں "بین الاقوام" کے نام سے رہائشی عمارتیں بھی موجود ہیں، جہاں غیر ملکی طلبہ اقامت رکھتے ہیں، یہاں مختلف مجلسی سرگرمیوں کا اہتمام بھی ہوتا رہتا ہے۔

رہائش

رہائشی مکانات کی کمی کے سبب رہائش کا سوال دنیا میں ہر جگہ ٹیڑھا ہے۔ ہر کالج اور یونیورسٹی میں طلبہ کی رہائش کے لیے ڈارمیٹریاں (ہوسٹل) بنی ہوئی ہیں جن میں کمرہ مل جاتا ہے، جہاں یہ نہ ہو وہاں تعلیمی ادارہ ایسی جگہوں کی فہرست تیار رکھتا ہے جہاں کمرہ کرایہ پر مل سکے، اس کے باوجود طالب علم کے لیے زیادہ بہتر یہ ہے کہ اپنے پہنچنے سے پہلے کالج کو رہائش کا بندوبست کر رکھنے کو لکھ دے۔ اگر کالج کی ڈارمیٹری میں جگہ نہ مل سکے تو فوراً رجسٹرار سے رجوع کرنا چاہیے، یا مشیر غیر ملکی طلبہ سے ان لوگوں کی مدد سے بیرونی آبادی میں واجب کرایہ پر پسندیدہ نواح میں کمرہ مل سکتا ہے، اگر کسی امریکی طالب علم کے ساتھ مل کر کمرہ حاصل کر لیا جائے تو بہتر ہے اس سے ایک تو انگریزی بول چال سیکھنے میں مدد ملے گی، دوسرے کرایہ میں رعایت ہو جائے گی۔

کالج کے لوگوں سے تعارف

داخل ہو جانے کے بعد طالب علم کو پہلی فرصت میں اپنے استادوں سے واقفیت بڑھانی

چاہیے، داخلہ کے دنوں میں یہ لوگ مصروف ہوتے ہیں لیکن اس کے بعد ان کے ساتھ آسانی سے ملاقات کی جا سکتی ہے، ہر شعبہ کے صدر کے ساتھ تعارف پیدا کرنا چاہیے، امریکی پروفیسر تعلی کی بُو سے بالکل خالی اور میل ملاپ کے شائق ہوتے ہیں۔ طالب علم انہیں آسانی سے قہوہ کی ایک پیالی یا کھانے کی دعوت دے سکتا ہے وہ خود بھی اسے کھانے یا چائے پر بلائیں گے، غرض وہ ایسی بے تکلفی اور گرمجوشی سے اس کے ساتھ مراسم بڑھانے کے خواہش مند نظر آئیں گے کہ اسے اس ضمن میں کسی تردد کی ضرورت پیش نہ آئے گی، امریکی کالجوں میں عام دستور ہے کہ پروفیسر نصاب کے خاتمہ سے پہلے ساری جماعت کو ایک بار قہوہ کی پیالی یا کھانے پر بلائے گا، غیر ملکی طلبہ اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر زیادہ گہرے مراسم پیدا کر سکتے ہیں، ہر کالج میں چند استاد ایسے ہوتے ہیں جو کسی خاص قوم یا تہذیب کے حالات میں خصوصی دلچسپی رکھتے ہیں چھوٹے کالجوں میں یہ چیز زیادہ نمایاں ہے، طالب علم ان لوگوں سے میل ملاپ بڑھا کر نہ صرف اپنی انگریزی بول چال بہتر بنا سکتا ہے بلکہ امریکی زندگی کے متعلق بہتر معلومات اخذ کر سکتا ہے اور خود اپنی تہذیب کے متعلق بہتر واقفیت نشر کر سکتا ہے

امریکی کالجوں میں ایک عام دستور یہ بھی ہے کہ نئے داخلہ کے بعد ایک ہفتہ عام تعارف کی نذر کیا جاتا ہے تاکہ نووارد طلبہ کالج کی مختلف عمارتوں سے واقف ہو جائیں اور مختلف شعبوں کے طریق کار سے آگاہ ہو کر اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ یہ تعارف انڈر گریجوایٹ طلبہ کے لیے ہوتا ہے تاہم غیر ملکی طلبہ اعلیٰ جماعتوں کے طلبہ ہونے کے باوجود اس پروگرام سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اسکی تاریخوں کی اطلاع کالج کے رسالے میں یا نوٹس بورڈ پر درج ہوتی ہے، کتب خانہ کے طریق کار سے آگاہی خصوصیت کے ساتھ کارآمد ثابت ہوتی ہے، اس سے پتہ چل جاتا ہے کہ عام اور مخصوص کتابوں کے جاری کرانے کا کیا طریقہ ہے۔ لغاتیں اور حوالوں کی کتابیں کہاں ہیں اور کس طرح دیکھنی چاہئیں وغیرہ وغیرہ۔

ریاست ہائے متحدہ کا رقبہ اتنا وسیع ہے کہ اس کے مختلف حصوں کی آب و ہوا مختلف ہے شمالی حصّوں میں سردی شدید ہوتی ہے۔ تاہم گرمی کے موسم میں ہر جگہ ہلکے پھلکے کپڑے کام دے سکتے ہیں

سردیوں میں تمام مکان گرم رکھے جاتے ہیں، اس لیے کمرے کے اندر بوجھل لباس کی ضرورت کبھی پیش نہیں آتی۔ کالج یا یونی ورسٹی میں کسی رسمی لباس کی پابندی ضروری نہیں۔ باقی باتوں کی طرح امریکی لوگ لباس کے معاملہ میں بھی ظاہرداری کے قائل نہیں۔ گرمیوں میں طلبہ بلا تکلف ایک بنیان اور پتلون پہنے کرہ جماعت میں چلے جاتے ہیں۔ البتہ سردیوں میں موسم کی وجہ سے گرم کپڑے ضروری ہیں اس مطلب کے لیے ایک گہرے رنگ کا کوٹ کفایت کر سکتا ہے۔ رسمی موقعوں پر ایک طالب علم اپنا قومی لباس پہنے تو زیادہ حسب حال رہتا ہے اور پسند کیا جاتا ہے۔ امریکی ہوٹلوں میں بستر ہر جگہ مہیا کیے جاتے ہیں۔ پرائیویٹ مکان میں کمرہ کرایہ پر ہو تو بھی بستر ساتھ دیا جاتا ہے۔ کالج کی ڈامیٹری میں بعض اوقات سرہانہ۔ بستر کی چادریں اور کمبل خود مہیا کرنا ہوتے ہیں، یہ چیزیں آسانی سے امریکہ میں خریدی جا سکتی ہیں، لہٰذا بستر ساتھ لے جانے کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں۔

امریکی زندگی میں شمولیت

امریکی زندگی میں پوری طرح حصہ لینا ایک غیر ملکی طالب علم کے لیے کم از کم شروع شروع میں ذرا مشکل ہے۔ اس کے راستے میں کئی رکاوٹیں پیدا ہوں گی۔ ان میں سب سے پہلی رکاوٹ زبان کی ہے طالب علم انگریزی ہر چند روانی سے پڑھ اور لکھ سکتا ہو اور شاید بول بھی سکتا ہو، لیکن اسے امریکی اب و لہجہ سمجھنے اور اپنا لہجہ قابل فہم بنانے میں وقت لگے گا، اس کے علاوہ ثقافتی اختلافات ہیں۔ ہر طالب علم اپنے ساتھ اپنا مخصوص ثقافتی پس منظر لے کر آتا ہے اور بعض مجلسی رسم و رواج کو قدرتی سمجھنے کا عادی ہوتا ہے اور بعض کو ناقابل برداشت۔ یہاں اس کو بعض اوقات معاملہ الٹ نظر آتا ہے۔ نئے ثقافتی ماحول کے ساتھ ذہنی ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے بھی وقت کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ بعض امریکی تنگ نظر نسلی تعصبات کا شکار بھی نظر آئیں گے لیکن ان تمام دشواریوں پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ کالج یا یونی ورسٹی کی غیر نصابی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جائے۔ بعض طلبہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ کالج کی زندگی انہیں عام امریکی زندگی سے الگ تھلگ رکھتی ہے، مثلاً ایک طالب علم کے خیالات یہ ہیں: مجھے سب سے بڑی مشکل یہ درپیش ہے کہ اب تک میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ آیا مجھے سارا وقت کالج کے

آموزش

وقبہ میں پڑھائی ہی کی نذر کرنا چاہیے یا اس سے باہر نکل کر دوسری چیزیں بھی دیکھنی چاہئیں، آپ بے شک کہیں گے کہ سارا وقت یونیورسٹی کے احاطہ میں بند رہنا درست نہیں باہر کی زندگی کا مطالعہ بھی اہم ہے میں اس خیال سے اتفاق رکھتا ہوں لیکن دشواری یہ ہے کہ یونیورسٹی دھڑکتی ہوئی زندگی سے بہت دور ہے۔

لیکن یہ دشواری کوئی حقیقی دشواری نہیں۔ غیر نصابی سرگرمیوں کا مقصد ہی یہ ہے کہ یونیورسٹی کی الگ تھلگ علمی زندگی اور حقیقی زندگی کے درمیان رابطہ پیدا کریں، اس کے علاوہ آج کل امریکی اعلیٰ تعلیم اس بات پر زیادہ سے زیادہ زور دے رہی ہے کہ اعلیٰ علمی مسائل اور امریکی زندگی کو قریب لایا جائے، لہذا جو طالب علم سیاسیات۔ عمرانیات۔ نفسیات۔ تاریخ اور علم و ادب کا مطالعہ کرتا ہے وہ خواہ مخواہ امریکی زندگی کا مطالعہ کرتا ہے۔

غرض ثقافتی اختلاف کے باوجود غیر ملکی طالب علم کو بعض اہم امریکی رسم و رواج کا علم جلد ہو جائے گا، وہ دیکھے گا کہ ہر عمر اور ہر حیثیت کے امریکی ایک دوسرے کو بڑی بے تکلفی اور خوش مذاقی کے ساتھ مخاطب کرتے ہیں۔ پابندی وقت کو ضروری سمجھا جاتا ہے۔ لوگ اجتماعی بہبود کو مقدم سمجھنے کے عادی ہیں، ہر شخص جماعتی زندگی میں اپنے حصہ کا بوجھ اٹھا کر خوشی محسوس کرتا ہے، کسی کے ہاں مدعو ہونے کے بعد اسے تشکریہ کا خط لکھنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ کالج کی پڑھائی کے لیے اخراجات کا کچھ حصہ خود کمانا بڑے فخر کی بات خیال کی جاتی ہے، عورتوں اور مردوں کے تعلقات میں وہ احتیاط نہیں جو بعض دوسرے ملکوں میں ہے، یہ تعلقات بے حد غیر رسمی اور آزادانہ ہیں۔ اس غیر رسمیت اور آزادی کو غلط معنی نہ پہنانے چاہئیں۔ اگر کالج کی ایک نوجوان لڑکی کسی غیر نصابی سرگرمی میں آپ کے ساتھ شمولیت کا اشتیاق ظاہر کرتی ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اسے آپ سے مستقل لگاؤ پیدا ہو گیا ہے۔ امریکی زندگی میں "تاریخ کی تقرری" ایک عام رواج ہے، اس کا مطلب یہ ہے ایک مرد اور عورت (غیر شادی شدہ) اکٹھے گھومنے پھرنے کے لیے فراغت کا کوئی دن مقرر کر لیتے ہیں، امریکی زندگی کے یہ مجلسی آداب ایسے ہیں جو جلد اخذ کیے جا سکتے ہیں ؎

تعلیمی دنیا پر ایک نظر

ضرورت سے زیادہ سامان

ہمارے مدرسوں میں سازو سامان کی کمی کی عام شکایت ہے۔ لیکن مغربی ملکوں میں بعض اوقات معاملہ اس کے برعکس بھی ہوتا ہے۔ ایلکس کاؤنٹی کونسل کے ایک نئے رکن نے جب مقامی مدرسے سازو سامان کے متعلق پوچھا تو اسے بتایا گیا کہ مدرسے میں آدھا سازو سامان موجود ہے کہ کیمبرج کی لیبارٹری کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے، مزید سامان بھیجنے سے پہلے استادوں کو بالکل نہیں پوچھا گیا، نئی برقی بھٹی جو مدرسے کو دی گئی ہے استاد اس کے طریق کار سے بے خبر تھے، چنانچہ ایک استاد نے شبینہ مدرسے میں داخل ہو کر اسے چلانے کا طریقہ سیکھا۔

برطانوی استادوں کے مطالبات

برطانوی استادوں کی طرف سے وزارت تعلیم کو ایک یادداشت بھیجی گئی تھی جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ استادوں کی بیواؤں، یتیم بچوں اور ان کے لواحقین کے لیے پنشنوں کا بندوبست کیا جائے۔ وزارت تعلیم نے نئے بیزانیہ میں ایسی کوئی گنجائش نہیں رکھی، اس پر لندن کے استادوں کی تنظیم نے احتجاج کیا ہے، مزید برآں وزارت تعلیم نے ملازمت کے خاتمہ پر دیے جانے والی رقم میں استادوں کے حصہ میں جو اضافہ کیا ہے اس کے خلاف بھی آواز اٹھائی گئی، اس اضافہ کو تنخواہ میں کمی کے مترادف قرار دیا گیا اور کہا گیا کہ تنخواہیں پہلے ہی ناکافی ہیں، ان میں مزید تخفیف ناقابل برداشت ہے۔

ضرورت سے زیادہ روپیہ

انگلستان میں بچوں کے لیے لازمی ہے کہ مدرسے جائیں، جو بچے مدرسے سے بھاگ جاتے ہیں انہیں بچوں کی مخصوص عدالتوں میں پیش کیا جاتا ہے۔ حال ہی میں ایک ایسے بچے کو مڈل برو کی عدالت میں پیش کیا گیا۔ جج نے پوچھا "میاں صاحبزادے تم مدرسے سے کیوں بھاگ جاتے ہو" اس نے جھٹ جواب دیا۔ "اس لیے کہ مجھے ضرورت سے زیادہ پیسے دے دیے جاتے ہیں، اس لڑکے کی عمر صرف دس سال ہے

کتب خانے میں انگیٹھی

مغربی ملکوں میں کتب خانوں کو بہتر سے بہتر بنانے کی مہم زوروں پر ہے۔ کتب خانے کو بحاظ تعلیمی زندگی کا مرکز خیال کیا جاتا ہے۔ حال ہی میں ایک برطانوی قصبے نے اپنے عوامی کتب خانے کی کافی توسیع کی ہے، اس کتب خانے میں جو نئی سہولتیں بہم پہونچائی گئی ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ ایک کونے میں آگ کی ایک چمنی تیار کی گئی ہے، اس گوشے میں بچے شام کے وقت آگ کے گرد جمع ہوتے ہیں اور کتب خانے کا ناظم انہیں بچوں کی کہانیاں پڑھ کر سناتا ہے۔

کتب خانے کی رسمی فضا کو ختم کرنے کے لیے اس سے ملحق ایک نفیس کمرہ تیار کیا گیا ہے۔ جہاں ہر عمر کے لوگ آرام سے بیٹھ کر پڑھ سکتے ہیں اور بات چیت کر سکتے ہیں۔ یہاں سگریٹ پینے کی اجازت ہے اور ساتھ ہی چائے کا انتظام بھی ہے۔ غرض کتب خانے کو انسانی مراسم کا ایک سرگرم مرکز بنا دیا گیا ہے۔ جہاں بچے اور بوڑھے زندگی کے مسائل کے لیے روشنی تلاش کرتے ہیں۔

استادوں کے لیے مکان

برطانوی پارلیمنٹ میں ایک رکن نے وزیر تعلیم سے پوچھا کہ آیا وزارت اس بات سے آگاہ ہے کہ ٹیم درتھ کے رقبہ میں مکانوں کی اتنی کمی ہے کہ اس رقبہ میں پڑھانے والے استادوں کو مکان نہیں ملتے جس کی وجہ سے ان اسکولوں میں استادوں کی کمی واقع ہو گئی ہے۔ سوال پوچھنے والے نے مزید پوچھا کہ کیا وزارت تعلیم ایسے استادوں کو اس غرض کے لیے الاؤنس دے گی کہ وہ زیادہ کرایہ دے کر مکان حاصل کر لیں۔ وزیر تعلیم نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ اس رقبے کے افسروں کو ہدایت کی جا رہی ہے کہ استادوں کو مکان حاصل کرنے میں مدد دیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اگر استادوں کو خاص الاؤنس دینے کے لیے کوئی تجویز ان کے سامنے پیش کی گئی تو اس پر ہمدردی سے غور کریں گے۔

سرکاری جریدہ کے اعلانات

صیغہ رجال ——— شعبہ مدارس

۱۳۸۱۷ م۔ گل محمد شاہ ایس۔ وی (۶۰ - ۱۴۰) قائم مقام اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول جام پور کو
یکم ستمبر ۵۵ء تاریخ حاضری سے م۔ سلطان خان ایس۔ وی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ اپنی تنخواہ پر
قائم مقام اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول کمالیہ مقرر کیا گیا۔

〃 م۔ بطیع خان ایس۔ وی (۶۰ - ۱۴۰) قائم مقام اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول کمالیہ کو
تاریخ حاضری سے قائم مقام گل محمد شاہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر قائم مقام اردو
مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول جام پور مقرر کیا گیا۔

۱۹۸۸۶ م۔ عبدالرحمن بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ - ۲۵۰) اسسٹنٹ انسپکٹر آف سکولز کیمبل پور کو تاریخ
۲۸ نومبر ۵۵ء حاضری سے م۔ ریاض الحسن بی۔ اے۔ بی۔ ٹی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پہ
اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز میانوالی مقرر کیا گیا۔

〃 م۔ ریاض الحسن بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ - ۲۵۰) اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز
میانوالی کو تاریخ حاضری سے۔ م۔ عبدالرحمن بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ اے۔ ڈی۔ آئی آف سکولز
کیمبل پور کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ اپنی تنخواہ پر اے۔ ڈی۔ آئی آف سکولز کیمبل مقرر
کیا گیا۔

۱۸۹۹۷ م۔ عبدالحکیم۔ ایس۔ وی (۶۰ - ۱۴۰) اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول کیمبل پور کو
۲۲ نومبر ۵۵ء تاریخ حاضری سے م۔ محمد لطیف جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر اردو مدرس گورنمنٹ
ہائی اسکول حضرو مقرر کیا گیا۔

〃 م۔ محمد لطیف میٹرک (۶۰ - ۱۴۰) اورنیٹل مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول حضرو کو تاریخ حاضری
سے عبدالحکیم ایس۔ وی جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول

کیمبل پور مقرر کیا گیا۔

۱۸۸۱۹ م عبدالرشید خاں او۔ٹی (۶۰ - ۱۴۰) اورنیٹل مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول خوشاب کو تاریخ
۱۸ نومبر ۱۹۵۵ء حاضری سے غلام عباس شاہ جنہیں للبعد انگلش ماسٹر مقرر کیا گیا ہے کی جگہ اپنی تنخواہ پر گورنمنٹ ہائی اسکول لہکر میں اورنیٹل ماسٹر مقرر کیا گیا۔

۹۱۸۱ م۔عبداللطیف ایف۔اے ۔ ۶۰ - ۱۴۰) عربی ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول باغ بان پورہ
۴ نومبر ۱۹۵۵ء لاہور کو تاریخ حاضری سے عربی ماسٹر ملک مہدی حسن جن کا تبادلہ ہو چکا ہے کی جگہ عربی ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول پنڈی بھٹیاں گوجرانوالہ مقرر کیا گیا۔

" ملک مہدی حسن۔ ایچ۔ اے (۶۰ - ۱۴۰) عربی ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول پنڈی بھٹیاں گوجرانوالہ کو تاریخ حاضری سے عبداللطیف ایچ۔ اے۔ ایف۔ اے جن کا تبادلہ ہو چکا ہے، کی جگہ عربی ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول باغبان پورہ لاہور مقرر کیا گیا۔

۱۸۲۸۶ م۔غلام عباس شاہ ایس۔ وی (۶۰ - ۱۴۰) کو تاریخ حاضری سے م۔عبدالرشید خاں کی
۴ نومبر ۱۹۵۵ء کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر اورنیٹل ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول خوشاب مقرر کیا گیا۔

۱۲۹۸۶ م۔غلام رسول بی۔اے۔بی۔ٹی (۱۳۰ - ۲۵۰) انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول پنڈدادن خاں
۱۱ نومبر ۱۹۵۵ء کو تاریخ حاضری سے م۔ افضال قریشی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول کمالیہ مقرر کیا گیا۔

" م۔ افضال قریشی بی۔اے۔بی۔ٹی (۱۳۰ - ۲۵۰) قائم مقام انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول کمالیہ کو تاریخ حاضری سے م۔غلام رسول جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول پنڈدادن خاں مقرر کیا گیا۔

۱۲۹۸۲ م۔غلام سرور پی۔ٹی۔آئی (۶۰ - ۱۴۰) گورنمنٹ ہائی اسکول مظفر گڑھ کو تاریخ حاضری سے
۱۱ نومبر ۱۹۵۵ء محمد اسلم چیمہ کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر پی۔ٹی۔آئی گورنمنٹ ہائی اسکول

علی پور مقرر کیا گیا۔

۱۲۹۸۲ م۔ محمد اسلم چیمہ (۶۰ — ۱۴۰) قائم مقام۔ پی۔ ٹی۔ آئی گورنمنٹ ہائی اسکول علی پور کو

۱۱ نومبر ۵۸ء تاریخ حاضری سے محمد شفیع کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر پی۔ ٹی۔ آئی گورنمنٹ

ہائی اسکول نیالہ خورد مقرر کیا گیا۔

" م۔ محمد شفیع (۶۰ — ۱۴۰) قائم مقام پی۔ ٹی۔ آئی گورنمنٹ ہائی اسکول نیالہ خورد کو تاریخ

حاضری سے غلام سرور کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر قائم مقام پی۔ ٹی۔ آئی

گورنمنٹ ہائی اسکول مظفر گڑھ مقرر کیا گیا۔

۱۲۹۸۳ م۔ الٰہی بخش ایس۔ وی (۶۰ — ۱۴۰) اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول کوٹ ادو کو تاریخ

۱۱ نومبر ۵۸ء حاضری سے غلام قادر کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول

مظفر گڑھ اپنی تنخواہ پر مقرر کیا گیا۔

" م۔ غلام قادر ایس۔ وی (۶۰ — ۱۴۰) اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول مظفر گڑھ کو

تاریخ حاضری سے الٰہی بخش کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول

کوٹ ادو اپنی تنخواہ پر مقرر کیا گیا۔

۱۲۹۸۴ م۔ صادق۔ ایس۔ وی (۶۰ — ۱۴۰) قائم مقام اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول بھیرہ کو

۳ نومبر ۵۸ء تاریخ حاضری سے م۔ محمد یوسف کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر قائم مقام اردو مدرس

گورنمنٹ ہائی اسکول شاہ پور صدر مقرر کیا گیا

" م۔ محمد یوسف ایس۔ وی (۶۰ — ۱۴۰) قائم مقام اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول

شاہ پور صدر کو تاریخ حاضری سے م۔ صادق ایس۔ وی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ اپنی

تنخواہ پر قائم مقام اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول بھیرہ مقرر کیا گیا۔

۸۶۴۳ م۔ فیض الحسن تقوی۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ — ۲۵۰) انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول

۲۸ اکتوبر ۵۸ء شیخوپورہ کو تاریخ حاضری سے غلام حسن کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے انگریزی مدرس

ہائی اسکول سانگلا مقرر کیا گیا۔

۸۶۴۴ م۔ غلام حسن بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۴۰ — ۲۵۰) انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول سانگلہ کو
۲۸ اکتوبر ۵۵ء تاریخ حاضری سے فیض الحسن نقوی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ انگریزی مدرس گورنمنٹ
ہائی اسکول شیخوپورہ مقرر کیا گیا۔

" م۔ ندا اصغر بخاری۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (ایک امیدوار) کو قائم مقام انگریزی مدرس گورنمنٹ
ہائی اسکول سانگلا مقرر کیا گیا۔ (تاریخ حاضری سے)

۸۶۱۹ م۔ خورشید عالم شاہ بخاری ایس۔ وی (۶۰ — ۱۴۰) اورنٹیل ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول
۱۴ اکتوبر ۵۵ء ڈسکہ کو تاریخ حاضری سے م رحمت اللہ جن کا تبادلہ ہو چکا اورنٹیل ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول
پسرور مقرر کیا گیا۔

" م۔ رحمت اللہ کھوکھر میٹرک ایس۔ وی (۶۰ — ۱۴۰) قائم مقام اردو مدرس گورنمنٹ
ہائی اسکول پسرور کو تاریخ حاضری سے خورشید عالم شاہ بخاری کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے
قائم مقام اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول ڈسکہ مقرر کیا گیا۔

۱۶۸۵۱ م۔ محمد حسن۔ او۔ ٹی (۶۰ — ۱۴۰) عربی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول پھالیہ کو تاریخ حاضری
۱۴ اکتوبر ۵۵ء سے م۔ عبدالغفور کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے عربی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول پنڈی گھیب
مقرر کیا گیا۔

" م۔ عبدالغفور (۶۰ — ۱۴۰) عربی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول پنڈی گھیب کو تاریخ حاضری
سے م۔ محمد شریف کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے عربی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول مٹھا ٹوانہ
مقرر کیا گیا۔

" م۔ محمد شریف او۔ ٹی (۶۰ — ۱۴۰) قائم مقام عربی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول
مٹھا ٹوانہ کو تاریخ حاضری سے م۔ محمد حسن کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے عربی مدرس
گورنمنٹ ہائی اسکول پھالیہ مقرر کیا گیا۔

آموزش

شمارہ ۱۱] لاهور [فروری

اس شمارہ میں

تحریر { پروفیسر سراج الدین / پروفیسر ایم ۔ اے ۔ مخدومی

معاونین { عبدالغفور چوهدری / فضل احمد

تعلیمی ماہ نامہ

آموزش

لاہور

فروری ۱۹۵۶ء

جلد ——— ۸

شمارہ ——— ۱۱

سالانہ چندہ

پاکستان کے لیے ۶ روپے

غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز

یونی ورسٹی بک ایجنسی لاہور

آر۔ ایچ۔ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کے
یونیورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

جمہوری نظام تعلیم کے خصائص

ایم۔ اے مخدومی

سٹیٹ کالج آف واشنگٹن کے صدر ڈاکٹر چارلس کلیمنٹ فرنچ نے اس سال پنجاب یونیورسٹی کی کنووکیشن پر جو خطبہ پڑھا اس میں ہمارے لیے دعوت فکر موجود ہے، خطبے میں اس نظام تعلیم کے امتیازی خصائص کا ذکر ہے جو جمہوری بنیادوں پر استوار کیا گیا ہو۔

جمہوری نصب العین فرد کی قدر و قیمت پر زور دیتا ہے اور دوسروں کے ساتھ مل کر عوامی خدمت کو اس قدر و قیمت کا لازمہ قرار دیتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ تعلیمی اداروں کی ذمہ داری صرف اتنی نہیں کہ نوجوانوں کو روزی کمانے کا ڈھنگ سکھا دیں۔ بلکہ ان کی تربیت میں یہ بات بھی شامل ہونی چاہیے کہ وہ ایک جمہوری معاشرے میں ذمہ دار شہریت کے فرائض سنبھال سکیں۔

اس منزل پر پہونچنے کے لیے تعلیمی اداروں کو بعض واضح مقاصد کے لیے کام کرنا چاہیے۔ اوّل یہ کہ ہر نوجوان کو اس بات کے یکساں مواقع حاصل ہوں کہ اپنی قابلیتوں اور دلچسپیوں کی حدود کے اندر وہ اپنی شخصیت کو پوری پوری ترقی دے، اس کے لیے ضروری شرط یہ ہے کہ مدرسے کی سطح پر تعلیم سب کے لیے مفت ہو اور اعلیٰ سطح پر بھی تعلیمی اخراجات کا ایک معقول حصہ قومی خزانہ برداشت کرے۔

جمہوری نظام تعلیم کی دوسری اہم خوبی یہ ہونی چاہیے کہ اس کو چلانے کی آخری ذمہ داری عوام کے کندھوں پر ہو جو اپنے نمائندوں کی وساطت سے یہ کام انجام دیں۔ اس ملک میں بہت سے لوگ اس بات کو آسانی سے قبول نہیں کریں گے جس طریق پر ماضی میں لوکل باڈیوں نے اپنے مدرسوں کو چلایا ہے، اس سے بعض لوگ تعلیم کی عوامی ذمہ داری کے متعلق سرد دل ہو گئے ہیں۔ لیکن اس قسم کے نقطہ نگاہ کا منطقی نتیجہ یہ نظر آئے گا کہ عوام کو تعلیم سے کچھ سروکار نہیں

مگر یہ صورت ایک آزاد جمہوری معاشرے میں قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔ یہ فرضِ تعلیمی رہنمائی کا ہے کہ لوگوں میں اس بات کا احساس پیدا کرے کہ تعلیم کے ساتھ ان کا کتنا اہم مفاد وابستہ ہے اور انہیں ایک ایسے فرض کی انجام دہی کے لیے تیار کرے جو بالآخر انہی کے ذمہ عاید ہوگا۔

جمہوری تعلیم کی تیسری بڑی خصوصیت یہ ہونی چاہیے کہ وہ ہر میدان میں تحقیق کو جاری رکھے، جیساکہ وزیراعظم مشورہ دے چکے ہیں۔ ہمیں سائنس اور سائنسی علوم کی ترقی کے لیے انتہائی کوشش کرنی چاہیے، دوسروں کے سائنسی کارناموں سے فائدہ اٹھا لینے اور ان کی تقلید کرنے سے ہم انسانی معاشرے میں باعزت جگہ حاصل نہیں کر سکتے۔ لگاتار تحقیق ایک ایسی خدمت ہے جو آج پاکستان کے اعلیٰ تعلیمی اداروں کو دعوتِ عمل دے رہی ہے۔

یہ ان خصائص میں سے چند ہیں جو جمہوری ملک اپنے تعلیمی اداروں میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ پاکستان کے ماہرینِ تعلیم کے سامنے اس وقت ایک بہت بڑا کام ہے۔ ایک طرف ان کے ذمہ یہ فرض ہے کہ نئی پود کو قومی ثقافت کے ان پائدار عناصر سے باخبر کریں جو قومی عظمت کی ضمانت تسلیم کیے جا چکے ہیں، اور دوسری طرف ان پر یہ ذمہ داری بھی ہے کہ اس ان تھک جذبہ تلاش کی پرورش کریں جو ہر ترقی کا سرچشمہ ہے۔ ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں کو ایسے مرکزوں میں تبدیل ہو جانا چاہیے جو خالص پاکستانی فکر کی آبیاری اور اشاعت کریں اور تاریخِ عالم کے ساتھ اس کے روابط کو واضح کریں۔ جس حد تک یہ کام پورا ہوگا، اسی حد تک ہم جمہوری نصب العین اور سچی اسلامی اقدار سے قریب تر ہو سکیں گے۔

ریاضی (نفع نقصان)

سبقوں کے خاکے

عبدالغفور چوہدری مسلسل نمبر ۵

استاد:- فرض کرو اسکول چھوڑنے کے بعد تمہیں دو ملازمتیں ایک ساتھ ہی مل گئیں۔ ذرا سوچ کر بتاؤ کہ تم ان میں سے کس کو انتخاب کرو گے۔

شاگرد:- جس پر اچھی طرح کام کر سکیں۔

استاد:- بہت خوب بڑا اچھا خیال ہے۔ لیکن کیا تم اس کا لحاظ نہیں کرو گے کہ تنخواہ کس میں زیادہ ملے گی۔

شاگرد:- ضرور

شاگرد ۲:- مگر میں تو ایسا پیشہ اختیار کروں گا جس کے متعلق مجھے زیادہ سے زیادہ معلومات ہوں۔

شاگرد ۳: میں تو اپنا کام نہیں کروں گا کسی کے ہاں نوکر ہو جاؤں گا۔

استاد:- اس کا یہ مطلب ہوا کہ تم ایسی جگہ کا انتخاب کرو گے جہاں مالک کے لیے کام کرنا ہوگا، وہ ہفتے کے آخر میں تم کو اس کا معاوضہ دے گا۔ ہم اس معاوضہ کو کیا کہتے ہیں۔

شاگرد:- تنخواہ

استاد:- پس تمہیں معلوم ہوگا کہ ہر ہفتہ تمہیں کیا ملے گا۔ اگر تم زیادہ کام کرو گے تو تمہیں کچھ زیادہ مل جائے گا۔

لیکن فرض کرو کہ تم کسی کے ہاں ملازم نہیں ہو۔ خود اپنی ایک دوکان کرنا چاہتے ہو۔ شاید تم ایک کپڑے کی دوکان شروع کر کے کپڑا فروخت کرنے لگو۔ اچھا جو کپڑے تم فروخت کرو گے اسکی قیمت کون ادا کرے گا؟ تم خود بھی ان کو کہیں سے خریدو گے اور یقیناً تجارت کے لیے روپے کی ضرورت ہے۔ تم وہ رقم کہاں سے حاصل کرو گے؟

شاگرد:۔ اپنے گاہکوں سے۔

استاد:۔ فرض کرو کہ میں ایک عمدہ لباس دیکھ کر دکان میں داخل ہوتا ہوں اور کہتا ہوں یہ رہا ایک پونڈ کا نوٹ میں اس کو خریدتا ہوں اور اس کپڑے کی قیمت بیس دو پے ادا کرتا ہوں اس کی قیمت خود دکاندار نے بیس دو پے ادا نہیں کی تھی بلکہ کچھ کم دام میں خریدا تھا۔ بچت کی رقم کو تم کیا کہو گے؟

شاگرد:۔ نفع

استاد:۔ نفع سے کیا مطلب ہے؟ میں اس کپڑے کی قیمت بیس دو پے ادا کرتا ہوں جو تم کو ۱۵ روپے میں پڑا ہے۔ تمہاری اپنی بچت کتنی ہوئی۔

شاگرد:۔ جتنے میں بیچے ہیں اور جتنے میں خریدا تھا ان دونوں کا فرق۔

استاد:۔ تو یہ ۵ روپے ہوتے ہیں جو تمہاری جیب میں رہے۔ اچھا اگر تم اس طرح دکان چلا رہے ہو تو کیا تم کسی ایسے آدمی کو پسند کرو گے جو کسی کی دکان میں اپنا نہیں دوسرے کا کام کر رہا ہو۔

شاگرد:۔ ہم اپنا کام کرنا پسند کریں گے۔

استاد:۔ کیا تم اس کا اندازہ لگا سکتے ہو کہ ایک ہفتہ میں کتنا روپیہ کماتے ہو گے؟

شاگرد:۔ نہیں جناب۔

استاد:۔ کمائی کا انحصار کس بات پر ہو گا؟

شاگرد:۔ کپڑوں کی مقدار پر جو بیچے جا رہے ہیں اور اس قیمت پر جس پر اس کپڑے کو بیچ دیا گیا

استاد:۔ بالکل ٹھیک ہے لیکن وہ کپڑا جو تم اپنی دکان پر فروخت کرنا چاہتے ہو کہاں سے خریدو گے۔ کیا دوسرے دکاندار کے پاس سے جا کر لاؤ گے؟

شاگرد:۔ ممکن ہے ہمیں اس کے لیے کراچی جانا پڑے۔

استاد:۔ ایسی چیزیں کہاں ملتی ہیں؟

شاگرد:۔ دکان دار سے

استاد:۔ دکان دار کسے کہتے ہیں

شاگرد:۔ ایسے شخص کو جو پرچون فروخت کرتا ہے۔

استاد:۔ دکان دار مال کہاں سے خریدتا ہے؟

شاگرد:۔ منڈی میں کسی تھوک فروش سے ۔

استاد:۔ یقیناً وہ کپڑے کو منڈی سے خریدتا ہے۔ ہم اس منڈی کو کیا کہتے ہیں۔

شاگرد:۔ کپڑے کی منڈی۔

استاد:۔ ٹھیک، لیکن منڈی والے کپڑا کہاں سے خریدتے ہیں، ہم اس جگہ کو کیا کہتے ہیں جہاں کپڑا بنایا جاتا ہے؟

شاگرد:۔ کارخانہ

استاد:۔ ہاں استاد جہاں چیزیں بنتی ہیں اس کا یہی نام ہوتا ہے۔ اچھا ہم ایک دکان دار کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ اب کسی ایسی چیز کا نام لو جو ہمارے ہاں نہیں ہوتی، بلکہ باہر سے منگوائی جاتی ہے۔

شاگرد:۔ مشینیں۔

استاد:۔ ہاں مشینیں ہمیں باہر سے منگوانی پڑتی ہیں۔ باہر کے ملک برآمد کرتے ہیں اور درآمد شدہ مشینیں سمندر کے راستے کراچی میں آتی ہیں۔ وہ لوگ جو مشینیں منگاتے ہیں تھوک فروش کہلاتے ہیں۔ ان کو گودام میں اکٹھا کرتے ہیں اور بڑی بڑی دکانوں میں محفوظ کر لیتے ہیں جن کو ویر ہاؤس بھی کہتے ہیں۔ اگر تم ایک سوداگر ہو اور تمہیں مشینیں درکار ہیں تو تم گودام سے لو گے۔ ویر ہاؤس ایک ایسی جگہ ہوتی ہے جہاں سوداگروں کی ضروریات مہیا کی جاتی ہیں۔ کارخانہ وہ جگہ ہے جہاں یہ چیزیں بنتی ہیں۔ اگر تم شیشے کی بوتلوں کا یا اس قسم کی دوسری چیزوں کا کاروبار کرو تو اپنی دکان کے واسطے مال خریدنے کہاں جاؤ گے۔

شاگرد: شیشے کے کارخانہ میں۔

استاد: فرض کرو تم جوتوں کا کاروبار کرتے ہو تو تم کہاں جاؤ گے۔ گودام پر یا کارخانہ میں؟

شاگرد: کارخانہ میں۔

استاد: تم اس کے لیے ولایت نہیں جاؤ گے۔ وہاں سے ہمیں کیا ملتا ہے؟

شاگرد: مشینیں وغیرہ کی قسم کی چیزیں۔

استاد: فرض کرو مجھے ایک جرسی کی ضرورت ہے۔ اور میں لارنس پور کے کارخانہ میں گیا۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ یہ چیزیں وہاں دستیاب ہو جائیں وہاں مجھ سے کیا کہا جائے گا؟

شاگرد: وہ کہیں گے کہ آپ کو بہت سی جرسیاں خریدنا پڑیں گی

استاد: ہاں اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ تھوک خریداری کا یہ مطلب ہے کہ ایک وقت میں بہت سا مال خریدا جائے۔ اس سلسلہ میں تم کو ایک مختصر سی کہانی سناتا ہوں۔ ایک مرتبہ جب کہ میرے دوستوں میں سے دو صاحبان دہلی میں ٹھہرے ہوئے تھے انہوں نے سنا کہ ایک بازار میں پھل بہت سستے مل سکتے ہیں وہ وہاں پہونچ گئے۔ یہ میوہ منڈی تھی۔ اس کے گیٹ پر ان سے دریافت کیا گیا کہ انہیں کیا چیز درکار ہے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ کیلے چاہتے تھے ان کو ایک دکان پر لے جایا گیا۔ جہاں ایک صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ اور جب انہوں نے ان کو بتایا کہ وہ کیلے خریدنا چاہتے ہیں تو اس نے ان سے پوچھا کہ آپ کو کیلے کتنی ٹوکریاں درکار ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ان کو آدھی درجن کیلے درکار ہیں۔ تب اس نے ان کو بتایا کہ کیلوں کی اتنی تعداد ان کو صرف بطور تحفہ دی جا سکتی ہے۔ ور وہ تھوک فروشی کرتے ہیں۔ اب بتاؤ کہ میرے دوست کس طرح کی خریداری کرنا چاہتے

شاگرد: وہ پرچون خریدنا چاہتے تھے۔

استاد: پرچون سے ہمارا کیا مطلب ہوتا ہے؟

شاگرد: تھوڑی مقدار میں خریداری کرنا۔

استاد:- ہاں ٹھیک ہے، یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے تم دیا سلائی کی ایک ڈبیا خریدنا چاہتے ہو۔ تم بازار میں کسی دوکان پر جاؤ گے اور ڈبیا خرید کر دو گے، کیا تم ایک ڈبیا خریدنے کے واسطے فیکٹری میں جانے کا خیال کرو گے، اس سے پہلے کہ تم کسی کارخانہ میں خریداری کر سکو تمہیں ایسا دکاندار ہونے کا ثبوت دینا پڑے گا۔ اس ثبوت سے تم کیا مطلب سمجھتے ہو؟

شاگرد:- انہیں یہ دکھانا پڑے گا کہ ہمارے پاس دکان کا لائسنس ہے۔

استاد:- اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم واقعی کاروباری آدمی ہو۔ آخر ہمیں تھوک خریداری سے کیا فائدہ حاصل ہوتا ہے؟

شاگرد:- جتنا زیادہ مال خریدیں اتنا زیادہ سستا ملے گا۔

استاد تو تم کو کپڑا ضرور بڑی مقدار میں خریدنا پڑے گا۔ دکاندار اس کو خرید کر اسے زیادہ قیمت پر فروخت کرتا ہے جتنی قیمت پر اس نے خریدا تھا۔ اچھا وہ دکان کا خرچ کس طرح چلاتا ہے؟

شاگرد:- منافع سے۔

استاد:- ہاں قیمت فروخت اور قیمت خرید کے فرق سے۔ کیا تم قیمت خرید کا کوئی اور نام بتا سکتے

شاگرد لاگت۔

استاد:- اس کا دوسرا اور کیا نام ہے؟

شاگرد:- قیمت لاگت۔

استاد:- اس طرح سے اس کے تین نام ہوئے، وہ اپنی فروخت کو میری قیمت خرید کہہ سکتے ہیں۔ اگر وہ بڑی مقدار میں خریدتے تو تھوک خریداری کہا جاتا۔ فرض کرو اس نے ایک کپڑا پندرہ روپے کا خریدا ہے اور بیس روپے میں فروخت کیا۔ اس سودے میں منافع کتنا رہا؟

شاگرد:- پانچ روپے۔

استاد:۔ اب میں تم سے یہ پوچھتا ہوں کہ اس کپڑے کی خرید میں کتنے روپے لگائے۔

شاگرد:۔ پندرہ روپے

استاد:۔ اور کتنے میں فروخت کیا۔

شاگرد: بیس روپے میں۔

استاد:۔ بس اس کپڑے کے اس کو کل بیس روپے ملے۔ یہ کپڑا پندرہ روپے میں خریدا گیا تھا دوسرے الفاظ میں دکاندار نے ۱۵ روپے پر ۵ روپے کمائے۔ یوں سمجھیے کہ اگر تمہاری ایک دکان ہو اور تم تیس روپے کا کپڑا خرید کر اپنی دکان میں بیچنا چاہو تو تمہارے خیال میں اس کی معقول قیمت فروخت کیا ہوگی؟

شاگرد:۔ پچاس روپے

استاد:۔ اس طرح اس نے کتنا نفع کمایا؟

شاگرد:۔ بیس روپے۔

استاد:۔ دوسرے دن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دکاندار کو یہ کہنا پڑے کہ میں نے یہ کپڑا پندرہ روپے میں خریدا تھا لیکن میرا خیال ہے کہ لوگ اس کو پسند نہیں کرتے اس لیے میں اس کو بیس روپے میں فروخت کیے دیتا ہوں اور اس طرح وہ پانچ روپے نفع کماتا ہے۔ اگر وہ اسی طرح غیر منظم صورت میں اپنا کام کرتا رہا تو اس کو یہ علم ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اس کی کیا حیثیت ہے اور اس کو اپنی دکان کے سلسلہ میں بہت کچھ خرچ بھی کرنا ہے۔ اس کو کئی طرح کے کرائے اور ملازمین کی تنخواہوں پر بھی خرچ کرنا ہوتا ہے۔ اس کے لیے ان تمام چیزوں کو نظر میں رکھنا ضروری ہے، اس کے علاوہ اس کو اس بات کا بھی خیال رکھنا ہے کہ اس بازار میں دوسرے تھوک فروش اس سے کم قیمت میں فروخت کر رہے ہیں۔ اگر ایسی صورت ہو تو اس کا کیا نتیجہ ہوگا؟

شاگرد:۔ کاروبار دوسرے لوگوں کے ہاتھ میں چلا جائے گا۔

استاد:- اس لیے دکاندار کو سب سے پہلے اس بات کا خیال ہوگا کہ اس کی قیمتیں دوسرے لوگوں کی قیمتوں کے برابر ہوں لیکن اس کو یہ دیکھنے کی بھی ضرورت ہے کہ اس کی خرچ کی ہوئی رقم ان تمام اخراجات کے ساتھ واپس آ رہی ہے جو اس کو دکان پر صرف کرنا ہے۔ اس نے پندرہ روپے میں کپڑا خرید کر بیس روپے میں فروخت کیا اسے کتنی رقم زیادہ ملی؟

شاگرد:- پانچ روپے۔

استاد:- پانچ روپے پندرہ روپے کی کونسی کسر ہے جو اس نے کپڑا خریدنے میں خرچ کی۔

شاگرد:- ایک تہائی۔

استاد:- اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو ایک تہائی منافع ہوا، اور ان کی زندگی میں اس کا خیال ہے کہ ایک تہائی منافع کافی ہے، اس لیے فرض کرو کہ اس نے کوئی چیز چھ آنے میں خریدی تو وہ اس کو کتنے میں فروخت کرے۔

شاگرد:- نو آنے میں۔

استاد:- اگر تمہاری بات صحیح ہے تو میرا حساب غلط ہوتا ہے۔

شاگرد:- آٹھ آنے میں۔

استاد:- اب ٹھیک ہے۔ اس لیے کہ قیمت خرید ۶ آنے کا ⅓ دو آنے ہوتا ہے تو وہ اسے ۸ آنے میں فروخت کرتا ہے۔ ایک تہائی ایسا منافع ہے جس کو مناسب اور دیانتدارانہ کہا جا سکتا ہے۔ اور وہ جانتے ہیں کہ اگر کوئی اس سے زیادہ لے گا تو کاروبار دوسرے لوگوں کے ہاتھ میں چلا جائے گا۔ فرض کرو کہ دکاندار کوئی چیز ۱۲ آنے میں خریدتا ہے تو وہ کتنے میں اس کو فروخت کرے گا؟

شاگرد:- چودہ آنے میں۔

شاگرد ۲:- سولہ آنے میں۔

استاد:- سولہ آنے ٹھیک ہے۔ اس لیے کہ قیمت خرید ۱۲ آنے ہے اس کا ⅓ چار آنے

ہوتا ہے۔ اس طرح وہ اس کو سولہ آنے یعنی ایک روپے میں فروخت کرے گا۔ پس اسکی قیمت فروخت برابر ہے اس کی قیمت خرید جمع ایک تہائی نفع کے۔ اگر کوئی چیز تیس روپے میں خریدی جائے تو کتنے میں فروخت کی جائے۔

شاگرد: چالیس روپے میں۔

استاد:- اچھا ہم ایک ایسی جگہ لیتے ہیں جیسے لاہور کی مال روڈ۔ جہاں دکانداروں کو کئی گنا کرایہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ اگر ان کے کرائے زیادہ ہیں تو وہاں کپڑا کیسا ہو گا؟

شاگرد:- بہت بھاری۔

استاد:- میرا مطلب ان کی قیمتوں سے تھا (قہقہہ) اس بازار میں جہاں ان کو زیادہ اخراجات کرنا پڑتے ہیں وہ کہتے ہوں گے ہمیں نصف کے قریب منافع لگانا چاہیے۔ اس طرح اگر وہ کوئی چیز ساٹھ روپے کی خریدیں تو اسے فروخت کرنے سے پہلے اس کی کتنی قیمت مقرر کریں گے؟

شاگرد:- نوے روپے۔

استاد:- ٹھیک ہے۔ اور اس چیز کے لیے جو انہوں نے سو روپے کی خریدی ہو۔

شاگرد:- ایک سو پچاس روپے۔

استاد:- اچھا اب میں دوسری چیز کا ذکر کرنے والا ہوں۔ تمہیں پتہ ہے کہ فی صد سے کیا مطلب ہے؟

شاگرد:- جی ہاں ایک سو میں سے کچھ۔

استاد:- ٹھیک ہے۔ مال روڈ پر ایک سوداگر اپنے ملازمین سے یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ جو چیز وہ فروخت کریں اس پر پچاس فی صد نفع لیں۔ وہ دکان میں تو پچاس فی صد نفع لیں گے لیکن اس سے ان کا مطلب یہی ہو گا کہ وہ کسی چیز کی نصف قیمت فائدے کے طور پر شامل کریں۔ فرض کرو کہ میں ایک چیز کو ۱۲۰ روپے میں خریدتا ہوں۔ جس پر دس فی صد فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں تو میں کتنی قیمت پر فروخت کروں گا۔

شاگرد:- ۱۳۲ روپے۔

استاد:۔ اچھا اب اس کو دوسری طرح سے سمجھو کہ اس نے ایک چیز ۱۲ آنے میں خریدی اور ۱۵ آنے میں فروخت کر دی تو کتنے فی صد نفع اٹھایا۔

شاگرد:۔ ۲۵ فی صد۔

استاد:۔ اگر میں نے یہ ارادہ کر لیا کہ صرف ایک تہائی فائدہ پر فروخت کروں گا اور اس طرح میں ⅓ ۳۳ فی صد بناتا ہوں اور تھوک میں کسی چیز کی قیمت ۱۸ آنے ہے تو میں اسے کتنی قیمت پر فروخت کروں گا۔

شاگرد:۔ ۱۲ آنے میں۔

استاد:۔ ⅓ ۳۳ کیا ہوتا ہے۔

شاگرد:۔ ایک تہائی۔

استاد:۔ اچھا اب ۱۸ آنے کا ایک تہائی بتاؤ، ۱۲ آنے کا تہائی کیا ہوگا۔

شاگرد:۔ ۴ آنے۔

استاد:۔ ۶ آنے کا تہائی کیا ہوگا۔

شاگرد:۔ دو آنے۔

استاد:۔ پھر ۱۸ آنے کے متعلق تہائی کا کیا جواب ہوگا۔

شاگرد:۔ ۶ آنے۔

استاد:۔ اس چیز کی قیمت فروخت کیا ہوگی جو بارہ آنے میں خریدی گئی ہو۔

شاگرد:۔ ڈیڑھ روپیہ۔

استاد:۔ اب میں کسی گاؤں کی دکان میں گیا وہاں نہ تو کرایہ زیادہ ہے اور نہ اخراجات بہت ہیں۔ اور میں اتنا نفع لگانا نہیں چاہتا۔ کبھی کبھی کم منافع لگانا بھی بہتر ہوتا ہے۔ کیوں کہ مال زیادہ نکلتا ہے۔ مال زیادہ نکلنے سے میرا کیا مطلب ہے؟

شاگرد:۔ آپ زیادہ سے زیادہ فروخت کر سکیں گے۔

استاد:- تم میرے مطلب کو وضاحت کے ساتھ بیان نہیں کر سکے۔ کبھی کبھی تم ایک دکان دار کو دوسرے سے کہتے ہوئے سنتے ہو کہ پچھلے ہفتہ میری بکری بہت اچھی ہوئی۔ اس سے اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کی دکان پر فروخت زیادہ ہوئی۔ وہ کچھ مال ایک دن بیچتا ہے اور کچھ دوسرے دن اسطرح وہ ہفتہ کے آخر میں سب کو جمع کرتا ہے۔ اپنی فروخت سے اس کو پتہ چل جاتا ہے کہ اس نے کتنا کمایا۔ اس کی بکری وہ ہو گی جو کل رقم ہو گی جو اس نے ہفتہ بھر میں حاصل کی۔ کپڑے کی دکان میں ایک ہفتہ کی بکری کے متعلق تمہارا کیا اندازہ ہے؟

شاگرد:- ایک ہزار روپیہ کم سے کم۔

استاد:- اچھا میری ایک ہفتہ کی فروخت ایک ہزار روپے ہے۔ کیا یہ بتا سکتے ہو کہ ۳۳ فی صد کے حساب سے میرا نفع کتنا ہے۔

شاگرد:- ۳۳۳ روپے ۵ آنے ۳ پائی۔

استاد:- اس کے لیے تمہیں صرف یہ کرنا ہے کہ ہزار روپے کو تین سے تقسیم دو۔ کیا اتنے نفع سے مطمئن ہو جاؤ گے

شاگرد:- جی ہاں میں سمجھتا ہوں کہ یہ ٹھیک ہے۔

استاد:- لیکن اس رقم سے ۱۳۳ روپے پانچ آنے تین پائی اخراجات کے لیے لگانا پڑیں گے۔ اس طرح دو سو روپے فی ہفتہ منافع کے بچیں گے جو سال میں نو ہزار چھ سو روپے ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اتنے روپے سے تو میں بہت خوش حال ہو جاؤں گا اور ایک موٹر کار خرید لوں گا (قہقہہ) اس طرح بکری سے ہمارا مطلب کیا ہوتا ہے؟

شاگرد:- وہ رقم جو ہر ہفتہ دکان میں فروخت سے حاصل ہوتی ہے۔

انگریزی تعلیم (ہنڈن ٹیکنیکل کالج)

محمد عبد العزیز

پس منظر | کچھ عرصے سے برطانیہ کے ثانوی نظامِ تعلیم میں تجدید و تعمیر کی جو تحریکیں مصروفِ کار ہیں پچھلے چند ماہ سے ان میں مزید شدت پیدا ہو گئی ہے۔ ہر گروہ اپنے اپنے خیالات و نظریات کے مطابق موجودہ نظامِ تعلیم کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنے کا خواہش مند ہے۔ اس کوشش میں ماہرینِ تعلیم سے قطع نظر سیاست دان اور صناع آگے آگئے ہیں۔ اس لیے ایک عام خیال یہ بھی ہے کہ ثانوی تعلیم کو ایک نہج پر لانے کی جو کوششیں ہو رہی ہیں وہ سیاسی زیادہ ہیں تعلیمی کم۔ خیال تھا کہ اس سلسلے میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا ایک مفصل خاکہ پیش کروں لیکن اس اختلافِ رائے کے سمجھنے کے لیے اس ملک کے ثانوی نظام کی چلتی پھرتی تصویر دیکھنا ضروری ہے۔ اس کا نظامِ کار کیا ہے۔ مدارس کا نصاب۔ طریقِ تدریس اور معیار کی نوعیت کیا ہے۔ اس کے بعد ان کے موجودہ تنازعات کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔

برطانیہ کا ثانوی نظامِ تعلیم مرکزی بھی ہے اور مقامی بھی بعض حالات میں اس سے زیادہ مرکزی نظام شاید کسی دوسرے ملک میں رائج نہ ہو۔ لیکن ان کے ایک ایک مدرسے کو مقامی ضروریات کے مطابق جو آزادی حاصل ہے وہ غالباً کسی غیر مرکزی نظام میں کسی دوسرے ملک کو نصیب نہ ہو گی۔ یہ بھی برطانوی نظامِ تعلیم کا کرشمہ ہے کہ پبلک اسکولوں کے علاوہ اس ملک میں چار قسم کے ثانوی مدارس موجود ہیں جو اپنے نظام طریقِ تدریس اور نصاب میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں، اور پھر بھی ایک مرکزی نظام کے تابع۔ ان میں گریمر اسکول خالص تعلیمی مدارس ہیں، جہاں طلبہ کو سائنس اور آرٹس کے مختلف مضامین کی تعلیم دی جاتی ہے۔ لیکن ان میں صرف انہی طلبہ کو داخلہ ملتا ہے جو گیارہ سال کی عمر کے انتخابی امتحان میں ذہنی اعتبار سے بہت ہی اچھے ثابت ہوئے ہوں۔ ثانوی جدید مدارس (SECONDARY MODERN SCHOOLS) بھی بنیادی طور پر تعلیمی ہیں۔ لیکن ان کے نصاب میں چند

فنی مضامین بھی شامل ہیں۔ یہ مدارس نسبتاً کم ذہین اور کم ہوشیار طلبہ کے لیے مخصوص ہوتے ہیں۔ ٹیکنیکل مدارس میں فنی مضامین کی تدریس اور عملی تربیت پر بالخصوص زور دیا جاتا ہے۔ ان مدارس میں بھی نسبتاً کم ذہین طلبہ داخل ہوتے ہیں۔ چوتھی قسم کثیر الانواع مدارس کی ہے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے مدارس کی پہلی تین قسموں سے بالکل مختلف ہے۔

اس مضمون میں ٹیکنیکل مدارس کا بالخصوص ہنڈن ٹیکنیکل کالج کا ایک مفصل خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ۱۵ نومبر ۱۹۵۸ء کو میں انسٹی ٹیوٹ کے چند دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ دن بھر اس کالج میں رہا۔ اس کے طلبہ کو کام کرتے اور پڑھتے دیکھا۔ اور اساتذہ سے مختلف تعلیمی مسائل پر گفتگو کی۔ ہنڈن مڈل سکس کاؤنٹی کونسل کی ایک برو ہے، اس لیے دراصل یہ ادارہ براہ راست مڈل سکس مقامی تعلیمی حکومت کے زیر انتظام ہے۔ کالج ہنڈن سنٹرل میں اسٹیشن روڈ پر واقع ہے۔ اس کے قیام کا مقصد برو کے کم ذہین بچوں کے لیے تعلیمی سہولتیں بہم پہونچانا ہے۔ یہ ایک کثیر الانواع ادارہ ہے اس لیے اس کے اندرونی نظام کار کو سمجھنے کے لیے اس کے مختلف شعبوں کا علیٰحدہ علیٰحدہ بیان مناسب ہوگا۔ انتظامی سہولت کے لیے اسے چار شعبوں میں تقسیم کردیا گیا ہے۔

(۱) انجینیرنگ (۲) کامرس (۳) کیٹرنگ (CATERING) (۴) تعلیم بالغان

ان مختلف شعبوں میں تیرہ سال کی عمر سے لے کر اٹھارہ سال کی عمر تک کے بچے تعلیم پاتے ہیں یعنی سولہ سال تک کی لازمی تعلیم کے بعد بھی جو بچے تعلیم حاصل کرنا چاہیں وہ گرامر اسکولوں کی طرح تعلیم مزید کی خاطر اسی اسکول میں ٹھہر سکتے ہیں۔ تعلیم مزید کی مدت بالعموم دو سال ہوتی ہے، اس کے بعد طلبہ ... سرٹیفکیٹ یا جنرل سرٹیفکیٹ کا امتحان دیتے ہیں۔ انتظامی لحاظ سے یہ چاروں شعبے ایک پرنسپل کے تحت ہیں۔ لیکن دراصل ہر شعبے کا صدر اندرونی انتظام کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ آج کل ڈاکٹر ولیمن اس ادارے کے پرنسپل ہیں۔ ہم لوگ ڈاکٹر ولیمن سے نہ مل سکے۔ کیوں کہ اسی روز کاؤنٹی کونسل ایجوکیشن کمیٹی کا اجلاس تھا، اس سلسلے میں ظاہر ہے کہ پرنسپل کو بہت کم فرصت مل سکتی تھی۔ پرنسپل کی عدم موجودگی میں مسٹر ایلن نے جو اس وقت ہنڈن ٹیکنیکل کالج کے شعبۂ انجینیرنگ کے صدر ہیں ہماری رہنمائی ...

ان کی رہنمائی میں سب سے پہلے ہم نے انجینئرنگ کا شعبہ دیکھا۔

انجینئرنگ

اس شعبے میں انتظامی سہولت کے لیے طلبہ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ایک سیکنڈری ٹیکنیکل اسکول آف انجینئرنگ (SECONDARY TECNNICAL SCHOOL OF ENGINEERING) اور دوسرا سینئر ڈے کورس (سینڈوچ) فار انجینئرنگ اپرنٹسز (SENIOR DAY COURSE (SANDWICH) FOR ENGINEERING APPRENTICES)

سیکنڈری ٹیکنیکل اسکول گیارہ سال کی عمر میں ہر مقامی تعلیمی حکومت کے زیر اہتمام ایک انتخابی امتحان ہوتا ہے، اس امتحان میں جو بچے زیادہ ذہین اور ہوشیار معلوم ہوتے ہیں انہیں تو گرامر اسکولوں میں جگہ مل جاتی ہے باقی ثانوی جدید مدارس یا اس قسم کے کسی دوسرے ادارے میں چلے جاتے ہیں۔ بہنڈن سیکنڈری ٹیکنیکل اسکول میں ایک بچہ تیرہ سال کی عمر میں داخل ہو سکتا ہے۔ یعنی جو بچے بالعموم گیارہ سال کی عمر میں گرامر اسکول کے داخلے سے محروم رہ جاتے ہیں اور پھر دو سال تک کسی ثانوی جدید مدرسے میں تعلیم حاصل کرتے ہیں، وہ اس اسکول میں داخل ہو سکتے ہیں۔ تیرہ سال کے بچوں کی عمر کا ایک انتخابی امتحان ہوتا ہے۔ اس امتحان میں صرف وہی طلبہ شریک ہو سکتے ہیں جنہیں ان کے مدرسوں کے ہیڈ ماسٹر اجازت دے دی ہو۔ یہ اجازت صرف رسمی ہوتی ہے کیونکہ جو طالب علم اس امتحان میں شریک ہونا چاہے اسے بالعموم کوئی ہیڈ ماسٹر روکتا نہیں۔ بلکہ اگر اس کے امکان میں کچھ ہو تو اس کی مدد ضرور کرتا ہے امتحان میں کامیاب ہونے والے بچوں کی ترتیب وار ایک فہرست بنائی جاتی ہے اور جگہوں کے مطابق پہلے دس یا بیس یا جتنی جگہیں ہوئیں اس کے مطابق طلبہ کو داخلہ مل جاتا ہے۔ باقی طلبہ بدستور اپنے مدرسوں میں پڑھتے رہتے ہیں، اس سال مسٹر ایلین نے بتایا کہ دو سو لڑکوں میں سے ہم نے صرف ۷۵ لڑکے لیے۔

ہم لوگ مسٹر ایلین کے دفتر میں بیٹھے بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے، جب اسکول

کولج کے حالات سے عمومی واقفیت ہوگئی تو اس کے دیکھنے کا مسئلہ پیش آیا۔ مسٹر ایلین نے ہمیں تین تین کی دو ٹولیوں میں تقسیم کر کے ایک ٹولی کے لیے مسٹر برہم کی رہنمائی میں سینیئر شعبے کے دیکھنے کا انتظام کیا اور دوسری ٹولی کو مسٹر ڈائمن کو سیکنڈری اسکول دیکھنے کے لیے روانہ کیا۔ میں دوسری ٹولی میں تھا۔

انگریزی کی تدریس | سیکنڈری اسکول میں فنون تعلیم کے ساتھ ساتھ طلبہ کو انگریزی، تاریخ، جغرافیہ، سائنس اور ریاضی بھی پڑھائی جاتی ہے۔ لیکن اس میں کوئی مضمون لازمی نہیں ہوتا۔ البتہ چوں کہ انگریزوں کی انگریزی کمزور ہوتی ہے، اس لیے انگریزی سب ہی پڑھتے ہیں۔ سیکنڈری اسکول کے اس حصے میں میں نے سال دوم اور سال سوم کے طلبہ کو انگریزی پڑھتے دیکھا۔ انگریزی کا معیار اگرچہ ہمارے ملک کے معیار کے مطابق تو خاصہ اونچا ہے۔ لیکن یہاں کے گرامر اسکولوں کے معیار کے پیش نظر اسے اونچا نہیں کہا جا سکتا۔ سال دوم کے لڑکے لانگ فیلو کی نظم "ہیاواتھا" (HIAVATHA) پڑھ رہے تھے۔ سبق میں دل چسپی قائم رکھنے کے لیے مدرس نے وقتاً فوقتاً دوسری نظموں اور دوسرے متعلقہ واقعات کا بھی حوالہ دیا۔ میں نے چند بچوں کی کاپیاں دیکھیں۔ مدرس کی ہدایت کے مطابق بچے نظم کی چند سطریں اپنی کاپی پر لکھتے ہیں اور پھر اپنی اپنی ذہانت کے مطابق اس کا مصور منظر پیش کرتے ہیں۔ بعض طلبہ کی ڈرائنگ اور لانگ فیلو کے الفاظ میں یک گونہ مطابقت سی پائی جاتی تھی۔ بہر صورت اس طرح طلبہ کو فکر کرنے کا کچھ سامان مل جاتا ہے اور چوں کہ ان کے متعلق غلط یا صحیح یہ رائے قائم کر لی جاتی ہے کہ ذہنی لحاظ سے یہ اتنے اچھے نہیں ہیں اس لیے عام طور پر اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ وہ کچھ اپنے ہاتھ سے کرتے رہیں۔ ان میں سے دو تین لڑکے بہت ہی اچھے تھے۔ ان کا لب و لہجہ بھی واضح تھا اور ان میں زبان کے سمجھنے کی بھی اہلیت تھی۔ میں نے مدرس سے ان کے حسن کار کی تعریف کی تو وہ اُبل پڑا۔ محض چھیڑنے ہی کی دیر تھی۔ اس نے کہا یہ گیارہ سال کے انتخابی امتحان کے کشتے ہیں (THEY ARE THE MARTYRS OF 11x TEST) اس کے لہجے میں کڑوی کم تلخی زیادہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان امتحانوں کو ذہنی پیمائش کا آلہ بنانا درست نہیں۔ بعض بچے جو ان امتحانوں میں اچھے رہتے ہیں آگے چل کر توقعات کے مطابق اچھے ثابت نہیں ہوتے اور بعض بچے جنہیں کم ذہین سمجھ کر علاحدہ کر دیا جاتا ہے اپنی آئندہ زندگی میں زیادہ بہتر اور زیادہ مفید کام کرتے ہیں۔

اس کے بعد ہم نے انگریزی کا دوسرا سبق دیکھا. یہ سبق ایک لحاظ سے نہایت دلچسپ تھا. انگریز مدرس انگریز بچوں کو ترکیب نحوی (ANALYSIS) پڑھا رہا تھا. ہم بھی اپنے مدرسوں میں آٹھویں جماعت سے گرامر کے سبقوں میں نحو کے مختلف قاعدے پڑھاتے رہتے ہیں. ہمارے بچوں کے لیے انگریزی ایک غیر زبان ہے جس میں انہیں بیسیوں مشکلات ہو سکتی ہیں. لیکن لطف یہ ہے کہ جن بچوں کی مادری زبان انگریزی ہے وہ بھی اسی قسم کی غلطیوں کا شکار ہوتے ہیں (SUBJECT) اور (PREDICATE) کے مسائل وہی ہیں NOUN اور ADJECTIVE کے جھگڑے اسی قبیل کے ہیں. دراصل پچھلے بیس سال سے انگلستان میں یہ ایک امر متنازع تھا کہ طلبہ کو گرامر پڑھائی جائے یا یہ سمجھ کر کہ ان کی اپنی زبان ہے زبان کے اصول و قواعد کا سمجھانا چنداں ضروری نہیں ہے. اس اصول پر ایک مدت مدید تک ہر مدرسے میں عمل ہوتا رہا. لیکن اب یہ محسوس کر لیا گیا ہے کہ زبان پر دستگاہ حاصل کرنے کے لیے قواعد کا پڑھانا ضروری ہے. چناں چہ اب ثانوی مدرسوں میں طلبہ کو انگریزی کے اسباق میں باقاعدہ قواعد بھی پڑھائی جاتی ہے. قواعد کی جو کتاب سال دوم کے بچوں کے پاس تھی، اس کا نصاب کم و بیش وہی ہے جو ہمارے یہاں کے ہائی اسکولوں میں رائج ہے. دونوں کے نصاب میں صرف اتنا فرق ہے کہ ہم صرف نحو پڑھاتے ہیں. ان کے یہاں صرف پر بھی خاصہ زور دیا جاتا ہے. کیوں کہ جملے کی تفہیم کے لیے لفظ کی تفہیم ضروری ہے.

انگریزی طلبہ کو انگریزی میں لغول جیمز بلیبی (وہی مدرس جو گرامر پڑھا رہا تھا) سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ عام طور پر اس کے لفظ کے ہجا غلط ہوں گے. یا مضمون میں تسلسل اور روانی نہ ہوگی. یہ ایسی خامیاں ہیں جن کے سبھی شکار ہوتے ہیں. الفاظ کے ہجا درست کرانے کے لیے طلبہ کو رٹنے کے واسطے الفاظ کی فہرست نہیں دی جاتی. بلکہ ایک سبق کے مخصوص الفاظ مدرس بورڈ پر لکھ دیتا. طلبہ اسے ایک چٹ پر نقل کرتے رہتے ہیں. ایک مقررہ وقت میں انہیں یہ چٹ لکھ کر مدرس کو واپس دے دینی ہوتی ہے. مدرس ان چٹوں کو دیکھتا ہے اور جو الفاظ غلط درج ہوتے ہیں ان پر نشان لگا دیتا ہے یہ سلسلہ سال بھر جاری رہتا ہے. اس سے طلبہ کے ہجا ایک حد تک درست ہو جاتے ہیں.

جغرافیہ اس کے بعد ہم دو جماعتوں میں گئے. ان دونوں جماعتوں میں اس وقت ریاضی پڑھا

جا رہی تھی۔ ریاضی سے چوں کہ مجھے کوئی مس نہیں، اس لیے محض تماشائی بنا کھڑا رہا، میرے دوسرے ساتھی قبرص (CYPRUS) کے رہنے والے ہیں۔ انہیں ریاضی سے بڑا شغف ہے۔ اس لیے بڑی دیر تک ریاضی کے سبق کو دیکھتے رہے، اس کے بعد ہم ایک ایسی جماعت میں پہنچے جو اس وقت جغرافیہ پڑھ رہی تھی۔ جغرافیہ کی تدریس میں بھی یہاں طلبہ سے زیادہ کام لیا جا رہا تھا، مدرس صرف ایک نگراں کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ طلبہ اس وقت تجارتی اور مغربی ہواؤں کے نقشے بنانے میں منہمک تھے اور ان نقشوں کے نیچے اس کی مختصر سی تفصیل کر رہے تھے، اس عملی کام سے پہلے وہ آپس میں تجارتی ہواؤں کے متعلق ایک بحث کر چکے تھے، اس کے بعد ان کے مدرس نے اس کی توضیح کر دی تھی۔ اب ان کا کام اس مباحثے اور مدرس کی تقریر کی روشنی میں کچھ لکھنا تھا۔ میں نے دو چار لڑکوں کی کاپیاں دیکھیں۔ نہایت صاف ستھری اور باسلیقہ۔ ہر شخص اپنے اپنے کام میں منہمک۔ انگریز طلبہ ہمارے اپنے طلبہ سے زیادہ شوخ و شنگ ہوتے ہیں۔ مگر کام کے وقت نہایت تن دہی سے کام کرتے ہیں۔ انگریزوں کا یہ کردار کہ کام کرنے وقت وہ ہمہ تن کام ہو جاتے ہیں۔ قابلِ تقلید ہے۔ اس وقت تک میں کوئی دس اسکول دیکھ چکا ہوں لیکن ایک کے علاوہ میں نے کسی میں بدسلیقگی نہیں دیکھی، اور اس میں بھی کوئی ایسی بدسلیقگی نہ تھی۔

جغرافیہ کا کمرہ ایک چھوٹی سی تجربہ گاہ معلوم ہوتا تھا۔ وقت ضرورت کمرے کو تاریک کرکے اس میں جغرافیائی تصویریں بھی دکھائی جاتی ہیں، مختلف سبقوں کی توضیح کے لیے ان کے پاس خاصر فلم اسٹرپ تھیں۔ فلم کے ساتھ ساتھ مدرس اپنے سبق کی وضاحت کرتا جاتا ہے۔ اس سے جو نقش طلبہ کے ذہن میں ثبت ہوگا۔ اس کی چھاپ یقیناً ان مٹ ہوگی۔ بہرطور جغرافیہ کی تدریس اور جغرافیہ کے کمرے میں زندگی کے آثار تھے۔ تن مردہ میں زندگی کی روح پھونکنے والی بات نہ تھی، بلکہ ہر شخص باہوش وحواس اس زندہ ماحول میں اپنی زندگی کا ثبوت دے رہا تھا۔

اس کے برعکس ہمارے مدارس میں اول تو جغرافیہ کے لیے کوئی مخصوص کمرہ ہی نہیں ہوتا۔ ! اس کی تدریس کو تاریخ کے ساتھ اس طرح جوڑ دیا گیا ہے کہ جغرافیہ کی حیثیت مضمون کے اعتبار سے

ثانوی ہو جاتی ہے۔ طلبہ اسے ایک مضمون کی حیثیت سے نہیں پڑھتے بلکہ اسے تاریخ کے پرچے کا ایک جزو سمجھتے ہیں۔ اس سے تاریخ کی تدریس و تفہیم کو بھی نقصان پہونچتا ہے اور جغرافیہ کو بھی۔ مزید برآں ہمارے مدارس میں جغرافیہ کی تدریس خالص امتحانی نقطۂ نگاہ سے کی جاتی ہے، اس کے آگے اگر مجھے کہنے کی اجازت دی جائے، نہ تو مدرس کو کچھ علم ہوتا ہے اور نہ وہ اسے اپنے شاگردوں تک پہونچانے کی کوشش کرتا ہے۔ عملی کام کی طرف تو خیر کوئی توجہ ہی نہیں دیتا۔ حتیٰ کہ ماڈل اسکول لاہور جیسے منفرد اداروں میں بھی جو براہ راست ٹریننگ کالج کے سرچشمۂ علم و دانش سے فیض یاب ہو رہا ہے۔ نہ کوئی جغرافیہ کا کمرہ ہے اور نہ جغرافیہ کی تدریس کا اتنا اچھا اہتمام۔ اگر کہیں کہیں اس میں جان پیدا ہو جاتی ہے تو وہ انفرادی کوششیں ہیں۔ اس کا مدرسے کی عمومی پالیسی سے کوئی تعلق نہیں۔

سائنس جغرافیہ کے اس سبق کو دیکھنے کے بعد ہمارے رہنما نے ہمیں سائنس کے معمل دکھائے ریاضی کی طرح سائنس سے بھی مجھے کوئی خاص علاقہ نہیں لیکن یہاں میری حیثیت بالکل ہی تماشائی جیسی نہ تھی، میں نے معمل کو خوب غور سے دیکھا۔ ہمارے اسکولوں میں اس قسم کی تجربہ گاہیں نا پید ہیں معمل کی میزیں اور تجربے کا ساز و سامان بہت ہی اچھا تھا۔ میں نے پاکستان اور ہندوستان میں جو مدارس دیکھے ان میں عام طور پر اس قسم کی تجربہ گاہیں نہیں ہوتیں۔ لیکن یہ کہنا کہ سرے سے اس قسم کی تجربہ گاہیں ہوتی ہی نہیں ایک بہت بڑی غلطی ہوگی۔ میں نے خود جس اسکول میں تعلیم پائی اس کا سائنس بلاک ہی اصل عمارت سے علاحدہ تھا اور اس میں طلبہ کے لیے اسی قسم کی سہولتیں آج سے کوئی پندرہ برس قبل موجود تھیں۔

سیکنڈری اسکول کے بچوں کے لیے سائنس کے دو معمل ہیں ایک سینئر اور دوسرا جونیر۔ پہلے ہم جونیر معمل میں گئے اس کے بعد سینئر میں۔ بچے بڑے انہماک سے کیمیا کے تجربے کر رہے تھے میرے ساتھیوں نے ان سے مختلف سوالات پوچھے جن کے انہوں نے غالباً بڑی معقولیت سے جواب دیے کیوں کہ ان کے جواب سے یہ لوگ خاصے مطمئن نظر آ رہے تھے۔

کیمیا کی طرح طبیعیات کے بھی دو معمل ہیں، ایک سینئر اور دوسرا جونیر۔ طبیعیات کے سینئر معمل میں بجلی کے تجربوں کا بھی انتظام ہے۔

میکانکی تعلیم عام گریمر اور سیکنڈری ماڈرن اسکولوں اور ٹکنیکل اسکولوں میں ایک فرق یہ ہے کہ اول الذکر دو مدرسوں میں تعلیم کی اساس تعلیمی ہے، باقی چیزیں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ لیکن مؤخر الذکر میں فنی اور صنعتی تعلیم کو ایک اہم حیثیت حاصل ہے۔ یہاں زبان اور تاریخ جغرافیہ کی تدریس کے ساتھ ساتھ فنی اور صنعتی تعلیم بھی دی جاتی ہے، یہ تعلیم کچھ اس قسم کی ہوتی ہے جو آگے چل کر انہیں انجینئرنگ کی تعلیم میں امداد دے۔ یہی وجہ ہے کہ ان مدرسوں میں سائنس اور ریاضی کی تعلیم پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ جونیر اسٹیج میں طلبہ کو بڑی بڑی مشینوں پر کام کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ سال دوم میں طلبہ کی توجہ نظری معلومات پر مرکوز رکھی جاتی ہے عمل کی طرف قدرے کم توجہ دی جاتی ہے، مگر اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ عملی تربیت کو ثانوی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ سال سوم میں عملی تربیت کی طرف اور زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔

جو طلبہ ٹکنیکل اسکول میں تین سال تک تعلیم حاصل کرتے ہیں انہیں سینئر ڈے کورس میں ایک سال کی بچت ہو جاتی ہے۔ یعنی چار سال کی بجائے وہ اس کورس کو تین سال میں پورا کر لیتے ہیں۔

تاریخ میکانکی عمل کے دیکھنے کے بعد ہم نے تاریخ کا ایک سبق دیکھا۔ برطانیہ کے مدارس میں اس بات کا بالخصوص خیال رکھا جاتا ہے کہ اس عمر میں بچوں کو تاریخ کی ایسی معلومات بہم پہنچائی جائیں جن سے ان کے ذہن بھی بالیدہ رہیں اور ان میں ایک قومی کردار بھی پیدا ہو جائے، چناں چہ عام طور پر ہر مدرسے میں انگریزی تاریخ اور انگریزی دستور کی تدریس کا انتظام ہوتا ہے۔ میں نے ایک گریمر اسکول میں انگریزی دستور کی تدریس کا مشاہدہ کیا جس کا ذکر گریمر اسکول کے بیان میں کیا جائے گا، اس وقت میں صرف تاریخ کے اس سبق کا خاکہ پیش کروں گا۔ جسے میں نے اپنے ساتھیوں کی معیت میں دیکھا۔

جس وقت ہم کمرے میں داخل ہوئے تو میری نگاہ سامنے ایک بہت بڑے چارٹ پر پڑی جس میں مختلف سینین لکھے ہوئے تھے۔ مدرس اس چارٹ کی مدد سے طلبہ کو کچھ باتیں بتا رہا تھا، جماعت میں داخل ہونے سے پہلے ہی میں نے اپنے دونوں ساتھیوں سے یہ کہہ دیا تھا کہ میں یہاں ذرا زیادہ دیر ٹھہروں گا۔ سینین کے چارٹ کے علاوہ خانہ جنگی کا ایک عمومی نقشہ تھا۔ ہر جنگ کے تفصیلی اور توضیحی نقشے بھی

ٹنگے ہوئے تھے۔ ان نقشوں کو دیکھ کر یہ اندازہ تو ہو ہی گیا کہ سبق چارلس اول کے عہد کی خانہ جنگی کے متعلق ہے۔ اس قسم کا سبق پڑھاتے سننا میرے لیے بالخصوص دلچسپی کا باعث تھا۔ انگریز آج بھی اتنا ہی شاہ پرست ہے جتنا چارلس کے عہد کا شاہ پسند عنصر تھا اور اتنا ہی آزاد رو ہے جتنا کراویل یا اس وقت کی پروٹسٹنٹ پارٹی تھی۔ میں نے سبق کے دوران میں یہ محسوس کیا کہ مدرس طلبہ کو کچھ اس قسم کے محسوسات دینا چاہتا ہے کہ کراویل نے جو اقدام کیا وہ فی الواقع کراویل ہی کے الفاظ میں ایک ظالمانہ ضرورت تھی لیکن اس کی زبان سے کوئی کلمہ ایسا نہیں نکلا جس سے بادشاہ کی بے حرمتی ہوتی کیوں کہ اس کی فطری شاہ پسندی اسے اس بات پر مجبور کر رہی تھی کہ وہ احترام و ادب کے دامن کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ بادشاہ معصوم تھا۔ اگر کراویل اسے قتل نہ کرتا تو اچھا تھا۔ اپنے حقوق منوانے کے بعد اسے بادشاہ رہنے دیتا۔ انگریزی کردار کا یہ تضاد ان کے ماحول میں رہ کر اور زیادہ محسوس ہوتا ہے۔ گفتگو میں بڑا میٹھا لیکن فطرت میں کاروباری۔ بظاہر شاہ پسند لیکن اپنے حقوق کا سب سے بڑا پاس دار۔

اس تھوڑی سی توضیحی تقریر کے بعد مدرس نے طلبہ کو مارسٹن مور کی لڑائی کی فلم دکھائی، مارکوئس آرجی کا لیزلی کی قیادت میں جنوب کی طرف چلنا۔ ہائی لینڈرز کا فوجی لباس۔ ان کے خود، زرہ بکتر اور ان کی اس وقت کی فوجی زندگی، تھوڑی دیر کے لیے آنکھوں کو یہ دھوکا ہونے لگتا ہے کہ ہم فی الواقع اس جنگ کا بچشم خود مشاہدہ کر رہے ہیں۔ شہزادہ ریوپرٹ کا شاہ پسند فوج کو لے کر اس شمالی حملے کی روک کے لیے بڑھنا۔ ایک ایسا منظر تھا جس سے شاہ پسند عناصر کی ہیئت ترکیبی کی ایک واضح تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ کوئی دس منٹ تک جدال و قتال کی تصویریں گذرتی رہیں اور ایک ایک مقام پر مدرس کی آواز اس واقعہ کی وضاحت کرتی جاتی تھی۔

اگر تاریخ کی تدریس کا ہمارے ملک میں بھی کچھ اس قسم کا انتظام ہو جائے تو اس روکھی پھیکی داستان میں جان پڑ جائے۔ ہماری سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ طلبہ کو چند واقعات رٹا دیے جاتے ہیں۔ پڑھائے نہیں جاتے، اس لیے تاریخ کی تدریس طلبہ میں نہ کوئی قومی کردار پیدا کرتی ہے نہ آگے بڑھنے کا عزم و حوصلہ

سیکنڈری اسکول کے اس سروے کے بعد ہم پھر اس مرکزی مقام پر جمع ہوئے جہاں سے ہم

دو ٹولیوں میں تقسیم ہو کر اسکول کے مختلف شعبوں کو دیکھنے کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد دوسری پارٹی بھی آگئی۔ گیارہ بج چکے تھے ہم سب نے مسٹر ایلین کے کمرے میں بیٹھ کر کافی پی۔ اس کے بعد مسٹر کلیمن کے ساتھ ادارے کے سینئر حصے کو دیکھنے کے لیے روانہ ہوئے۔

سینڈوچ انجینئرنگ کے شعبے کا دوسرا حصہ سینئر ڈے کورس (سینڈوچ) فار انجینئرنگ اپرنٹس کہلاتا ہے، یہ کورس عام طور پر چار سال کا ہوتا ہے۔ لیکن ٹکنیکل اسکول کے طلبہ کے لیے اس کی مدت تین سال ہو جاتی ہے، اس کورس کی تدریس میں مقامی صنعتی ادارے بھی کالج کی مدد کرتے ہیں۔ ان صنعتی اداروں کے ملازمین جو بحیثیت اپرنٹس کام کرتے ہیں چار سال تک مسلسل ہر مہینے میں دو مرتبہ ۸ سے ۹ گھنٹہ فی ہفتہ کالج آتے ہیں، اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ طلبہ کا ایک گروہ ایک ہفتے تک مسلسل کالج آتا ہے، دوسرے ہفتے میں یہی طلبہ اپنے صنعتی اداروں میں کام کرتے ہیں اور دوسرے طلبہ پڑھنے کے لیے آجاتے ہیں اس طرح چار سال تک یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہتا ہے۔

اس کے نصاب میں حسب ذیل مضامین شامل ہیں۔

(1) MAHEMATICS (2) ENGINEGRING SEINCE (3) ENGINEERING DRAWING (4) ELECTRICAL TECUNOLOGY (5) PHYSICS (6) STRENGTH OF MATERIALS (7) THEORY OF MACHINES (8) WORKSHOR TECHNOLOGY (9) METALLURGY (10) METROLOGY AND MACHINE TOOLS (11) — GRAPHICS, (12) APPLIED THERMODYNAMICS AND (13) — INDUSTRIAL ADMINISTRATION,

اس کورس میں داخل ہونے والے طلبہ کو مندرجہ ذیل شرائط پوری کرنی پڑتی ہیں۔

(۱) عمر کم سے کم سولہ سال کی ہو۔

(۲) نیشنل سرٹیفکیٹ کورس کے سال اول کا امتحان پاس کر لیا ہو۔

(۳) جی۔سی۔ای امتحان ORDINARY LEVEL کم سے کم چار مضامین میں پاس کیا ہو۔

ان میں سے دو طبیعات اور ریاضی ہوں۔

سینیر ڈے کورس کی تکمیل کے لیے طلبہ کو کچھ اور سہولتیں بھی میسر ہیں۔ کارخانوں کے ان اپرنٹس کے علاوہ دن اور رات میں بھی پڑھائی کا انتظام ہوتا ہے۔ یعنی بعض طلبہ دن میں پڑھ کر باقی وقت کاموں میں صرف کرتے ہیں اور بعض دن میں کام کرتے ہیں اور شام کو آکر پڑھتے ہیں۔ ان میں بیشتر ایسے ہوتے ہیں جو پڑھنے کے ساتھ ساتھ کچھ کمانے بھی رہتے ہیں۔ اس کالج میں ایسے طلبہ کی تعداد نو سو ہے۔

ایسوسیئٹ ممبرشپ | انسٹی ٹیوشنز آف میکنیکل اینڈ الیکٹریکل انجینیرنگ ان دونوں اداروں سے بھی ہینڈن ٹیکنیکل کالج کا براہ راست تعلق ہے۔ جو طلبہ نیشنل سرٹیفکیٹ کا امتحان پاس کر لیتے ہیں اور وہ ان اداروں کے ایسوسیئٹ ممبر بننا چاہتے ہیں تو بعض حالات میں A.M.I. MECH.E. اور A.M.I.E.E. کے امتحانوں کے کچھ حصوں سے انہیں مستثنیٰ کر دیا جاتا ہے۔ یہ دونوں امتحانات مکینیکل اور الیکٹریکل انجینیرنگ میں خاصے وقیع سمجھے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہوتا ہے کہ جو طلبہ نیشنل سرٹیفکیٹ کا امتحان پاس کر لیتے ہیں اور باقی مضامین کی تحصیل کے لیے ایک سال مزید کام کرتے ہیں وہ مندرجہ بالا دونوں امتحانوں سے مستثنیٰ کر دیے جاتے ہیں یعنی اس کام کی تکمیل کے بعد انہیں یہ سرٹیفکیٹ مل سکتے ہیں۔

معمل اور ورک شاپ | سینڈوچ کورس میں جن مضامین کی تدریس لازمی ہے، ان مضامین کے معمل بھی موجود ہیں۔ ان میں کیمیا اور الیکٹریکل پاور کے معمل بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ سینیر طلبہ ان معملوں میں باقاعدہ عملی کام کرتے ہیں۔ ان تجربہ گاہوں کی ساخت ہمارے یہاں کے تجربہ گاہوں کی ساخت سے ذرا مختلف ہوتی ہے۔ ہمیں دھوپ اور تیز روشنی سے بچاؤ کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں لوگوں کو دھوپ اور روشنی کی ہر وقت ضرورت پیش آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں دروازوں اور کھڑکیوں میں بالعموم شیشے لگے ہوتے ہیں تاکہ دن کی روشنی چھن چھن کر کمروں میں پہنچ سکے۔

معمل تو بالعموم کالج کی خاص عمارت ہی میں واقع ہیں لیکن ورک شاپ خاص عمارت سے ذرا ہٹ کر واقع ہیں۔ ورک شاپ کی چھتیں مضبوط شیشوں کی ہیں ان سے روشنی چھن چھن کر ورک شاپ میں

پہونچتی رہتی ہے۔ کچھ اس روشنی کی مدد سے اور کچھ بجلی کی روشنی کی مدد سے طلبہ کام کرتے رہتے ہیں۔

MACHINE TOOL ورک شاپ بھی اپنی نوعیت کے لحاظ سے اچھی خاصی ہیں۔ ان میں اور SHEETMETAL WORKS کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ان دونوں ورک شاپوں میں بیک وقت ستر لڑکے کام کر سکتے ہیں۔ ان کا سازو سامان نہایت اچھا ہے۔ اور ساری چیزیں خوش سلیقگی اور قرینے سے لگی ہوئی ہیں۔ کارخانوں میں کام کرتے وقت گندگی بالعموم ہو ہی جاتی ہے۔ لیکن ان دونوں ورک شاپوں میں صفائی کا بہت زیادہ خیال رکھا جاتا ہے۔ طلبہ اور اساتذہ دونوں کام کرتے وقت یہ خیال رکھتے ہیں کہ ورک شاپ میں گندگی نہ پھیلنے پائے۔ انگلستان کے اداروں میں بالعموم دو ایک پورٹر ہوتے ہیں جن کا کام دراصل ادارے کے رکھ رکھاؤ کا انتظام ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں کی طرح صاحب کے دروازے پر چپراسیوں کی ایک قطار نہیں بیٹھی رہتی کیوں کہ یہاں مزدوری مہنگی ہے۔ ہر شخص اپنے ہاتھ سے کام کرتا ہے اور اس میں اسے عار نہیں ہوتا۔ ہنڈن ٹیکنیکل کالج اتنا بڑا ادارہ ہے لیکن یہاں بھی صرف دو پورٹر ہیں۔

اسٹاف صدر شعبہ کے علاوہ اس شعبہ میں چھ سینیر لکچرر، دس لکچرر، چودہ اسسٹنٹ لکچرر اور سکنڈری ٹیکنیکل اسکول کے مخصوص اساتذہ کام کرتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر آنرز گریجویٹ ہیں۔ (مسلسل)

یا جمہوریت سکھائی جا سکتی ہے؟

ل احمد

اس بات پر عام طور پر اتفاق رائے ہے کہ جمہوریت صحیح معنوں میں اسی جگہ کام کر سکتی ہے ن تمام لوگ ان حالات کی تشکیل میں حصہ لیں جن میں انہیں زندگی بسر کرنی ہو۔ جہاں ہر شخص کا احترام ر انسان کے کیا جائے اور جہاں ہر شخص کو یہ موقع حاصل ہو کہ اپنی استعداد اور دلچسپی کے مطابق رے اور پھلے پھولے۔

جمہوریت کی اس مسلمہ تعریف کا ماحصل یہ ہے کہ فرد معاملات کے طے کرنے میں حصہ لے۔ اسے وقع ملے کہ جو امور اس کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں ان کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرے جہاں ہو یہ حق نہیں دیا جاتا وہاں اور جو چاہے ہو مگر جمہوریت یقیناً موجود نہیں۔ افراد دوسروں کے کام کو بھی بجا لا سکتے ہیں، ایسی صورت میں بھی وہ سرگرم عمل ضرور نظر آئیں گے۔ لیکن اس رمی کا سرچشمہ اس سرگرمی سے بالکل الگ قسم کا ہوگا جو خود کیے گئے فیصلوں پر عمل کرنے ے وجود میں آئے گی، دونوں صورتوں میں بدنی حرکات بظاہر ایک سی ہوں گی لیکن دونوں سرگرمیوں اندر ح میں زمین آسمان کا فرق ہوگا۔

غرض جمہوریت کسی نظری فلسفہ کا نام نہیں۔ یہ خالصتہً ایک خاص طریق پر زندگی گزارنے نام ہے۔ اس طرز زندگی کا امتیازی نشان یہ ہے کہ اس کی تفصیلیں طے کرنے میں ان تمام دں نے حصہ لیا ہو جو اس کے ماتحت زندگی بسر کرنے والے ہیں۔ اس کے لیے یہ ضروری نہیں کہ یہ م لوگ اونچے پائے کی ذہانت کے مالک ہوں۔ یا انہوں نے بہت گہری نگاہ سے کام لے کر سور زندگی کی بحث میں حصہ لیا ہو۔ ضروری شرط صرف اتنی ہے کہ ان کی رائے معلوم کر لی گئی ، اور انہیں یہ موقع دیا گیا ہو کہ اگر چاہیں تو اپنی رائے کو موثر بنا کر معاملات کا رُخ بدل دیں۔

شوریٰ کے فوائد

شوریٰ جمہوری نظام کی جان ہے۔ شوریٰ کے بعض اہم فوائد یہ ہیں -

(ا) بہت سے زاویہ ہائے نگاہ اور بہت سے افراد کی معلومات کے یکجا ہو جانے سے فیصلوں اور طریق کار کے حسن و خوبی میں اضافہ ہوتا ہے

(ب) جو فیصلے بھی کیے جائیں گے اور جو طریق کار بھی تجویز ہو گا وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کی پسند سے قریب ہو گا اور مخصوص صورت حال کے تقاضوں کو بہتر طور پر پورا کرے گا -

(ج) چوں کہ ہر شخص فیصلوں کی تشکیل میں حصہ لیتا ہے، اس لیے وہ زیادہ ذمہ داری اور دلچسپی محسوس کرتا ہے۔ جہاں لوگ اس طرح سرگرمی سے خود فیصلوں میں شامل ہوں وہاں کسی کے ہاتھ بک نہیں سکتے ۔

(د) شوریٰ میں حصہ لینے سے ہر شخص کی پختگی بڑھتی ہے۔ اگر کسی دوسرے نے فیصلہ کر کے اسے لوگوں پر ٹھونپ دیا ہو تو اس سے انہیں نہ کچھ سیکھنے کا موقع ملتا ہے اور نہ بالیدگی کا، جب افراد اپنے گھر بار، اپنے مقامی معاملات اور اپنے کام کے بارے میں خود فیصلے کرتے ہیں تو اس سے ان کی قابلیت اور پختہ کاری بڑھتی ہے ۔

عاطل رہنے کے اثرات

جب لوگوں کو یہ حق حاصل نہ ہو کہ اپنی زندگیوں پر اثر انداز ہونے والے مسائل کے بارے میں فیصلہ کریں اور ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے منصوبے تیار کریں تو وہ یقیناً بد دلی کا شکار ہوں گے ان کی نگاہ وسیع تر قومی مفاد سے ہٹ کر کلی طور پر تنگ ۔ ذاتی اغراض پر لگ جائے گی۔ اور اجتماعی زندگی کی صحت مندی کو ایک ایسا گھن لگ جائے گا جس کا علاج کوئی دوسری شے نہیں کر سکے گی عوام کی قوت فیصلہ کو معطل کر دینے سے اس کے سوا کوئی دوسرا نتیجہ نہیں نکل سکتا۔

آج یہ شکایت عام ہے کہ اخلاقی معیار گرتے چلے جا رہے ہیں۔ جرائم کی رفتار پہلے سے بہت بڑھ گئی ہے۔ حکومت اس معاملہ میں تغافل برت رہی ہے۔ اور قوم کی اخلاقی قوت کمزور سے کمزور تر

ہوتی جارہی ہے۔ اس صورت حال سے بعض لوگ اس قدر مایوس ہو جاتے ہیں کہ وہ اصلاحِ حال کے متعلق سرے سے امید کھو بیٹھتے ہیں بعض یہاں تک کہنے لگتے ہیں کہ انہیں انسانی فطرت میں اعتماد باقی نہیں رہا، عوام کو نہ ذمہ داری کا احساس ہے نہ اپنی ذات کے سوا کسی دوسری چیز کی پروا۔ زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ ایک چوٹی کے سیاسی رہنما نے اپنی غیر متوقع ناکامی پر یہ کہہ دیا تھا کہ اس ملک میں انسانی فطرت اپنی انتہائی پستی کو پہونچ چکی ہے۔

جو لوگ اس قسم کے استدلال کے عادی ہیں انہوں نے غالباً اپنے آپ سے یہ سوال کبھی نہیں پوچھا کہ کیا عوام کی بددلی اور غیر ذمہ داری ان کی اپنی پسند کی پیداوار ہے۔ یا اس کی ذمہ داری کسی اور پر عائد ہوتی ہے۔ جہاں لوگوں کو اپنی پسند ظاہر کرنے اور اسے عملی شکل دینے کی کوئی راہ نظر نہ آئے وہاں وہ بددل اور غیر ذمہ دار نہ بنیں تو اور کیا ہوں؟ اس کی مثال بالکل اس باپ کی ہے جو اپنے نورِ نظر کے لیے ایک نیا کھلونا لاتا ہے لیکن اس سے کھیلنے کے اوقات اور طریقوں کو اس سختی سے مقرر کر دیتا ہے کہ بچے کو کھلونے کے ساتھ کچھ دلچسپی باقی نہیں رہتی۔

معاملات میں حصہ نہ لینے کی کئی وجوہ ہو سکتی ہیں، ممکن ہے کہ معاملہ کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ اس میں عوام حصہ نہیں لے سکتے، یا یہ کہ انہیں اس میں حصہ لینے کا ڈھنگ نہیں آتا یا یہ کہ وہ اپنے آپ کو اتنا نااہل سمجھتے ہیں کہ حصہ لینے کے لیے آمادہ ہی نہیں ہو سکتے، ان تمام صورتوں میں اغلب یہی ہے کہ عاطل رہنے والے لوگ ان معدودے چند پر سخت لے دے کریں گے جو معاملات کو طے کر رہے ہوں۔ جو لوگ دوسروں کے معاملات طے کرنے کا بوجھ اپنے کندھوں پر لیے رکھتے ہیں انہیں بسا اوقات مایوسی ہوا کرتی ہے کہ ان کے احسان مندوں کی تعداد بے حد کم ہے، دوسروں کو ممنون صرف وہی منصوبہ بندی کر سکتی ہے جو انہیں اس بات کا موقع دے کہ وہ منصوبے کو اپنے ہاتھوں پروان چڑھائیں۔

جو لوگ دوسروں کے نام پر اقتدار کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں رکھنے کے عادی ہیں وہ اپنے کردار کے جواز میں عجیب عجیب دلیلیں گھڑ لیا کرتے ہیں۔ حال ہی میں ایک صاحب ایک مسلمان

ملک کے مطلق العنان حکمران کی تعریف میں بڑھ بڑھ کر باتیں بنا رہے تھے۔ راقم نے اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر اس کے روح کش نظام حکومت کو سراسر غیر اسلامی قرار دیا۔ اس پہ ان کے حواری سے اور کچھ نہ بن آیا تو فرمانے لگے، بھلا وہ بے چارہ تمام تر اقتدار اپنے کنبے تک محدود نہ رکھے تو کیا کرے، عوام میں کوئی اس قابل ہے ہی کہاں کہ اسے شریک اقتدار کیا جائے۔ گدھوں کے انبوہ میں اگر ایک ہی گھوڑا موجود ہے تو بھلا سیادت کا حق اس اکیلے کے سوا اور کس کو مل سکتا ہے۔ اس دلیل کا بودا پن ظاہر ہے، یہ استبداد اور مطلق العنانی کے حامیوں کی آخری دلیل ہے لیکن اس بودے استدلال کی آڑ میں پناہ لینے والے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دے سکتے کہ عوام کو عاطل بنانے کی ذمہ داری آخر کس پہ ہے؟ جہاں لوگوں کو اپنے معاملات خود طے کرنے کا معمولی سے معمولی موقع بھی پیدا نہ کیا جائے وہاں ان کا شعور کیوں کر ترقی کرے اور ان میں پختہ کاری اور ذمہ داری کس طرح پیدا ہو؟

معاملات سنبھالنے کی ذمہ داری سے محروم رہنا خود اعتمادی کو ختم کرنے والی چیز ہے جمہوری طرز زندگی کا خاصہ یہ ہے کہ معاملات کا انتظام ایسے لوگوں کو سونپا جائے جنہوں نے ذمہ داریوں کا بوجھ سنبھال کر یہ قابلیت اور تجربہ حاصل کر لیا ہے کہ انہیں وسیع سے وسیع تر ذمہ داری سونپی جائے۔ مگر جہاں فرد کو یہ اجازت ہی نہ ہو کہ وہ معاملات طے کرنے میں کوئی دخل دے وہاں وہ تجربہ اور قابلیت حاصل کرے تو کیوں کر؟

جدید زندگی کا ایک اہم خاصہ سیاسی اور معاشی قوتوں کا روز افزوں ارتکاز ہے۔ پہلے وقتوں میں جو امور مقامی طور پر طے ہوتے تھے اب ان کی باگ ڈور دور دراز سیاسی اور تجارتی صدر مقاموں کے ہاتھوں میں ہے۔ سائنسی تہذیب کے اس پہلو سے عہدہ برآ ہونے کے لیے انوکھی تفریح کے وہ رنگارنگ سامان پیدا کیے گئے ہیں جو سینما، ریڈیو، ٹیلی وژن اور اس قسم کے دوسرے مشاغل کی شکل میں لاکھوں انسانوں کو اس اطمینان کا بدل پیش کرتے ہیں جو پہلے معاملات میں حصہ لینے سے حاصل ہوا کرتا تھا۔ قدیم یونانی ریاست کے تمام شہری ہر قسم کے حکومتی

کاموں میں براہ راست حصہ لیا کرتے تھے، اس سے انہیں جو اعتماد نفس اور اطمینان حاصل ہوتا تھا اس کا بدل جدید ریاست میں بڑی حد تک مفقود ہے۔ جدید ریاست رقبے اور آبادی کے لحاظ سے اتنی بڑی ہے کہ عوام براہ راست حکومتی کاروبار میں حصہ لے ہی نہیں سکتے۔ عوام کے اس طرح عاطل رہنے سے جو احساس بددلی و نامرادی پیدا ہوتا ہے اس کا تدارک رنگارنگ انبوہی تفریحوں سے کیا گیا ہے، جو ایک سطحی قسم کا جذباتی سکون فراہم کرتی ہیں۔

انبوہی تفریحوں میں ٹیلی ویژن ایک نیا اضافہ ہے۔ مغربی ملکوں میں بیشتر بچے فارغ اوقات کا بڑا حصہ ٹیلی ویژن کی نذر کر دیتے ہیں۔ حال ہی میں ایک ماہر نفسیات نے کچھ بچوں کے دلی تاثرات کا پتہ لینے کے لیے ان سے پوچھا کہ وہ ٹیلی ویژن کے مقابلہ میں کس چیز کو زیادہ پسند کریں گے۔ جواب میں بعضوں نے کہا وہ تمثیل کاری میں حصہ لینا زیادہ پسند کریں گے۔ بعض نے باغبانی، خیاطی اور طباخی کا نام لیا اور بعض دوسرے عملی مشاغل کا۔ اب جوابوں کا نتیجہ بالکل واضح ہے، چپ چاپ بیٹھے تصویریں دیکھنے کے مقابلہ میں کسی ایسی سرگرمی میں حصہ لینا زیادہ طمانیت بخش ہے جو تخلیقی قوتوں کو بروئے کار آنے کا موقع دیں۔ جب بچوں کی حقیقی پسند کا یہ حال ہے تو بالغوں کی پسند اس کے برعکس کس طرح ہو سکتی ہے!

قدیم اور جدید معاشرتی تقاضے

پہلے وقتوں میں معاشرتی زندگی بہت سیدھی سادی تھی، جدید کارخانوں، بڑے بڑے شہروں اور رسل و رسائل کے تیز ذرائع کی آمد سے پہلے روزمرہ زندگی کا اسلوب آج سے بہت مختلف تھا۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی دونوں کے سرچشمے ہر وقت پیش نظر اور قابل فہم تھے۔ کام کاج اور سفر کے لیے انسانی قوت، حیوانوں اور پن چکی وغیرہ پر سارا بھروسہ تھا۔ لوگوں کے باہمی مراسم صدیوں پرانے رسم و رواج کے مطابق چلتے تھے۔ معیار زندگی اور مختلف معاشی طبقوں کے باہمی تعلقات کا مدار بھی دیر سے چلے آنے والے اصولوں پر تھا۔ یہ مروجہ معاشرتی پیمانے اس طرح جڑیں پکڑ چکے تھے کہ ان کے خلاف کچھ کہنا یا کرنا گویا فساد و بغاوت کا ملزم ٹھہرنا تھا۔

قدیم معاشرتی زندگی کا ایک اور نمایاں پہلو اس کا غیر متبدل ہونا تھا۔ تبدیلی کی رفتار اس قدر مدھم تھی کہ ایک نسل اور دوسری نسل کی زندگی میں شاید ہی کوئی تبدیلی نظر آتی ہو۔ آبادیاں بہت چھوٹی چھوٹی تھیں۔ ہر آبادی کی زندگی پر اثر ڈالنے والے واقعات بیشتر مقامی طور پر رونما ہوتے تھے۔ لوگ ان واقعات کو آسانی سے سمجھ لیتے تھے اور انہیں اپنے اور دوسروں کے طرز عمل کے نتائج فوراً سامنے نظر آجاتے تھے۔

تجرباتی سائنس کی آمد نے اس صورت حال کا خاتمہ کر دیا۔ سائنسی تجربوں نے علم کے خزانے مہیا کیے۔ ان سے یہ ممکن ہو گیا کہ جدید معاشرہ نئے نئے کاموں کے لیے نئے نئے طریقے معلوم کر سکے اس علم سے کام لینے کا ایک نتیجہ یہ نکلا ہے کہ کام کرنے اور باہم مل جل کر رہنے کے طریقے بالکل بدل گئے ہیں جدید معاشی نظام نے جگہ جگہ منظم معاشی گروہ پیدا کیے ہیں جن کے فیصلے عام زندگی پر دوررس اثر ڈالتے ہیں۔ اس تیزی سے بدلنے والی معاشرتی زندگی میں ہر شخص کی زندگی براہ راست اس چیز سے متاثر ہوتی ہے کہ آنے والی تبدیلیوں کے لیے کس قسم کی منصوبہ بندی کی گئی ہے۔ اگر فرد کو کسی نہ کسی طرح یہ موقع نہیں دیا جاتا کہ اس کی آواز بھی اس منصوبہ سازی میں دخل رکھے تو وہ رونما ہونے والے واقعات کے لیے اپنے آپ کو ذمہ دار نہیں سمجھے گا۔

مثال کے طور پر کشمیر کے مسئلہ کو لیجیے۔ پاکستانی عوام بجا طور پر اس مسئلے کو اپنا اہم ترین قومی مسئلہ سمجھتے ہیں۔ وہ اس کے منصفانہ اور باعزت حل کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن اس اہم مسئلہ کے حل کے لیے ہوش مند منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔ ماضی میں اس کے حل کے لیے جو منصوبے بنائے گئے عوام کو ان کی کچھ زیادہ خبر نہیں۔ لیکن انہوں نے اچانک دیکھا کہ پاکستان کے معاہدۂ بغداد میں شریک ہو جانے سے بعض طاقتور ملک پاکستان کے جائز موقف کے مخالف بن گئے۔ اگر معاہدہ بغداد کا فیصلہ لوگوں نے خود کیا ہے تو وہ یقیناً اس نئی صورت حال کے لیے اپنے آپ کو ذمہ دار ٹھہرائیں گے۔ لیکن اگر انہوں نے خود یہ فیصلہ نہیں کیا تھا تو وہ اپنے آپ کو بری الذمہ سمجھیں گے۔ اس مثال سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ جدید اجتماعی زندگی کے اکثر مسائل

کس قدر الجھے ہوئے ہیں۔ ان پر نہ صرف مقامی طور پر قابو پانا آسان نہیں بلکہ لیبا او قات ان سے متعلق فیصلوں میں عوام کو شریک کرنا بھی کچھ آسان کام نہیں۔

عوامی شرکت کے لیے شرائط

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ لوگوں کو قومی امور کے فیصلوں میں شریک کرنا چاہیے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ نظم و ضبط کے ادارے غیر ضروری ہیں۔ حکومتی اداروں کا وجود قدیم معاشرتی زندگی میں جس قدر ضروری تھا اسی قدر وہ آج بھی ضروری ہے۔ بلکہ جمہوری طرز زندگی میں اس کی ضرورت زیادہ شدید ہے۔ کیوں کہ ان اداروں کو نہ صرف نظم و ضبط قائم رکھنا ہے بلکہ عوامی آواز معلوم کرنے اور اسے عملی شکل دینے کی صورتیں بھی تلاش کرنا ہیں۔ پہلے وقتوں میں اقتدار کا مرکز عموماً کوئی حاکم ہوا کرتا تھا لیکن ایک جمہوریت میں اقتدار کے حامل خود عوام ہیں جو ملکی معاملات میں دخیل ہو کر اپنی پسند کے فیصلوں کو عملی شکل دیتے ہیں پس جمہوری نظام میں حکومتی اداروں کے ذمہ یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ ایسی عملی راہیں معلوم کریں جن کی مدد سے عوام ملکی معاملات میں حصہ لے سکیں۔

مؤثر شرکت کی دوسری شرط یہ ہے کہ حصہ لینے والے کو اپنی سرگرمی کا نتیجہ واضح طور پر نظر آئے۔ قدیم معاشروں میں یہ بات نسبتاً سہل تھی۔ مقامی آبادی کی زندگی زیادہ تر مقامی فیصلوں کے تابع تھی۔ جو فرد کسی تبدیلی کی تحریک کرتا وہ بڑی آسانی سے اپنی کوشش کا نتیجہ مقامی زندگی میں دیکھ لیتا۔ ہر شخص کو مقامی معاملات میں اپنا مفاد صاف نظر آتا۔ ان کے متبادل حل بھی اس کے سامنے ہونے اور اسے معلوم ہوتا کہ ہر ممکن حل اس کی زندگی کے لیے کیا معنی رکھتا ہے، وہ اپنے پڑوسیوں کے ساتھ بات چیت کر کے انہیں ہم خیال بنانے کی کوشش کرتا، اور آخر الامر یہ کوشش کسی ٹھوس نتیجے پر پہنچ جاتی۔

موجودہ صورت اس سے بہت مختلف ہے۔ ہر آبادی کو جلد یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ جو معاملات اس کی زندگی پر اثر ڈال رہے ہیں ان کی شاخیں ملکوں اور خطوں کی حدوں کو

چیرتی ہوئی دور دور تک پھیلتی چلی گئی ہیں، اس لیے ان کی اکیلی کوششیں کوئی فوری نتائج پیدا کرتی نظر نہیں آتیں۔ انہیں مسائل کے تمام متبادل حل بھی معلوم نہیں ہو سکتے اور نہ یہ خبر ہو سکتی ہے کہ کسی مخصوص حل کے ضروری اقدام کیا ہیں، سب سے بڑھ کر یہ کہ فرد کے لیے یہ معلوم کرنا بڑا محال ہے کہ اس کی اکیلی کوشش کیا کر سکتی ہے، سرکاری حکام کے ساتھ اس کے براہ راست کوئی مراسم نہیں۔ پہلے وقتوں میں ایک دیہاتی شام کے وقت حقے کی مجلس میں بیٹھا جس طرح کسی مشترکہ مسئلہ پر رائے ظاہر کر سکتا تھا، اور دوسروں کو اپنا ہم خیال بنا سکتا تھا، جدید شہری اس طرح نہیں کر سکتا، چناں چہ وہ اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتا ہے، اور انجام کار بددل ہو کر رہ جاتا ہے اس مشکل کے حل کی دو ہی راہیں نظر آتی ہیں۔ پہلی یہ کہ کسی طرح مسائل کی پیچیدگی کو کم کیا جائے دوسری یہ کہ افراد کو منظم ہو کر رائے مؤثر بنانے کا ڈھنگ آتا ہو تاکہ یہ اجتماعی قوت کم و بیش مسئلے کی پیچیدگی کی ہم پلہ ہو جائے۔

قابل عمل حل

ہم میں سے اکثر جمہوری طور طریقوں کی حمایت میں بہت ملند آواز دکھائی دیتے ہیں لیکن اہم سوال یہ ہے کہ کیا جمہوریت زبانی دعاوی یا پند و نصیحت سے سکھائی جا سکتی ہے؟ اگر اس کا جواب اثبات میں ہوتا تو آج آزادی کے آٹھ سال گذر جانے کے بعد ہم جمہوریت کی شاہراہ پر بہت دور نکل گئے ہوتے، وزیروں سے لے کر معمولی ملازموں تک ہر ایک کو یہ دعویٰ ہے کہ وہ بہت جمہوریت پسند ہے اور کم و بیش ہر ایک دوسروں کو یہ تلقین بھی کرتا ہے کہ انہیں اسلامی جمہوریت کے اصول اپنانے چاہئیں اور معاملات میں ان کو مشعل راہ بنانا چاہیے، اگر یہ وعظ و تلقین کفایت کر سکتی تو اب تک عوام کی بددلی ختم ہو گئی ہوتی۔ انہیں مستقبل کے متعلق بھروسہ ہوتا اور کئی الجھے ہوئے قومی مسائل خوبی سے طے ہو گئے ہوتے لیکن جمہوریت کے متعلق اہم ترین امر یہ ہے کہ یہ الفاظ نہیں بلکہ عمل سے عبارت ہے۔ اگر لوگوں کو جمہوریت کا سبق دینا ہو تو انہیں شریک مشورہ کیجیے۔ انہیں آزادانہ اپنے خیالات ظاہر کرنے کے مواقع بہم پہونچایے اور

انہیں اپنے معاملات خود طے کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ آسانیاں مہیا کیجیے۔

آج مہذب دنیا میں جمہوری اقدار کا بہت چرچا ہے۔ لیکن ہم اکثر یہ بات بھول جاتے ہیں کہ انسان کی اجتماعی زندگی کو جمہوری بنیادوں پر تعمیر کرنے کا پہلا کامیاب تجربہ آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے کیا گیا تھا۔ انسانوں کی جس جماعت کو یہ سبق دیا گیا وہ دنیا بھر میں تہذیب و تمدن کے میدان میں سب سے پیچھے تھی وہ علم و ہنر سے بے خبر تھی۔ لیکن سچی جمہوری اقدار نے جو نشوونما اس قوم میں پائی اور یہ عمل جس تیزی سے مکمل ہوا، اس کی مثال تاریخ میں نہیں، سچ یہ ہے کہ جمہوریت کا جو رنگ اسلام کے قرون اولیٰ نے پیش کیا وہ آج بھی دنیا کی کسی بڑی سے بڑی جمہوریت کو نصیب نہیں۔

یہ حیرت انگیز معاشرتی انقلاب کس طرح پیدا کیا گیا تھا؟ یقیناً خالی دعاوی یا وعظ و تلقین سے نہیں بلکہ جمہوریت کی عملی کارفرمائی سے۔ سرورِ کونین کو ابھی مدینہ میں تشریف لائے بمشکل ایک سال گزرتا ہے۔ انصار کے ساتھ طے یہ ہوا ہے کہ اگر مدینہ پر کوئی دشمن حملہ کرے گا تو وہ اسے مار بھگانے میں مدد دیں گے۔ قریش کے لشکر کی آمد آمد کی خبر ملتی ہے تو آں حضرتؐ بچاؤ کی لڑائی کی تیاریاں کرنے لگتے ہیں، صحابہ سے مشورے ہوتے ہیں۔ رائے یہ طے پاتی ہے کہ مدینہ سے باہر نکل کر دشمن کا راستہ روکا جائے۔ آں حضرتؐ انصار و مہاجرین دونوں کے نزدیک دین و دنیا کے سردار ہیں لیکن رحمت عالمؐ کی جمہوریت نوازی کو یہ گوارا نہیں کہ خود کوئی فیصلہ صادر فرما کر ساتھیوں کو اسکی بجا آوری کا حکم دیں، چناں چہ انصار و مہاجرین کو جمع کر کے انہیں صورتِ حال سے آگاہ فرماتے ہیں۔ مہاجرین سرگرمی سے جہاد کے لیے نکلنے پر آمادگی ظاہر کرتے ہیں۔ مگر انصار کی طرف سے خاموشی ہے۔ حضورؐ دوبارہ پھر اپنے الفاظ دہراتے ہیں، اس پر انصار پوچھتے ہیں۔ یا رسول اللہ ہمارے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ کیا آپ کا اشارہ ہماری طرف ہے؟ ارشاد ہوتا ہے ہاں میں تمہارا جواب جاننا چاہتا ہوں۔ انصار کی طرف سے فدا کارانہ تائید کا اظہار ہوتا ہے جس پر آں حضرتؐ کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھتا ہے اور بدر کی طرف کوچ کر دیا جاتا ہے۔

بدر کے میدان میں تین سو تیرہ آدمیوں کی بے سروسامانی اپنے سے تین چار گنا مسلح لشکر پر جس طرح غالب آتی ہے وہ تاریخ کے عجوبوں میں سے ہے۔ لیکن ہمیں یہ نکتہ نہ بھولنا چاہیے کہ سرور کونین کی کمان میں جو مٹھی بھر لوگ معروف جنگ تھے انہیں کسی وقتی جوش یا کسی حاکم کے حکم نے لڑائی کے میدان میں نہیں لاکھڑا کیا تھا۔ بلکہ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے اول سے آخر تک معاملہ کے تمام مرحلوں پر اس میں حصہ لیا تھا۔ اور لڑائی کا فیصلہ خود ان کا اپنا فیصلہ تھا۔

عربوں کی سی گمنام قوم کے یکدم بلندی حاصل کرنے کی جہاں بڑی وجہ سرور کونین کی بے مثال روحانی تربیت تھی۔ وہاں ایک وجہ یہ بھی تھی کہ آں حضرت کی سرپرستی میں جس نئی معاشرتی زندگی کی داغ بیل ڈالی گئی اس کا سنگ بنیاد یہ تھا کہ افراد اجتماعی زندگی کے معاملوں میں پورا پورا حصہ لیں اور روحانی بالیدگی کے ساتھ ساتھ معاملات میں وہ پختہ کاری بھی حاصل کریں جو ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے ہی سے پیدا ہوسکتی ہے۔ یہ اسی تربیت کا صدقہ تھا کہ جب اونٹ چرانے والوں کو قیصر و کسریٰ کی سلطنتیں سونپی گئیں تو انہوں نے نظم و نسق اور تعمیر و ترقی کے کام کو حیرت انگیز قابلیت اور ہوش مندی سے انجام دیا۔

آج مغربی جمہوریتیں آزاد دنیا کو بار بار یہ نوید سناتی ہیں کہ ان کا مقصد ایک ایسی دنیا کی تخلیق ہے جس میں خوف و ہراس کا نام نہ ہو۔ افراد اور قومیں کلی طور پر آزادانہ پسند کے مطابق اپنی زندگی کے امور طے کریں اور بھوک افلاس اور جہالت کا خاتمہ ہو جائے۔ معلوم نہیں علم و سائنس کی بے مثال قوت کے باوجود مغربی جمہوریتیں اس سہانے خواب کو عملی شکل کب دیں گی لیکن جزیرۃ العرب پر ایسا وقت ضرور گزر چکا ہے جب وہاں اللہ کے سوا ہر قسم کے ڈر کا یکقلم خاتمہ ہو گیا تھا۔ رحمت اللعالمینؐ نے بڑے یقین کے ساتھ پیش گوئی کی تھی کہ وہ دن جلد آنے والا ہے جب سونے سے لدی ہوئی ایک عورت عرب کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک اکیلی سفر کرے گی اور اسے اللہ کے سوا کسی کا ڈر نہ ہوگا۔ دنیا نے یہ پیش گوئی حرف بہ حرف پوری ہوتی دیکھی۔

اصحاب نظر سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ خاتم الانبیاء کو رحمت اللعالمین کے لقب سے

نوازا ہی اس لیے گیا تھا کہ حضور ان تمام بھاری بھرکم ذہنی زنجیروں کو پاش پاش کرنے آئے تھے۔ جنہوں نے صدیوں سے انسانیت کے قلب و روح کو کچل رکھا تھا، آپؐ نے انسانوں کے گھڑے ہوئے جھوٹے گھمنڈوں کو پاؤں تلے روند کر تمام انسانوں کو ایک سطح پر لا کھڑا کیا۔ انسانی قلب و روح کو اس سے جو بلندی اور کشادگی نصیب ہوئی اس کی مثال تاریخ میں ناپید ہے اور اسی مناسبت سے ان انسانوں کے کارنامے بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ فلسفہ تاریخ کے طالب علم اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ کسی قوم کے کارنامے دراصل اس کی ذہنی اور روحانی تنومندی کے آئینہ دار ہوا کرتے ہیں اور اس تنومندی کا انحصار براہِ راست اس بات پر ہے کہ افراد کے قلب و روح کس حد تک طرح طرح کے بوجھوں سے آزاد ہیں، اسلام کی سب سے بڑی کرامت یہی تھی کہ اس نے اپنے پیروں کو ہر قسم کی ذہنی غلامیوں سے یکدم چھٹکارا دلا دیا۔ اس روح پرور نورانی شمع کی کرنیں صدیوں دنیا کے اندھیرے گوشوں میں اجالا کرتی رہیں، آخر انہی کرنوں نے یورپ کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں صبح امید پیدا کی جو دیکھتے دیکھتے علم و سائنس کے آفتاب نیم روز میں بدل گئی۔

تاریخ کا یہ ایک المیہ ہے کہ شرف انسانی کے جس بے مثال پیغام نے یورپ میں ایک نئی زندگی پیدا کی تھی اسے مسلمان ملکوں میں رفتہ رفتہ بالکل بھلا دیا گیا۔ حکومت اور روحانیت کی خود ساختہ تاویلوں کی آڑ میں یہاں ایسی ایسی پُرفن زنجیریں گھڑی گئیں جنہوں نے عوام کے دل و دماغ کو پھر سے مفلوج کر دیا۔ ذہنی غلامی کی وہ بوجھل زنجیریں جو رحمۃ اللعالمینؐ نے پاؤں تلے روند کر چور چور کر دی تھیں دوبارہ جوڑ کر ان کے نام لیواؤں پر تھوپ دی گئیں۔

راقم کو ایک عبرت ناک واقعہ کبھی نہیں بھولے گا۔ قیام امریکہ کے دوران میں وہ ایک روز یونی ورسٹی کھیلیں دیکھ رہا تھا، ساتھ کچھ امریکی دوست تھے۔ اس روز ریاست کے گورنر کو بھی آنا تھا چنانچہ وہ آئے اور تماشائیوں کے ہجوم میں کھو گئے۔ راقم کے امریکی دوستوں میں سے بعض نے پوچھا بھلا بتا سکتے ہو اس مجمع میں ہمارا گورنر کون ہے؟ جب راقم نے اس شناخت سے معذوری ظاہر کی تو وہ بولے دیکھا یہ ہے امریکی مساوات اور جمہوریت۔ تمہارے ملک میں کبھی ایسا ہو

بانیں کہ اسلامی جمہوریت میں کچھ اصلیت ہے۔

ان تمام واقعات سے صرف ایک ہی نتیجہ نکل سکتا ہے وہ یہ کہ جمہوریت کا سبق وعظ و نصیحت سے نہیں بلکہ عملی مثال سے سکھایا جا سکتا ہے، جو شخص جمہوری اقدار کی پرورش کا دعویدار ہو اسے پہلے خود ان اقدار کا حامل ہونا چاہیے، دکھاوے کے لیے نہیں بلکہ دلی یقین کی بنا پر۔ جمہوریت کی ترویج کی اور کوئی راہ نہیں۔

تعلیم کو کیا کرنا چاہیے

ایک عام ضرب المثل ہے کہ بوڑھے طوطے کو پڑھایا نہیں جا سکتا۔ علوم و فنون کے بارے میں غالباً یہ ضرب المثل زیادہ صحیح نہیں۔ لیکن نقطۂ نگاہ کے بارے میں اسے بڑی حد تک درست کہا جا سکتا ہے، جن لوگوں کی عمریں غلط پندار اور روح کش احساس کہتری کی نذر ہو چکی ہوں۔ ان کے دلوں میں جمہوری اقدار کے لیے سرگرمی پیدا کرنا آسان نہیں۔ لیکن نئی پود کو شروع ہی سے ان کا عادی بنانا نسبتاً سہل ہے۔ یہی وہ جادو ہے جس کی مدد سے استاد خاموش مگر دور رس ذہنی انقلاب پیدا کر سکتے ہیں۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ جمہوریت نواز مغربی ملکوں میں بھی جمہوری اقدار نے سالہا سال کی مسلسل آبیاری کے بعد جڑیں پکڑی ہیں۔ آج بھی اس آبیاری سے لحظہ بھر کے لیے تغافل نہیں برتا جاتا۔ کیوں کہ تاریخ کا سبق یہی ہے کہ اقتدار کے درست استعمال کے لیے لگاتار احتساب کی ضرورت ہے۔ جہاں احتساب ذرا ڈھیلا پڑا اقتدار کا غلط استعمال شروع ہوا اور جمہوری اقدار کا دم گھٹنے لگا۔ یہ اشارہ ان نوجوان استادوں کے لیے ہے جو یاس میں یہ کہا کرتے ہیں کہ ہماری کوششوں سے کیا ہوتا ہے؟ معاشرتی زندگی کے اکثر انقلابات۔ زنہ زنہ خاموشی ہی سے آتے ہیں اور ان کا آغاز بالعموم نئی نسل ہی سے ہوا کرتا ہے۔

نئی نسل کو جمہوری اقدار کا شیدائی کیوں کر بنایا جائے؟ اس کا صرف ایک جواب ہے وہ یہ کہ انہیں جمہوری انداز پر زندگی بسر کرنے کے لیے مواقع دیے جائیں۔ مدرسہ اپنے یہاں جس زندگی کا اہتمام کرتا ہے، اس کی بنیاد جمہوری اصولوں پر ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ طلبہ پورے طور پر اور

پر مؤثر طور پر مدرسے کی سرگرمیوں میں حصہ لیں۔ یہ غایت حاصل کرنے کے لیے چار شرائط زیادہ اہم ہیں۔

(۱) طلبہ صحیح معنوں میں حصہ انہی سرگرمیوں میں لے سکتے ہیں جو ان کے نزدیک اہم ہوں اگر کوئی سرگرمی محض استاد کے نقطۂ نگاہ سے اہم ہے تو اس میں حصہ لینے کے لیے انہیں مجبور کیا جا سکتا ہے۔ لیکن وہ دلی طور پر اس میں شریک نہیں ہوں گے۔

(۲) جب یہ کہا جاتا ہے کہ طلبہ کو عملی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے مواقع دیے جائیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں فیصلے کرنے اور ان فیصلوں کو عملی جامہ پہنانے ہر دو کاموں میں شریک کیا جائے۔

(۳) مقصد یہ ہونا چاہیے کہ طلبہ سرگرمیوں میں عملی حصہ لینا جاری رکھیں اور یہ چیز ان میں احساس ذمہ داری کی پرورش کرے، یہ اسی صورت میں ممکن ہوگا جب افراد اور جماعت دونوں اپنے عمل کے نتائج دیکھ سکیں اور یہ سمجھ سکیں کہ اس عمل نے یہ نتائج کیوں کر پیدا کیے۔

(۴) سرگرمیوں میں حصہ لینے سے مراد یہ ہے کہ فرد کا عمل کوئی واضح تبدیلی پیدا کرتا دکھائی دے۔ اگر فرد کے ذمہ کام کا کوئی اس قدر معمولی سا جزو کر دیا جاتا ہے جس سے کام کی اچھائی یا برائی میں کوئی فرق نہ آتا ہو تو اسے حصہ لینا نہیں سمجھا جائے گا۔

مختصر الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جمہوریت نام ہے عوامی زندگی میں بھرپور حصہ لینے کا جس ملک کے عوام اپنے ملکی مسائل میں بھرپور اور مؤثر حصہ نہیں لیتے وہاں جمہوریت کا زندہ رہنا محال ہے لیکن اگر شہریوں کو ایام مدرسہ میں اس بات کی تربیت نہیں ملی کہ وہ مسائل میں ذمہ داری اور سوجھ بوجھ سے حصہ لیں تو وہ بالغ زندگی کی شہری ذمہ داریوں میں بھی حصہ نہیں لے سکیں گے وہ اس بات کو قدرتی خیال کریں گے کہ یہ ذمہ داریاں ان کی بجائے کوئی دوسرا پوری کر دے۔ جمہوریت کے قیام اور اس کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ مدرسے اپنے بچوں کو جمہوری زندگی کا عادی بنائیں، وہ انہیں اس بلند انسانی شرف کی لذت سے آشنا کریں جو جمہوری زندگی کے ساتھ وابستہ ہے۔ جو لوگ جمہوری زندگی کی بلندی اور حلاوت سے ایک بار واقف ہو جائیں انہیں کسی

حیلے سے بھی ذہنی غلامی کی زنجیروں میں نہیں جکڑا جا سکتا، یہی وجہ ہے جمہوری ممالک میں تعلیم کا سب سے زیادہ زور اس بات پر صرف ہوتا ہے کہ نئی پود کو بھرپور جمہوری زندگی کا پہلے دن ہی سے عادی بنایا جائے تاکہ وہ بڑے ہو کر جمہوری اقدار اور جمہوری معاشرے کے سب سے بڑے محافظ بن جائیں۔

تعلیم کو بجا طور پر ہر ملک میں بلند قومی مقاصد کے حصول کا آلہ خیال کیا جاتا ہے۔ اگر ہم دیانت داری سے اسلامی جمہوریت کے شیدائی ہیں تو ہماری تعلیم کی ایک بے حد اہم غائت یہ ہونی چاہیے کہ بچوں کے دلوں کو اللہ کے سوا باقی ہر قسم کے ڈر سے خالی کر دیا جائے یہ مقصد زبانی اسباق اور کتاب خوانی سے نہیں بلکہ مدرسے میں ایسی عملی زندگی پیدا کرنے سے حاصل ہو سکتا ہے جو اسلامی جمہوریت کی منہ بولتی تصویر ہو، ایسی زندگی جو ہر قسم کے غیر اسلامی رکھ رکھاؤ سے پاک ہو جس میں عجمی ظاہرداری اور برطانوی نجابت پرستی کا شائبہ نہ ہو اور جو بچوں کو بلا روک ٹوک اس بات کی اجازت دے کہ ہر قسم کے فیصلوں میں حصہ لیں اور ان فیصلوں کو عملی شکل دینے میں بڑھ چڑھ کر کام کریں۔

اس ساری بحث میں مرکزی نکتہ یہ رہا ہے کہ جمہوری طور طریقوں میں تربیت دینے کی سب سے اچھی صورت یہ ہے کہ معاملات میں حصہ لینے کے زیادہ سے زیادہ مواقع پیدا کیے جائیں۔ مدرسے کی مجموعی زندگی میں افراد کے لیے اس قسم کے مواقع کم نظر آئیں گے۔ اس کا تدارک طرح طرح کی گروہی دلچسپیاں پیدا کرنے کے لیے کیا جانا چاہیے۔ مدرسے میں کئی جماعتیں ہوں گی جن میں سے ہر ایک بہت سی عملی سرگرمیوں کے لیے ایک اکائی کا درجہ رکھتی ہے۔ لیکن بعض سرگرمیوں کے لیے جماعت بھی ایک بہت بڑی اکائی ہوئی۔ تمام افراد کو پورے طور پر حصہ لینے کے قابل بنانے کے لیے ضروری ہے کہ جماعت مستقل طور پر کئی گروہوں میں بٹی ہو، یہ گروہ اپنی اپنی پسند کے مطابق مختلف غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لیں۔ یہ گروہ کثرت سے مل بیٹھنے۔ مسائل پر غور کرنے اور عملی سرگرمیوں کا انتظام کریں۔ ساری جماعت کے ایک ساتھ مل بیٹھنے اور سارے مدرسے کے جمع

ہونے کے مواقع بھی نکلنے چاہئیں۔ ان تمام سرگرمیوں کا انتظام طلبہ کے ہاتھوں میں ہونا چاہیے
اور سب سے اہم بات یہ کہ صدر معلم، اساتذہ اور طلبہ کے باہمی مراسم از حد قسم کے جمہوری
ہونے چاہئیں۔

بحث کے خاتمہ پر اب یہ کہا جا سکتا ہے کہ جمہوریت کا سبق دینا عین ممکن ہے، لیکن اس
سبق کی کامیابی کا مدار اس بات پر ہے کہ سبق دینے والا خود کس حد تک ہر قسم کے جھوٹے پندار
سے چھٹکارا پا کر دوسروں کو حصہ لینے کا موقع دے سکتا ہے۔ مدرسے میں جمہوری زندگی پیدا کرنے کی
ذمہ داری اگرچہ سارے استادوں پر ہوگی، لیکن اس میں کلیدی کردار ادا کرنا صدر معلم اور دوسرے
نگران حضرات کا فرض ہے۔ بدقسمتی سے صدیوں کی غلامی نے ہمیں یہ روایات ورثہ میں دی ہیں کہ
صدر معلم کی سب سے بڑی کامیابی رعب و داب قائم رکھنا ہے جو دوسروں سے الگ تھلگ رہنے
اور اپنے اور استادوں کے درمیان فاصلہ قائم رکھنے ہی سے قائم رہ سکتا ہے۔ بیشتر صدر معلم اسی
صدری نسخہ پر سختی سے کاربند نظر آئیں گے۔ انہیں یہ معلوم نہیں کہ اپنے جھوٹے پندار کی خاطر وہ کتنے
بڑے قومی ضیاع کا بوجھ اپنی گردن پر لے رہے ہیں۔ ان کی تحکم پسندی استادوں کے بیشتر تخلیقی ولولوں
کو سرد کر کے رکھ دیتی ہے۔ استاد کی مغلوج شخصیت طالب علموں کے کردار میں منعکس ہوتی ہے اور اس طرح
ذہنی غلامی کا وہ چکر ٹوٹنے میں نہیں آتا جس نے کروڑوں انسانوں کی خداداد صلاحیتوں کو نیم مردہ کر رکھا
ہے۔ آج ہماری سب سے بڑی قومی ضرورت یہ ہے کہ قوم کے نونہال ہر طرح کی ذہنی زنجیروں سے آزاد
ہو کر اپنے طور پر سوچنا سیکھیں اور علم و سائنس میں قوم کو ایک باعزت مقام پر لا کھڑا کریں۔ مدرسوں
کے استاد اور بالخصوص انتظامی افسر اس میدان میں اہم خدمت انجام دے سکتے ہیں ×

ابتدائی مدرسہ میں تدریس قرات

ادریس احمد

ابتدائی مدرسے کا کام بنیادی مہارتیں سکھانا ہے تاکہ ان عملی اوزاروں کی مدد سے طالب
آگے چل کر علم حاصل کر سکے۔ ان میں سے پڑھائی کی مہارت کو کلیدی درجہ حاصل ہے۔ ایسے طالب علم
کی تعداد بہت بڑی ہے جو اوپر کی جماعتوں میں پہونچ جاتے ہیں۔ مگر استادوں کو ان کے متعلق یہ معلو
کر کے مایوسی ہوتی ہے کہ ان میں یہ صلاحیت ہی نہیں کہ کسی مضمون کا فہم پیدا کر سکیں۔ ایسے طلبہ کی ا
خاصی تعداد میٹرک کے درجہ تک پہونچ کر بار بار فیل ہونے لگتی ہے۔ ان میں سے جو کسی نہ کسی ط
میٹرک کی چھلنی سے نکل کر کالج تک جا پہونچتے ہیں وہ وہاں جاکر ناکامی کے چکر میں جا پھنستے
والدین کی گاڑھے پسینے کی کمائی ضائع کرتے ہیں۔ ان نوجوانوں میں ایک بڑی تعداد ان کی ہوتی ہے جنہیں ا
تلخ ناکامیوں سے بچایا جا سکتا تھا۔ اگر ابتدائی جماعتوں میں انہیں قرات کی مہارت اچھی طر
سکھائی گئی ہوتی جو پرائمری مدرسے کی سب سے اہم ذمہ داری ہے تو یقیناً وہ مختلف مضا
میں ضروری فہم پیدا کرنے کے قابل ہو جاتے اور ان کی تعلیمی زندگی کامیاب اور خوش گوار ثابت

"خشت اول چوں نہد معمار کج" کا سبق ہم سب کو معلوم ہے۔ لیکن یہ امر حیران کن ہے کہ تع
کے بارے میں ہم نے اس سبق سے کتنی بے پروائی برتی ہے۔ اس بات کا سب کو اقرار ہے ک
پہلے وقتوں میں پرائمری پاس طلبہ لکھائی پڑھائی میں جو استعداد پیدا کر لیا کرتے تھے وہ قابلیت ا
میٹرک پاس میں بھی کم دیکھنے میں آتی ہے۔ اس خیال میں کافی سچائی موجود ہے۔ لیکن تعلیمی معیا
کے اس طرح گرنے کی وجہ کیا ہے۔ وجہ بدیہی طور پر اس کے سوا کچھ نہیں کہ پرانے وقتوں کے اس
اس بات کا پورا اہتمام کرتے تھے کہ بچے پڑھائی لکھائی اور گنتی کی بنیادی مہارتیں پوری طر
سیکھ جائیں۔ گاؤں یا قصبہ میں پرائمری یا مڈل درجہ سے آگے مدرسہ موجود نہ ہوتا تھا اور

مدرسہ بڑی توجہ اور اہمیت کا مرکز ہوتا تھا یہاں پڑھانے والے استادوں کو اپنے کام کی قدروقیمت کا بے حد احساس ہوتا تھا۔ اس احساس کو معاشرتی ماحول سے پورا سہارا ملتا تھا، جماعتوں میں طلبہ کی بھیڑ نہ تھی، یہ تمام باتیں اکٹھی مل کر بنیادی مہارتوں کی تدریس کو بے حد مؤثر بناتی تھیں پرائمری پاس طالب علم نہ صرف ہر طرح کی خط وکتابت کے قابل ہوتا تھا۔ بلکہ گلستان۔ بوستان اور اس قسم کی فارسی کلاسیکی کتابوں کو بھی پڑھ سکتا تھا۔

حالات کے بدلنے سے اس نقشے کو پورے طور پر بدل دیا ہے آج قصبوں کو چھوڑ دیہات میں بھی ہائی اسکول موجود ہیں۔ عام صورتوں میں توجہ کے مرکز اب پرائمری مدرسے نہیں بلکہ ہائی اسکول ہیں، اس کی وجہ بڑی حد تک معاشی ہے۔ بازار میں قیمت اردو کی نہیں انگریزی کی پڑتی ہے اور انگریزی پڑھانے کا شرف ہائی اسکولوں کو ہے۔ عام والدین پرائمری کی تعلیم کو چنداں اہمیت نہیں دیتے۔ پرائمری مدرس کی معاشرتی اہمیت بھی اسی نسبت سے کم ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ جماعتوں میں بے پناہ بھیڑ ہے، ان تمام اسباب کا مجموعی نتیجہ یہ ہے کہ بنیادی مہارتوں کی تدریس کو وہ توجہ نہیں ملتی جو پہلے ملا کرتی تھی۔ ظاہر ہے کہ اچھے اوزاروں کے بغیر کوئی کاریگر اچھا کام نہیں کر سکتا۔ چوں کہ ایسے طلبہ کی تعداد دن بدن بڑھتی جا رہی ہے جنہیں پرائمری جماعتوں میں بنیادی لسانی مہارتیں ضروری حد تک نہیں سکھائی جاتیں، اس لیے اوپر کے درجوں پر معیاروں کا گرنا تیزی سے جاری ہے۔

بعض سائنسی حقائق

تعلیمی سہولتوں کی توسیع یعنی اعلیٰ مدرسوں اور دوسرے اعلیٰ تعلیمی اداروں کا کھلنا اور تعداد طلبہ کا بڑھنا بہت اچھی چیزیں ہیں اس لیے انہیں بنیادی مہارتوں کی مؤثر تدریس میں حائل نہ ہونا چاہیے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں بھی کبھی حالات یہی تھی کہ میلوں تک پرائمری مدرسے کے علاوہ اور کوئی تعلیمی ادارہ نہ تھا اور پڑھنے والوں کی تعداد کم تھی۔ حالات کے بدلنے کے ساتھ پرائمری مدرسے کا مقام بھی پہلا سا رہا لیکن ترقی یافتہ ملکوں میں بدلے ہوئے حالات کا ساتھ

دینے کے لیے تحقیق و مطالعہ کے نتائج سے رہنمائی حاصل کی جاتی ہے۔ ہمارے یہاں یہ کام بالکل مفقود ہے۔ نیچے بعض ایسے سائنسی حقائق کا ذکر کیا جاتا ہے جو تدریس قراءت کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں

دوسرے مضامین کی مدد

قراءت کی تدریس میں یہ نکتہ اہم ہے کہ اس کی کامیابی کا انحصار سبقوں کی تعداد پر نہیں پڑھائی میں مہارت پیدا کرنے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ قاعدے یا کتاب میں سبقوں کی تعداد زیادہ ہو۔ الفاظ و ہجا کی ضروری شناخت کے بعد زیادہ فائدہ بخش چیز یہ ہے کہ اس مختصر ذخیرہ الفاظ کو بار بار مختلف فقروں اور نباوٹوں میں دیکھا جائے۔ تجرباتی شہادت نے یہ بات واضح کر دکھائی ہے کہ عین ممکن ہے کہ ایک طالب علم پڑھائی سیکھنے کے بعد کئی ایک قاعدے پڑھ لے اور پھر بھی قراءت میں کوئی قابل ذکر مہارت پیدا نہ کر سکے، وجہ یہ کہ عام قاعدوں میں تقریباً ایک ہی قسم کا مواد دیا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اگر طالب علم محدود ذخیرہ الفاظ سے تعارف کے بعد دوسرے مضامین کی کتابیں بھی پڑھنے لگے اور زندگی کے حقیقی تجربوں میں حصہ لینے لگے تو اس سے قراءت کی مہارت کو بہت مدد ملے گی کیوں کہ اس طرح خود بخود ذخیرہ الفاظ میں اضافہ ہونے لگے گا۔ یہاں یہ وضاحت کر دی جائے کہ حقیقی تجربوں میں حصہ لینے کا یہ مطلب نہیں کہ بچہ خود کسی کام میں شریک ہو۔ بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ اس نے کسی چیز کو دیکھا ہوا اور توجہ سے سنا ہوا اور اس کے اہم حصوں کو مرکز توجہ بنایا ہو، یہ عین ممکن ہے کہ کوئی چیز بچوں کی آنکھوں کے سامنے ظہور پذیر ہو اور وہ اس کو کوئی توجہ نہ دیں۔ ایسی چیز ان کے تجربے کا جزو نہیں بنے گی۔

قراءت اور دستکاری

قراءت فی الحقیقت بذات خود مطلوب نہیں۔ بلکہ اس کی حیثیت ایک آلے کی ہے جس کی مدد سے کچھ اور چیز حاصل کی جائے گی۔ مدرسے میں دوسرے مضامین سیکھنے کے لیے قراءت کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اس آلے کو دوسرے مضامین کی خدمت میں استعمال کرنے سے خود قراءت کو فائدہ پہونچتا ہے۔ مثال کے طور پر دستکاری کے ایک سبق سے بڑی آسانی کے ساتھ قراءت کے

سبق کا کام لیا جا سکتا ہے۔ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ کام شروع کرنے سے پہلے بچوں کو نہایت آسان لفظوں میں لکھی ہوئی ہدایات تقسیم کردی جائیں۔ وہ ان کو پڑھیں گے اور پڑھ کر ان پر عمل کریں گے۔ مطالبہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ ہدایات کو غور سے پڑھیں اور ان پر سختی سے عمل کریں اس طور پر وہ جو ماڈل تیار کریں گے وہ ان کے لیے بڑی خوشی کا سامان مہیا کرے گا۔ اسی طور پہ خط کشی کا سبق بھی دیا جا سکتا ہے۔

ایک اور صورت جو کامیابی کے ساتھ استعمال کی گئی ہے یہ ہے کہ بچوں سے کہا جائے کہ اخباروں اور رسالوں سے مختلف تصویریں کاٹ کر جمع کریں۔ مثلاً موٹر کاروں۔ بوٹوں۔ جرابوں قلموں اور صابن وغیرہ کی تصویریں۔ وہ ان تصویروں کو کاپیوں پر چسپاں کریں اور ہر تصویر کے نیچے چند الفاظ درج کریں مثلاً اس صابن سے ابا نہاتے ہیں۔ یہ بوٹ نکھے کے ہیں۔ واہ۔ کیا اچھا قلم ہے وغیرہ وغیرہ۔

دل چسپی کا قائم رکھنا

ابتدائی جماعتوں کے بچے عموماً زیادہ دیر تک کسی چیز میں دل چسپی قائم نہیں رکھ سکتے ایک چیز میں تھوڑی دیر مصروف رہنے کے بعد وہ چاہتے ہیں کہ کسی نئی چیز کو دیکھیں۔ ان کی توجہ قائم رکھنے کے لیے ایک استاد نے یہ تدبیر کی کہ بچوں سے کہا دیکھو یہ اللہ بخش پھل بیچنے والے کی تصویر ہے، ہر موسم میں وہ جو جو پھل بیچتا ہے ان کی تصویریں جمع کرو۔ بچوں نے بڑی محنت سے یہ تصویریں جمع کیں۔ اب ان سے کہا گیا کہ دیکھو۔ گرمیوں۔ سردیوں۔ برسات اور بہار کے موسموں میں اللہ بخش کی دوکان سجاؤ۔ اور چاروں حالتوں میں دکان کے نیچے چند سطریں لکھو جن میں پھلوں کے نام اور ان کے نرخ بتائے گئے ہوں۔ اس طور پر ایک ہی موضوع میں کئی دنوں تک دل چسپی باقی رہی۔ اس کام سے بڑا فائدہ قراءت کی مہارت کو پہونچا۔ بچے اپنی تیار کردہ کتابوں کو بار بار پڑھتے تھے اور اپنے اس کارنامے پر پھولے نہ سماتے تھے، وہ اپنی تصنیف والدین اور دوسرے لوگوں کو دکھاتے اور پڑھ کر سناتے تھے۔

پتلیوں کا تماشہ

ایک برطانوی استاد نے قراءت سکھانے کے ضمن میں پتلیوں کے تماشے سے کام لیا پتلیاں تیار کرنا اور انہیں مناسب لباس پہنانا خاصہ مشکل کام ہے، جسے بچے خود نہ کر سکتے تھے یہ کام زیادہ تر استاد نے خود کیا۔ آخر ایک شام تماشہ دکھانے کے لیے مقرر ہوئی۔ تماشائی صنف مدرسے کے بچے اور چند استاد تھے۔ پتلیوں کو نچانے والے بچے پردے کے پیچھے تھے۔ یہی بچے پتلیوں کی زبانی ہر بات بلند آواز سے کہتے تھے۔ اکثر بات چیت مضحکہ خیز۔ حد تک غیر حسب حال تھی۔ یہ تماشہ جاری تھا کہ انسپکٹر مدارس تماشائیوں میں آ بیٹھے۔ استاد نے معذرت کی کہ یہ تماشہ کامیاب نہیں ہے۔ مگر انسپکٹر نے مسکرا کر کہا کہ بچوں کی ناکام کوشش بھی دیکھنے کے قابل ہوا کرتی ہے۔ پردے کے پیچھے بچے بے تحاشہ شور مچاتے تھے، استاد نے کہا یہ سب کے سب وہ بچے ہیں جو جماعت میں بے حد شرمیلے اور خاموش ہیں۔ انسپکٹر نے کہا ٹھیک ہے، یہ ان کے بولنے کا موقع ہے۔ تماشہ ختم ہونے پر انسپکٹر نے بچوں سے بات چیت کی۔ استاد بہت خوش ہوئے کہ بچوں نے اس بات چیت میں بڑی ہوش مندی کا ثبوت دیا۔ کچھ دنوں بعد انسپکٹر کی طرف سے جماعت کو ایک کتاب موصول ہوئی۔ اس کتاب میں پتلیوں کے تماشوں کی تصویریں تھیں۔ اور تصویروں کے نیچے ہر کرتب کا حال درج تھا۔ بچے بڑے خوش ہوئے اور کہنے لگے ہماری پتلیاں بالکل بھدی تھیں۔ اگلی بار ہم بھی اس طرح کی خوبصورت پتلیاں بنائیں گے۔

یہ واقعہ بچوں کے لیے بہت سبق آموز تجربہ ثابت ہوا۔ انسپکٹر صاحب کی ارسال کردہ کتاب کو بچوں نے بڑے شوق سے پڑھا۔ اس کے بعض حصے استاد نے پڑھ کر سمجھائے، اس سے نہ صرف ان کے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ ہوا۔ بلکہ نقطہ نگاہ میں بھی کشادگی پیدا ہوئی۔ ہر بچہ یہ محسوس کرتا تھا کہ اسے یہ کتاب پڑھنی اور سمجھنی چاہیے۔ یہ زندگی کے حقیقی تجربہ کی صرف ایک مثال ہے۔ ہر استاد اپنے ماحول اور ضروریات کے مطابق حقیقی تجربے پیدا کر سکتا ہے۔

اس قسم کے اجتماعی تجربوں میں ضبط کا سوال کافی اہم ہے۔ مثلاً پتلیوں کے تماشے میں

یہ بھی ہو سکتا تھا کہ تماشہ دیکھنے والے بالکل قابو سے باہر ہو جاتے وہ اپنے خام کار ساتھیوں کی ہنسانے والی حرکتوں سے ایسے بے خود ہو جاتے کہ ضبط کا قائم رہنا محال ہو جاتا۔ چھوٹے بچوں کو ضبط کا عادی بنانے کے لیے خاص احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس کی آسان صورت یہ ہے کہ انہیں مختصر مگر تیز لہجہ میں دیے گئے احکام کی بجا آوری کا عادی بنایا جائے، یہ کام جسمانی تربیت کے ضمن میں ہو سکتا ہے۔ اجتماعی سرگرمیوں میں جہاں ذرا بھی کھٹکا پیدا ہو کہ طلبہ بے خود ہو جائیں گے۔ استاد کا ایک مختصر سا حکم فوراً ان میں ذمہ داری کا احساس پیدا کر دے گا۔

ضبط کے بارے میں ترقی پسند خیال یہ ہے کہ ضبط نفس ہی بہترین قسم کا ضبط ہے اور آغاز مدرسہ سے بچے کو اس کا عادی بنانا چاہیے۔ یہ بات بالکل درست ہے۔ لیکن عملی تجربہ اس بات کا گواہ ہے کہ چھوٹے بچوں کو بعض اوقات خطرے کے وقت بھی فوری طور پر منظم حرکات پر آمادہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کا موثر حل یہی ہے کہ انہیں ایسے مختصر احکام کا عادی بنایا جائے جن کے سنتے ہی ان کے بدنی اعضا نظم و ترتیب کے ماتحت آجائیں۔ تجرباتی شہادت یہ ہے کہ بچے اس قسم کی منظم اجتماعی زندگی سے حقیقی طور پر لطف اندوز ہوتے ہیں۔ بے نظمی کی افراتفری ذہنی پریشانی پیدا کرتی ہے اس کے مقابلے میں نظم و ترتیب کا اطمینان بخش سکون دلی طمانیت اور ذاتی بلندی کا احساس پیدا کرتا ہے۔

خاتمہ کلام

اوپر کے مباحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بنیادی لسانی مہارتوں کی تدریس میں ابتدائی مدرسے کی بڑھتی ہوئی ناکامی کا بڑا سبب یہ ہے کہ حالات میں بہت بڑا انقلاب آچکا ہے۔ مگر استادوں کے نقطہ نگاہ میں وہ تبدیلی نہیں آئی جو بدلے ہوئے حالات کا ساتھ دے سکے۔ بدلے ہوئے معاشرتی حالات کی مناسبت سے بچے انہی حقیقی تجربوں سے لسانی مہارت اخذ کر سکتے ہیں، جو موجودہ معاشرتی فضا سے ہم آہنگ ہوں آج بچوں سے یہ توقع رکھنا عبث ہے کہ وہ گلستان سعدی یا اس قسم کی دوسری کتابوں کو اس شوق سے پڑھیں گے جس شوق سے برطانوی بچوں نے پتلیوں کے متعلق کتاب پڑھی۔ بچوں کے شوق کا انحصار بالغوں کی عام دلچسپیوں اور گرد و پیش کی ذہنی فضا پر

ہوا کرتا ہے جس معاشرے میں سینما، ریڈیو، اور اس قسم کی دوسری تفریحیں بالغوں کی دل لگی کا واحد سہارا ہوں وہاں تعلیم کو بھی چار و ناچار اسی نوعیت کی امدادوں سے کام لینا چاہیے۔

تعلیم کے ہر میدان اور ہر سطح پر اہم ترین چیز سیکھنے والے کی اپنی کوشش رہی ہے۔ وہ جس انہماک کے ساتھ تعلم کے عمل میں شریک ہوگا، اسی قدر اس عمل کے نتائج تسلی بخش ثابت ہوں گے متعلم کا اشتراکِ عمل حاصل کرنے کے لیے استاد کو ہر اس چیز سے مدد لینی چاہیے جو اس کی توجہ کو کھینچ سکے۔ ہم اس وقت ایک ہمہ گیر معاشرتی انقلاب کے شکنجے میں ہیں، ایسے دور میں یہ امر خصوصیت سے ضروری ہو جاتا ہے کہ تعلیمی امدادوں کی موزونیت پر لگاتار تنقیدی نگاہ پڑتی رہے اور تدریس کی تاثیر بڑھانے کے لیے ایسی امدادوں سے کام لیا جائے جو کامیاب تجربے کی سند لیے ہوئے ہوں۔

برطانیہ کے تعلیمی مسائل

(بہ شکریہ بی۔ بی سی۔ لندن)

محمد عبد العزیز

پاکستان تعلیمی لحاظ سے دوسرے ترقی یافتہ ملکوں سے اتنا پیچھے ہے کہ ہم اکثر اپنی نجی مجلسوں میں بھی اپنی تعلیمی ضروریات کے متعلق گفتگو کرتے رہتے ہیں اور اس میں کہنے یا سننے والے کو بالکل حیرت نہیں ہوتی، اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس وقت تک ہم قوم کے سامنے تعلیم کا کوئی واضح پروگرام پیش نہیں کر سکے۔ لیکن اگر بحث کا موضوع برطانیہ کے تعلیمی مسائل ہو تو اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں ہمیں قدرے تامل ضرور ہوگا۔ اس لیے نہیں کہ تعلیم میں ترقی کی گنجائش نہیں بلکہ اس لیے کہ جو نظامِ تعلیم اس وقت ہمارے ملک میں رائج ہے وہ تمام تر اس نظام کی پرچھائیں ہے اور اسے ہم اپنی ترقی کی شاہراہ میں روشنی کا ایسا مینار سمجھتے ہیں جو ہمارے تاریک ماحول کو منور کرتا رہتا ہے، اس لیے اس پر جو تنقید کی جائے گی وہ ہمیں ایک مرتبہ چونکا ضرور دے گی۔

موجودہ برطانوی نظامِ تعلیم اگرچہ صدیوں کی شکست و ریخت کا نتیجہ ہے مگر اس میں بعض ایسی بنیادی خامیاں موجود ہیں جو طلبہ کو طبقوں اور گروہوں میں تقسیم کر دیتی ہیں، اگرچہ یہ تقسیم نفسیاتی لحاظ سے ذہنی سطح کی بلندی اور پستی پر قائم کی جاتی ہے، لیکن اس حد بندی سے سماجی زندگی کے جو دھارے پھوٹتے ہیں ان کی راہیں الگ الگ ہو جاتی ہیں۔ گیارہ سال کی عمر تک ہر بچہ ابتدائی مدرسہ میں تعلیم پاتا ہے، اس کے بعد ہر مقامی تعلیمی حکومت میں ایک انتخابی امتحان ہوتا ہے جو بچوں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ ذہین اور ہونہار بچے گرامر اسکول میں اور نسبتاً کم ذہین دوسرے مدارس میں۔

پبلک اسکولوں سے قطع نظر اس وقت اس ملک میں چار قسم کے ثانوی مدارس موجود ہیں جو اپنے نصاب، طریقِ تدریس اور نظام کار میں بالکل آزاد اور بعض حالات میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں ان میں گرامر اسکول خالص تعلیمی مدارس ہیں۔ ثانوی جدید مدارس کی اساس اگرچہ تعلیمی ہے۔ لیکن ان کے

نصاب میں پیشہ ورانہ اور فنی تعلیم بھی شامل ہے۔ ٹیکنیکل اسکولوں میں فنی مضامین کی تدریس اور عملی تربیت کو خاص مقام حاصل ہے۔ کثیر الاضلاع مدارس البتہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے جداگانہ حیثیت کے مالک ہیں۔

کچھ عرصے سے ثانوی تعلیم کو ایک نہج پر لانے کے لیے بحث و تمحیص کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے وہ سیاسی زیادہ اور تعلیمی کم ہے۔ اس لیے اس بحث میں ماہرین تعلیم کے علاوہ سیاست دان اور صناع بھی شامل ہیں۔ ان میں سے ہر شخص اور ہر گروہ کا زاویہ نگاہ جدا اور طریق فکر مختلف ہے۔ ایک گروہ اگر پبلک اسکولوں کے حق میں ہے تو دوسرا کثیر الاضلاع مدارس کا حامی۔ ایک گرامر اسکولوں کو قوم کی ذہنی، سماجی، اخلاقی، اور سیاسی تعمیر و تاسیس کے لیے ضروری سمجھتا ہے تو دوسرا جدید ثانوی مدارس کو قومی ترقی کا زینہ تصور کرتا ہے۔ انہی حالات کے پیش نظر ایک تعلیمی اجلاس میں ڈاکٹر اکونڈر نے گرامر اسکولوں کو ذہنی اعتبار سے ۵ فی صد بہترین طلبہ کے لیے مخصوص کرنے کی تجویز پیش کی ہے۔ غرض بھانت بھانت کی باتیں ہیں اور طرح طرح کے نظریات جن میں سے بعض ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں لیکن دراصل تجدد و تعمیر کی اس خواہش میں جو جذبات کارفرما ہیں انہیں انگریزی مزاج کی ترکیب خاص سے علاحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ انگریز قدامت پرست بھی ہے اور شدید تجدد بھی۔ وہ اپنی پرانی روایات کی پرستش کرتا ہے لیکن جدید رجحانات سے آنکھیں بند کرنا ان کا شعار نہیں، وہ ایک نگینے کو دیکھتا ہے پرکھتا ہے اور جو اسے کھرا معلوم ہوتا ہے اسے اپنی قبا میں ٹانک لیتا ہے۔ اس لیے ان مختلف نظریات کو سوچنے والوں کی بدنیتی پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں سے ہر گروہ بہ صدق دل اپنے تعلیمی نظام میں انقلاب کا نہیں جدید تقاضوں کے مطابق تغیر کا خواہش مند ہے تاکہ ان اداروں میں بچوں کو ایسی تربیت مل سکے جس سے دنیا کی موجودہ سیاسی اور اقتصادی کش مکش میں برطانیہ کی قومی ساکھ قائم رہ سکے یا پروفیسر لارڈ ریڈ کے الفاظ میں اسے یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ موجودہ جغرافیائی ضروریات کے مطابق ہمیں اپنی تعلیم کو نیا مفہوم دینا ہوگا۔"

یہاں اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انگریزوں کی قومی ہیئت ترکیبی اور موجودہ سیاسی اور

اقتصادی ضروریات کے پیش نظر کیا ان مختلف اداروں کو اسی طرح جاری رکھا جائے یا ان میں معیارِ تعلیم اور طریق تدریس کی یکسانیت پیدا کر دی جائے۔ سیاست دانوں کا ایک گروہ انہیں ایک تعلیمی اور ثقافتی وحدت میں مدغم کر کے ملک میں ایک ہی قسم کے کثیر المقاصد ادارے قائم کرنے کی کوشش میں ہے اور دوسرا گروہ اپنے اسی روایاتی نظام کو خیر و برکت کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ بہر طور اس وقت برطانیہ کے تعلیمی مسائل ارباب رائے کی ذہنی قطع و برید کی منزل سے گزر رہے ہیں۔ کتنے ہیں پانی گدلا ہے اسے چھانو۔ دیکھیں اس صاف ستھرے پانی میں تعلیمی اداروں کی نئی صورت کیسی نظر آتی ہے ؎

بچہ اور اس کا ماحول

ایم۔ نواز چودھری

بعض اہلِ علم حضرات کا خیال ہے کہ بچے کی شخصیت اور کردار میں طرزِ تعلیم کا بنیادی طور پر کچھ اثر نہیں ہوتا بلکہ یہ چیزیں پیدائشی اور موروثی ہوتی ہیں۔ ایک مکتبِ خیال کا گروہ ان سے بھی چند قدم آگے ہے۔ ان کے نزدیک والدین اپنے سب جسمانی اور ذہنی خواص اولاد میں پیدا کر دیتے ہیں اور اپنے تعلیمی تجربات اور رجحانات بھی ایک ورثے کی مانند انہیں دے جاتے ہیں۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ حقیقت اس سے کہیں دور ہے۔ تجربہ ثابت کرتا ہے کہ ایک عام سا صحت مند دماغ اور جسم بغیر محنت کے عظمت و سربلندی حاصل نہیں کر سکتا۔

تعلیم گھر پر ہو یا سکول میں اس کا اہم اور اولین مقصد بچوں میں تجسس کا جذبہ پیدا کرنا ہے بقول رچرڈ سٹیل گہوارہ بچے کی پہلی درس گاہ ہوتی ہے۔ ابتدائی عمر میں گھر کا ماحول بچے کے اوصاف اور کردار پر بہت اثر انداز ہوتا ہے۔ بے ہنگم اور بے ترتیب قسم کا ایک گھر بچوں میں اوصاف حمیدہ ہرگز پیدا نہیں کر سکتا۔ لیکن اس سے یہ بھی نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ اچھے خوش گوار ماحول کا تعلق دولت سے ہے۔ ہر عظیم شخصیت متمول گھرانوں کی پیداوار نہیں ہوتی۔ اکثر مشاہیر معمولی اوسط درجے کے خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے جیسے مثلاً کولمبس کا باپ ایک جولاہا تھا۔ لوئیس پاسٹر ایک نہایت معمولی گھر سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا باپ چمڑا رنگنے کا کام کرتا تھا۔ شیکسپیر کا باپ ایک قصاب تھا اور اس کی والدہ جاہل مطلق تھی۔ تھامس ایڈیسن نے اوائل عمر ہی میں تعلیم چھوڑ کر ملازمت اختیار کر لی۔ اس کے گھر کے حالات کچھ ایسے تھے لیکن اس نے ہمت نہ ہاری برابر محنت کرتا رہا۔ چنانچہ اس میں چند ایک خود پیدا کردہ صفات نے اسے مجبور کیا کہ وہ سائنس کی دنیا کی طرف رجوع کر کے اپنی قابلیتوں کو اجاگر کرے۔ اور اس طرح ہم بے شمار مثالیں پیش کر سکتے ہیں۔ جہاں معمولی گھرانے کے لوگوں نے نقش ابھی

ت اور جفاکشی کی وجہ سے دنیا میں شہرت اور ناموری حاصل کی۔ ہاں یہ بھی ٹھیک ہے کہ
ن ناموراشخاص نے ایسے ماحول اور گردوپیش میں آنکھیں کھولیں جہاں انہیں ہر قسم کی سہولتیں
اسباب مہیا تھے۔ بڑے بڑے ادیبوں سیاست دانوں اور مفکروں نے جو ایک ہمہ گیر شخصیت
ظہار کرتے ہیں اپنے خیالات اور نظریات روزمرہ زندگی کے تجربوں سے حاصل کیے۔

باہمی میل ملاپ اور رابطے سے انسانی کردار میں اچھے اوصاف اور خیالات کی نشوونما
ہے۔ ایسے بچے جن کا گھریلو ماحول انتہائی نامناسب اکتا دینے والا اور ناخوشگوار ہو
سے باہر اس کی تلافی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک مسلسل بے چینی اور گھٹن ان کے مزاج
حصہ بن جاتی ہے۔

حال ہی میں سرسرل برٹ نے برطانیہ میں مختلف جرائم کی وجوہات کی تحقیق کرتے ہوئے
بچے کے لیے گھر سے باہر کی فضا خواہ کیسی ہی اچھی ہو۔ گھر کے مقابلے میں بہت کم اہمیت رکھتی ہے
اتی پستی اور دیگر بری عادات غربت و افلاس میں جلدی نشوونما پاتی ہیں لیکن پھر بھی بچے
اس کے والدین کے باہمی تعلقات سب سے زیادہ توجہ طلب ہوتے ہیں۔

وہ والدین جو بچوں کی نفسیات کو سمجھتے اور ان کے ذہنی تقاضوں کو پورا کرنے کی اہلیت
تے ہیں انہیں لوئیس تھروپ کے ان الفاظ کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔

"یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ بچہ محبت، شفقت، حوصلہ افزائی، خیالات اور جذبات کی تکمیل اور
ی قوتوں اور ارادوں کا اظہار چاہتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ بچہ اگر ناشائستگی اور بداخلاقی
ظاہرہ کرتا ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کے جائز حقوق اور مطالبوں کو بلا وجہ پورا
ں کیا گیا اور اس کی ذمہ داری والدین پر عاید ہوتی ہے۔

بچے کے احساسات کو سمجھنا اور اس کا اعتماد حاصل کرنا سب والدین کا فرض ہے۔ اکثر بچے
چھوٹی چھوٹی اتفاقیہ غلطیوں کو والدین کے سامنے بیان کرنے سے گھبراتے ہیں محض اس
ل سے کہ انہیں پتہ نہیں کیا سزا ملے لہذا ایک گھٹن اور مجرمانہ احساس میں مبتلا ہو جاتے ہیں

ڈاکٹر سپٹز کا خیال ہے چھوٹے بچوں کی خرابیٔ صحت کی وجہ ان کی طرف بے توجہی اور محبت وپیار کی کمی ہوتی ہے۔ جو بچے ماں باپ کی شفقت سے محروم رہے ہوں وہ غلط رجحانات کے لیے زیادہ جلدی مائل ہوتے ہیں بجائے ان کے جنہوں نے پیار کی کوئی کمی یا تشنگی محسوس نہ کی ہو۔ ایسے میاں بیوی جن کی ازدواجی زندگی تلخ رہی ہو، ان کے بچے ہر قسم کے ذہنی اور اعصابی انتشار کا شکار ہو جاتے ہیں، ان کا میلان طبع جرائم اور آوارگی کی طرف زیادہ ہوتا ہے۔

بچوں کی پریشانیوں اور الجھنوں میں اضافے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ والدین ہر بچے سے امتحانات میں غیر معمولی قابلیت اور محنت کی توقع رکھتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ بعض حالات میں اسکول کا درجہ نصاب اور طرز تعلیم بچے کے لیے مشکل پیدا کرتا ہے، کئی بچے حساب الجبرا اور اس قسم کے مشکل مضامین سے پریشان اور پڑھائی سے دل برداشتہ ہو جاتے ہیں، کیوں کہ انہیں مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ ان مضامین کو ایک خاص معیار اور سطح پر تیار کریں۔ ایسے بچے جو اپنے والدین کے قائم کردہ تصوراتی معیار پر پورے نہ اتر سکیں ایک احساس کمتری اور عدم خود اعتمادی کا شکار ہو جاتے ہیں، ان میں ہمت اور استقلال جو ایک کامیاب شخصیت کی تعمیر میں بنیادی عناصر ہیں بالکل ختم ہو جاتے ہیں، یہی نہیں بعض ایسے بچے جو کسی فن میں ایک خاص معیار سے اوپر ہوں اپنی کم مائیگی اور کم ہمتی کے احساس میں مبتلا ہو جاتے ہیں کیوں کہ وہ اپنے آپ کو اس معیار پر پورا نہیں پاتے جو کہ ان کے والدین نے تعین کیا ہوتا ہے۔ ایسے لوگ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ بچے کی ذہانت کو پرکھنے کے لیے اس کی ذہنی زندگی کی مدت کو مدنظر رکھنا چاہیے۔ مثلاً ایک لڑکے کے متعلق استاد کی رائے یہ ہے کہ وہ ہر امتحان میں پاس ہے، عادات واطوار تسلی بخش ہیں خیالات صحت مند ہیں وغیرہ۔ لیکن پھر بھی والد یہ شکایت کرتا ہے کہ "صاحب حساب میں ۵۵ نمبر اور انگریزی میں ۴۶ نمبر لینا کونسی قابلیت کا ثبوت ہے، وہ خود رات کو اسے پڑھاتا ہے لیکن بچہ بجائے کچھ رو بہ ترقی ہونے کے دن بدن کند ذہن ہو رہا ہے اور اکثر پڑھتے پڑھتے اس کے آنسو نکل آتے ہیں۔" والدین کا بچوں کو گھر پر پڑھانا ٹھیک ہے، لیکن انہیں پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ

کہ بچے سے اس کی عمر کے مطابق ترقی اور اصلاح کی توقع کی جاسکتی ہے اور دوسرے بچوں سے موازنہ کرتے میں بھی ان کے باہمی ذہنی معیار کو دیکھا جائے سمجھدار والدین کبھی اپنے بچوں کو اس حد تک نہیں لاتے کہ ان کے درمیان آپس میں اجنبیت اور تلخی پیدا ہو جائے ۔ بچہ ایک ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے ۔ مثلاً ایک لڑکے کو بار بار نالائق اور کند ذہن کہا جائے محض اس لیے کہ اس نے تقسیم کا ایک سوال پہلی کوشش میں حل نہیں کیا تو یہ طریق کار غلط ہے ۔ اسے نہایت پیار سے دوبارہ سمجھانا چاہیے ، بچے ڈر کی بجائے پیار سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں ، بچے کو ضبط و نظم سکھانے سے پیشتر والدین کو خود یہ بات جاننی چاہیے کہ بچہ اپنی محدود ہمت اور اہلیت کے مطابق سمجھتا اور اسی رفتار سے ترقی کرتا ہے ۔

بعض والدین اس بات کا بڑا خیال رکھتے ہیں کہ ان کے بچے کیسے ساتھیوں کے ساتھ کھیلتے اور وقت گذارتے ہیں ، بچوں کو خود بڑی ہدایات جاری کی جاتی ہیں کہ فلاں فلاں لڑکے کے ساتھ میل جول نہ رکھو ۔ آسٹریلیا کے ایک اسکول میں ایک عورت کی طرف سے اس موضوع سے متعلق ایک خط موصول ہوا کہ ماسٹر صاحب اس بات کا خاص خیال رکھیں کہ ان کا لڑکا ٹام اپنے ہم جماعت ہنری اور براؤن کی صحبت سے دور رہے ، کیوں کہ وہ بہت بُرے لڑکے ہیں اور ان کا بیٹا نہایت اچھے ماحول کا پروردہ ہے " ۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ ٹام خود کسی لحاظ سے بھی ہنری اور براؤن سے ایک درجہ بھی کم نہ تھا بلکہ ہر شرارت میں پیش پیش رہتا ۔ ایسے لوگ جو اپنے بچوں کو نہایت معصوم اور دوسروں کو آوارہ گردانتے ہوں ایک خود فریبی کا شکار ہوتے ہیں ، کیوں کہ یہ ایک امر مسلمہ ہے کہ جو بچے مہذب اور متحمدانہ ماحول کی پیداوار ہوں شرارتی اور آوارہ مزاج لڑکوں کی ترغیب اور ورغلانے میں بہت کم آتے ہیں ۔ خصوصاً جب ان پر واضح ہو کہ ان کے ساتھی جس بات پر انہیں اکسا رہے ہیں وہ کتنی بے ہودہ اور لغو بات ہے ۔

والدین کو بچوں کی نفسیات کے ابتدائی* اصولوں سے ضرور باخبر ہونا چاہیے اور موجودہ طرز تعلیم و تربیت میں استاد اور والدین کا اتحاد اور تعاون لازمی ہے ۔ کلاڈیو بل اپنی کتاب

"تمدن" میں لکھتے ہیں کہ استاد کا فرض ہے کہ وہ بچوں کو احساس دلائے کہ اگرچہ زندگی میں ہر ایک کو اقتصادی آسائشیں زیادہ میسر نہیں آتیں، اس کے باوجود بھی زندگی گوناگوں مسرتوں اور راحتوں سے بھرپور ہے۔ زندگی صرف زر و سیم کا پیمانہ نہیں کچھ بلند مقاصد کی حامل ہے۔ علم ایک لازوال دولت ہے اور حصول علم کی خواہش سب سے مقدم خواہش ہے۔ تر و تازہ ذہن اور فتحمندانہ خیالات کے ساتھ کتابوں سے آراستہ ایک کمرے میں بیٹھ کر پڑھنا ریس دیکھنے اور گھوڑے خریدنے سے بدرجہا بہتر ہے۔ اگر ایک استاد بچوں کو اس حقیقت کا قائل کر دے تو میں سمجھتا ہوں کہ اس نے انسانیت کا بنیادی مسئلہ حل کر دیا ہے، میں اس مسئلے کو حل نہیں کر سکتا۔ لیکن میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ لوگ جنہیں لازوال مسرتوں کے راز کا علم ہے وہی ہیں جو علم و فن کے قدردان ہیں اور اس سے وہ علم و تمدن میں اضافہ کرتے ہیں"۔

جغرافیائی نمائش گاہ

فرحت اللہ

جب سے تعلیمی نظریوں میں طلبا کی جبلیاتی اور نفسیاتی نشوونما کو مدنظر رکھتے ہوئے عملی طریقۂ تعلیم کی اہمیت بڑھتی جارہی ہے۔ ہر اسکول میں جغرافیائی نمائش گاہ کا قیام اشد ضروری سمجھا جانے لگا ہے۔ جغرافیائی نمائش گاہ یا عجائب گھر جس کے قیام میں طلبا اور معلم برابر کا حصہ لیتے ہیں اور اپنے جغرافیائی ماحول سے دیرپا اور صحیح لگاؤ کا مظاہرہ کرتے ہیں نتیجے اپنے فرصت کے لمحات ماحول میں دلچسپ اور عجیب وغریب اشیا کے دیکھنے اور جمع کرنے میں صرف کرتے ہیں جو آئندہ اسکول کے کمرے میں ماحول کے مطالعہ اور مقامی جغرافیہ کی جیتی جاگتی تصویر نظر آتے ہیں۔ اس طرح بچوں کے مطالعے جغرافیائی ماحول سے مربوط ہو جاتے ہیں اور زندگی کے حقائق اور بچے کی بڑھتی ہوئی معلومات میں ایک عملی استوار رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ طلبہ میں بچپن ہی سے جبلت ذخیرہ اندوزی اور جذبۂ تجسس موجود ہوتا ہے۔

عجائب گھر کے لیے چیزیں جمع کرنے سے بچے کو ان جبلی تقاضوں کے اظہار کا موقع ملتا ہے۔ ان اشیاء سے بچہ روشناس نہ ہوا ہو، اُن کی معلومات کی کمی پوری ہو جاتی ہے۔

ہمارے اسکول اور عجائب گھر۔

پاکستان ایک زرعی ملک ہے۔ جہاں آبادی کا بیشتر حصہ قصبوں اور گاؤں میں رہتا ہے۔ تعلیمی نقطۂ نظر سے شہروں کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ پاکستان کے اسکولوں کو اگر سطحی طور سے دیکھا جائے تو وہ آسانی سے مندرجہ ذیل اقسام میں منقسم نظر آتے ہیں۔

(۱) شہری اسکول جس میں ہائی اسکول، نارمل اسکول۔ پبلک اسکول اور ٹیکنیکل اسکول شامل

(۲) قصبات اور گاؤں کے اسکول جن میں زیادہ تر پرائمری اور ورنیکلر مڈل اسکول شامل ہیں۔

ان اسکولوں میں اساتذہ اور طلبا کی استطاعت کے مطابق جغرافیائی عجائب گھر کی بنیاد ڈ

جا سکتی ہے۔ اس عجائب گھر کو کتنی جگہ درکار ہے؟ اس میں کیا کیا چیزیں رکھی جا سکتی ہیں؟ اور اس کا نظم ونسق کیا ہونا چاہیے؟ یہ سب کچھ اسکول کے اساتذہ جغرافیائی کمرے اور طلبہ کے ماحول اور دلچسپی پر منحصر ہوتا ہے۔ آئیے دیکھیں ہمیں اپنے اسکول میں عجائب گھر قائم کرنے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔

لوازمات عجائب گھر

(۱) عجائب گھر کا فرنیچر:۔ سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ پاکستان میں جہاں ہر اسکول میں طلبہ کی تعداد بہت زیادہ ہے اور دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہے۔ عجائب گھر کے لیے کتنی جگہ مفروضی اگر دیکھا جائے تو ہر اسکول میں جغرافیہ کا کمرہ ہی عجائب گھر کا موزوں مقام سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن ہمارے ملک میں جہاں جغرافیہ کے کمرے کا صرف نام ہی نام ہے اور وہ اصلیت میں مفقود ہے۔ وہاں ہر جغرافیہ کے استاد کو ہیڈ ماسٹر کا تعاون حاصل کر کے ایک بڑے کمرے کو اپنا کر عجائب گھر کی بنیاد رکھنی چاہیے۔ اس کے لیے ایک الماری سامان محفوظ رکھنے کے لیے، اور ایک میز نماشوکیس جس کی لمبائی ۶ فٹ اور چوڑائی ۴ فٹ ہو مناسب ہیں۔

(۲) سامان نمائش:۔ عجائب گھر کا مقصد طلبہ میں جغرافیائی سوچ بچار اور مقامی جغرافیہ میں عملی دلچسپی پیدا کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے جغرافیائی عجائب گھر میں مندرجہ ذیل اشیا کو نمائش کے لیے جمع کرنا ضروری ہے۔

(۱) زرعی پیداوار:۔ موسموں کے لحاظ سے جو اشیا اس علاقے میں پیدا ہوں۔ مثلاً۔ اناج۔ ترکاریاں اور پھل پھول وغیرہ۔

(۲) صنعتی اشیا:۔ مثلاً مغربی پاکستان میں بنا ہوا کپڑا۔ سیمنٹ۔ مٹی کے برتن۔ لوہے اور کھیلوں کا سامان وغیرہ۔

(۳) تصاویر:۔ مختلف اخباروں سے کاٹی ہوئی تصاویر اور تصویری کارڈ البم اور سکریپ بک میں بڑی تصاویر گتوں پر لگا کر تیار کرنی چاہئیں۔ تاکہ انسانی ماحول ملک اور دنیا کے باشندوں کی

زندگی اور مختلف جغرافیائی حالات دکھائے جا سکیں۔

(۴) ماڈل گراف چارٹ وغیرہ :۔ مٹی یا سیمنٹ کے ماڈل یا دنیا کے قدرتی خطوں کے حالات دکھانے والے ماڈل جن میں سطح زمین یا باشندوں کی زندگی کے نمایاں حالات دکھائے جائیں۔ یہ نہایت دل چسپی کا باعث ہوتے ہیں۔ ان میں نقشے۔ گراف۔ چارٹ وغیرہ بھی شامل کیے جا سکتے ہیں۔

(۵) مٹی یا لکڑی کے کھلونے :۔ بعض اوقات کھلونے جن کو مختلف ملک ملک کے بچوں کے لباس پہنا دیے جائیں۔ کافی دل چسپی کا باعث ہوتے ہیں۔

(۶) معدنیات :۔ اگر ماحول میں پہاڑیاں زیادہ ہوں، تو مختلف چٹانوں۔ پتھروں اور معدنیات کے نمونے نہایت مفید ثابت ہوتے ہیں۔

(۷) پرندے۔ اخبارات اور سکے :۔ مختلف قسم کے پرندوں کے پر۔ انڈے۔ مختلف قسم کے سکے اور اخبار و رسالہ جات وغیرہ کافی دل چسپی پیدا کرتے ہیں۔

(۸) طلبا کا کام :۔ طلبا کے بنائے ہوئے نقشے۔ نقشہ کشی کی کاپیاں۔ گراف۔ چارٹ وغیرہ جن پر ان کے نام لکھے ہوں طلبہ میں، عجائب گھر کی چیزیں مہیا کرنے میں خاص دل چسپی پیدا کرتے ہیں۔ طلبہ کے کام کی نمائش ان کے روزانہ کام کے معیار کو بلند کر دیتی ہے۔

عجائب کے لیے ہدایات

(۱) طلبا کا نام :۔ عجائب گھر کے ہر سامان پر بنانے والے طالب علم کا نام جگہ کا نام اور تاریخ آمد درج ہونی چاہیے۔

(۲) چیزوں کا انتخاب :۔ چیزیں وقت اور زمانے کے مطابق ہوں۔ سامان کی ترتیب کے وقت طالب علم کے سبق۔ موسم اور علمی نقطۂ نظر کو دھیان میں رکھتے ہوئے سامان کی آرائش کرنی چاہیے۔

(۳) اشیا کی تبدیلی :۔ نمائش گاہ کی چیزوں کو ہر ماہ بدلتے رہنا چاہیے اور نئی اشیاء جو طلبہ نے بنائی ہوں یا جمع کی ہوں شوکیس میں رکھنی چاہییں۔

(۴) تنظیم نمائش گاہ :- ہر طالب علم کو جماعتوں کے حساب سے نمائش گاہ کو دیکھنے کی اجازت ہونی چاہیے اور مانیٹر کو رہنما بن کر چیزوں کو تفصیلی طور سے بتانا چاہیے۔ اگر ممکن ہوسکے تو بچوں کے لیے ایک نمائش کمیٹی بنانی چاہیے تاکہ خود اعتمادی پیدا ہو اور عجائب گھر کے کام میں دلچسپی بڑھ جائے۔

(۵) حفاظت اشیاء :- شوکیس کو تالا لگا کر رکھنا چاہیے۔ چیزوں کی صفائی اور ترتیب کا خاص خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔

سامان مہیا کرنے کے وسائل

(۱) تجارتی ادارہ جات :- نمائش گاہ کا سامان۔ زمینداروں۔ صنعت کاروں۔ تجارتی اداروں ہوائی جہاز کی کمپنیوں وغیرہ سے حاصل کرنا چاہیے۔

(۲) سرکاری محکمے :- استاد سرکاری دفاتر مثلاً محکمہ زراعت۔ محکمہ صنعت و حرفت۔ محکمہ تعلقات عامہ سے نمائشی اشیاء حاصل کر سکتے ہیں۔

(۳) جغرافیائی سیر :- طلبا جغرافیائی سیر کے لیے باہر جائیں تو عجائب گھر کے لیے ضروری چیزیں جمع کریں۔

نمائشی اشیاء کا انتخاب

جغرافیہ انسان اور اس کے ماحول کے تعلق کا نام ہے اور یہ بتاتا ہے کہ آدمی کیسے اپنے ماحول سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور ماحول کے مطابق ایک خاص قسم کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس تعلق کو واضح کرنے کے لیے سطح۔ آب و ہوا۔ قدرتی و زرعی پیداوار۔ صنعت و حرفت۔ سیاسی نظام یعنی طرز حکومت معاشرتی اثرات۔ مثلاً رسومات مذہب اور تعلیمی رجحانات اور پالتو جانوروں کا بہت بڑا واسطہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر لاہور کے گاؤں کا نمونہ پیش کرنے کے لیے۔ مٹی کے گھر۔ کسان کا ہل چلانا۔ گندم کا کھیت۔ نہر اور عورتوں کا مٹی کے برتن میں لسی اور کپڑے میں لپٹی ہوئی سر پہ روٹی لانا وغیرہ دلچسپ نظارے ہیں — یہی عملی اور صحیح جغرافیہ ہے۔

تعلیمی دُنیا پر ایک نظر

تاریخ کا رنگ

۱۹۳۱ء میں کیمرج یونی ورسٹی کے پروفیسر بٹر فیلڈ نے اپنی مشہور کتاب "لوگوں کی تاویل تاریخ" میں یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ ہر تاریخ لکھنے والے کا فرض ہے کہ اپنے معروضات اور رجحانات کو کھول کر بیان کر دے۔ اس وقت سے پروفیسر موصوف اس نظریے کی تائید میں متواتر سرگرم رہے ہیں، اس سلسلے میں انہوں نے بلفاسٹ میں لیکچروں کا ایک سلسلہ جاری کیا تھا۔ اب یہ لیکچر کتابی شکل میں یکجا کر دیے گئے ہیں۔ اس کتاب میں فن تاریخ نویسی پر سیر حاصل تبصرہ تو نہیں کیا گیا۔ البتہ اٹھارہویں صدی سے لے کر لارڈ ایکٹن کے وقت تک کی تاریخ نویسی پر عام اظہار رائے کیا گیا ہے۔ یہ کتاب تاریخ کے استادوں کے لیے زیادہ حسب حال ہے کیوں کہ اس میں تحلیل و تجزیہ کی بجائے اشارات سے زیادہ کام لیا گیا ہے۔

کتاب میں جن نکات پر زور دیا گیا ہے ان میں سے تین ایسے ہیں جو مدرسوں کے طلبہ کے لیے کارآمد ہیں۔ اول یہ کہ تاریخ کے بڑے بڑے واقعات کا مطالعہ کرتے وقت یہ معلوم کرنا خصوصیت کے ساتھ سبق آموز ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایک ہی واقعہ مختلف تاریخ نویسوں نے کس رنگ میں بیان کیا ہے، دوسرے یہ کہ بے خبر سے بے خبر طالب علم کو بھی یہ کوشش کرنی چاہیے کہ تاریخ نویس کے ذہنی پس منظر کو دیکھے، تیسرے یہ کہ تاریخ پڑھنے والے کو اچھی طرح معلوم کر لینا چاہیے کہ کوئی تاریخ نویس یا تاریخ نویسوں کی کوئی جماعت بیتے ہوئے زمانے کے متعلق کیا مفروضات رکھتی ہے۔

اطالوی استادوں کی ایک اور ہڑتال۔

اطالیہ کے استادوں نے یکم دسمبر سے تین دسمبر تک پھر ہڑتال کی۔ یہ ہڑتال ثانوی مدرسوں کے

استادوں کی تھی اور اس ہڑتال میں تقریباً ستر ہزار استادوں نے حصہ لیا۔ ہڑتال کی فوری وجہ استادوں کا یہ مطالبہ تھا کہ سول سروس بل میں ان کی تنخواہوں کے بڑھانے کی جو تجاویز پیش کی گئی ہیں ان سے انہیں پیشگی آگاہ کیا جائے، یہ بل دس جنوری کو مشتہر کیا جانے والا تھا۔ ہڑتال کی اصل وجہ یہ ہے کہ پچھلے کئی مہینوں سے زیادہ تنخواہوں کے لیے مہم جاری تھی جس کے سبب پہلے تین ہڑتالیں ہو چکی ہیں۔ ابھی اس تحریک کے ختم ہونے کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔ صدر معلموں کی انجمن نے اعلان کیا ہے کہ شاید وہ غیر معین عرصہ کے لیے ایک اور ہڑتال کا فیصلہ کرے۔

اطالوی وزیر تعلیم سائنورا اوسی جو ریاست ہائے متحدہ کے دورہ پر تھے اپنے قیام امریکہ کا پروگرام مختصر کر کے فوراً روما کو واپس آئے اور آتے ہی ہڑتال سے ایک دن پہلے ریڈیو پر سرکاری نقطۂ نگاہ کی وضاحت کی۔ وزیر تعلیم نے کہا حکومت استادوں کا یہ مطالبہ نہیں مان سکتی کہ تنخواہ بڑھانے کی تجویزوں سے انہیں پیشگی باخبر کر دیا جائے۔ انہوں نے کہا حکومت استادوں کے لیے خیر سگالی کے جو جذبات رکھتی ہے ان کا ثبوت وہ عارضی اضافہ تنخواہ ہے جو پچھلے اکتوبر میں کیا گیا۔

استادوں کو جو مراعات دی جا رہی ہیں ان کی مثال کے طور پر وزیر تعلیم نے بتایا کہ ۱۹۵۳ء میں اطالیہ کے ایک بڑے شہر میں واقع مدرسے کے غیر شادی شدہ صدر معلم کو کل ۵۰ ۱۳۲۹۵ لائر ماہوار ملتے تھے۔ مگر پچھلے سالوں میں تنخواہوں کے بڑھنے اور موجودہ عارضی اضافے کے مل جانے سے ۱۸۹۵۰۳ لائر ماہوار ملیں گے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ تین سال کے عرصہ میں تنخواہ میں بقدر ۵۳ء ۴۲ فی صد اضافہ ہوا، دوسری طرف ایک چھوٹے مدرسے کے ادنیٰ غیر شادی شدہ مدرس کو جو ایک چھوٹے قصبے کے ابتدائی مدرسے میں پڑھاتا ہے ۱۹۵۳ء میں ۵۱۱۲۹ لائر ماہوار ملتے تھے۔ اب اسے ۶۶۹۲۰ لائر ماہوار ملیں گے جس کا مطلب ۹۶ء ۳۰ فی صد کا اضافہ ہے۔

تاہم وزیر تعلیم نے اس بات کو تسلیم کیا کہ تنخواہوں میں خاصے اضافے کے باوجود ابھی سرکاری ملازموں کی آمدنی اس سطح پر نہیں آئی کہ اپنی آمدنی اور اخراجات کو تسلی بخش طور پر متوازن کر سکیں لیکن انہوں نے کہا کہ سرکاری ملازموں کی آمدنی میں مزید ترقی اسی صورت میں ممکن ہے،

جب ملک کی عام معاشی حالت بلند تر سطح پر آجائے۔

اطالوی سینیٹ میں ایک سوال پوچھا گیا تھا جس نے استادوں کی ناراضگی کو اور بڑھا دیا ہے جمہوری عیسائی پارٹی کے ایک رکن نے سوال کیا کہ زیادہ تنخواہ مانگنے کے ساتھ کیا استادوں نے یہ تجویز بھی پیش کی ہے کہ وہ پہلے کی نسبت زیادہ دیر تک کام کیا کریں گے؟ اگر خود ان کی طرف سے ایسی کوئی تجویز نہیں تو کیا حکومت نے ان کے سامنے یہ شرط رکھی ہے؟ ممبر نے کہا کہ والدین کو گھر پر زائد نجی پڑھائی کا جو بندوبست عام طور پر کرنا پڑتا ہے اس کا بوجھ عوام کے لیے کافی حد تک کمر توڑ ہے۔ اس عوامی بوجھ میں کمی ہونی چاہیے، نجی معلمی کے عام رواج کی وجہ یہ ہے کہ فیل ہونے والے طلبہ کا تناسب بہت بھاری ہے، یہ سوال پوچھ کر سینیٹ کے رکن نے دراصل ایک دکھتی رگ کو چھیڑا کیوں کہ ایک اوسط ثانوی مدرس کے اوقات کار عموماً ۱۲ سے ۱۸ گھنٹے فی ہفتہ تک ہیں۔

اطالیہ میں اخراجات زندگی اس قدر زیادہ ہیں کہ کسی تنخواہ کو بھی گراں قدر نہیں کہا جا سکتا۔ روم میں ایک سٹینو ٹائپسٹ کو اس کی قابلیت کے حسب اعتبار عموماً ۳۵۰۰۰ سے ۶۵۰۰۰ لائر ماہوار مل جاتے ہیں، محض ٹائپ کرنے والے کو ۳۲۰۰۰ لائر سے زیادہ نہیں ملتے ایک چپڑاسی کو ۲۳۰۰۰ لائر ماہوار اور ایک شوفر کو ۳۵۰۰۰ لائر ماہوار۔ ان تمام لوگوں کو ہفتے میں ۴۰ سے ۴۵ گھنٹے کام کرنا پڑتا ہے، چھوٹے قصبوں میں اخراجات اور تنخواہیں دونوں کم ہیں لیکن اطالیہ بھر میں یہ عام دستور ہے کہ سرکاری ملازموں اور دوسرے نوکروں کو سال بھر کی نوکری کے بعد ایک مہینے کی تنخواہ زائد دی جاتی ہے۔

ایشیا والوں کے لیے اور کتابیں

حال ہی میں دہلی میں ایک اہم تعلیمی اجتماع ہوا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ایشیا میں کتب خانوں کی خدمات کو ترقی دی جائے، یہ اجتماع یونیسکو کے زیر اہتمام منظم کیا گیا اور حکومت ہند نے میزبانی کے فرائض انجام دیے۔ گروہی رہنماؤں اور مبصروں کو ملا کر کل پندرہ ملکوں کے ناظمین کتب خانہ جات نے اس میں شرکت کی، یہ ممالک مندرجہ ذیل ہیں۔ افغانستان۔ آسٹریلیا۔ برما۔ سیلون۔ ہندوستان

ونیشیا۔جاپان۔ملایا۔برٹش بورینو۔نیپال۔نیوزی لینڈ۔پاکستان۔فلی پین۔تھائی لینڈ۔برطانیہ
ریاست ہائے متحدہ امریکہ۔

اجتماع کا افتتاح حکومت ہند کے وزیر تعلیم مولانا آزاد نے کیا۔ اپنی تقریر میں انہوں نے کہا جو ملک کتب خانوں کے ناظموں کی اس کانفرنس میں شریک ہیں ان تمام میں عوامی کتب خانوں کا فقدان ہے۔ عام تعلیمی معیاروں کی پستی کا یہ ایک پیمانہ بھی ہے اور سبب بھی ہندوستان کی کل آبادی ۳۶ کروڑ سے اوپر ہے لیکن اس کے عوامی کتب خانے صرف نام کے کتب خانے ہیں۔ کیوں کہ ان میں ایک اچھے کتب خانے کے بعض اہم اوصاف موجود نہیں۔ پچاس باشندوں کے حصے میں بمشکل ایک کتاب آتی ہے، اور ہندوستان میں ایک پڑھا لکھا آدمی سال میں اوسطاً ایک کتاب پڑھتا ہے۔

کانفرنس تین حصوں میں بٹ گئی۔ ایک حصے کے ذمہ یہ کام تھا کہ قومی کتب خانوں کی خدمات کا مفصل خاکہ تیار کرے، دوسرے حصے کا کام یہ تھا کہ نئے نئے خواندہ بننے والوں کے لیے موزوں لٹریچر کی فراہمی پر غور کرے، اور تیسرے حصے کا کام یہ تھا کہ بچوں کے لیے کتب خانوں کی سہولتوں کا بندوبست کرے۔

کانفرنس میں شرکت کرنے والے نمائندوں نے ایشیائی مشکلات کے حل کرنے کے لیے بڑے عزم و یقینت پسندی کا ثبوت دیا۔ جاپان اور فلی پین میں کتب خانوں کی خدمات نسبتاً زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ ان کے مقابلے میں نیپال اور افغانستان ابھی اس سمت میں پہلا قدم اٹھا رہے ہیں۔ ان تمام باتوں کے باوجود تمام ملکوں نے ایک دوسرے سے مفید مطلب باتیں اخذ کرنے کی کوشش کی۔ کانفرنس کے خاتمہ پر یہ بات واضح ہوگئی کہ اگرچہ کتب خانوں کی تنظیم کے بارے میں مغرب بہت آگے بڑھا ہوا ہے، پھر بھی ایشیا اپنے خصوصی حالات کے لیے نئی نئی راہیں تلاش کرسکتا ہے۔ یہ کانفرنس لگاتار تین ہفتے جاری رہی، اس اجتماع کے لیے دہلی کا انتخاب اس لحاظ سے موزوں تھا۔ ۱۹۵۳ء میں سفری کتب خانہ یہیں جاری ہوا اور اب ایک متحرک کتب خانہ باقاعدہ دہلی کے نواح میں پڑھنے والوں کو کتابیں دینے جاتا ہے۔

آموزش

، شمارہ ۱۲] **لاہور** [مارچ ۱۹۵۶ء

اس شمارہ میں

مدیر { پروفیسر سراج الدین
پروفیسر ایم ۔ اے ۔ مخدومی

معاونین { عبدالغفور چوہدری
فضل احمد

تعلیمی ماہ نامہ

آموزش

(لاہور)

مارچ سنہ ۱۹۵۶ء

جلد ——— ۸

شمارہ ——— ۱۲

سالانہ چندہ

پاکستان کے لیے ۷ روپے

غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز

یونی ورسٹی بک ایجنسی لاہور

آر۔ ایچ۔ ڈی۔ بخاری پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کے
یونیورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

اداریہ

ایم۔ اے۔ مخدومی

۶، ۷، ۸ فروری ۱۹۵۶ء کی تاریخیں مغربی پاکستان کی تعلیمی تاریخ میں یادگار رہیں گی۔ ان تاریخوں کو صوبے کی تاریخ میں پہلی مرتبہ محکمہ تعلیم کے انتظامی افسروں، تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے صاحب فکر لوگوں، اور مختلف درجوں پر کام کرنے والے استادوں نے مل کر نصاب کے گوناگوں مسائل پر غور کیا۔ ان تعلیمی مذاکرات کا اہتمام سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور اور ایجوکیشن فیلو شپ نے واشنگٹن سٹیٹ کالج امریکہ کے تعاون سے کیا تھا۔ ان مذاکرات کی اصل غایت کوئی مثالی نصاب تیار کرنا نہ تھی بلکہ جدید نصاب سازی کی سائنسی تکنیکوں سے ملک کو آگاہ کرنا تھا۔ الحمدللہ کہ یہ مقصد بہت اچھی طرح پورا ہوا۔ نہ صرف یہ کہ مذاکرات میں حصہ لینے والوں نے پاکستانی مدرسوں کے نصاب کے چند در چند پہلوؤں پر مختلف زاویہ ہائے نظر سے نگاہ ڈالی۔ بلکہ ملکی اخباروں میں ان مباحث کی رپورٹوں کو نمایاں جگہ دی گئی۔ اور اس طرح ملک کا فہمیدہ طبقہ مروجہ نصاب پر مسلسل تنقیدی نگاہ کی ضرورت سے آگاہ ہو گیا۔

قیام پاکستان کے بعد سے مروجہ تعلیمی نصابوں سے بے اطمینانی لگاتار بڑھتی گئی ہے، یہ ایک بالکل قدرتی امر تھا۔ آزادی کی آمد نے زندگی کے مسائل کی نوعیت بہت کچھ تبدیل کر دی ہے پاکستان بعض مخصوص ثقافتی اقدار کے تحفظ اور نشوونما کے لیے وجود میں آیا تھا۔ ہمارے نصاب تعلیم کو ان اقدار کی آئینہ داری کرنی چاہیے۔ پرانا نصاب اس مطلب کے لیے وضع ہی نہیں کیا گیا تھا۔ اس لیے یہ امید رکھنا عبث ہے کہ وہ اس غرض کو تسلی بخش طور پر پورا کرے۔

پچھلے آٹھ سال کے عرصہ میں اگرچہ مروجہ نصابوں پر بہت کچھ لے دے ہوتی رہی ہے

اوران میں سے بعض میں اصلاح وترمیم بھی ہوئی ہے۔ لیکن یہ کام کسی سائنسی بنیاد پر انجام نہیں دیا گیا ہم نصاب میں جو خامیاں بیان کریں یا اس میں جن اصلاحات کا مشورہ دیں ان کی بنیاد ذاتی رائے پر نہیں بلکہ تحقیقی مطالعہ اور عملی تجربے کے نتائج پر ہونی چاہیے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں اس قسم کے مستقل ادارے موجود ہیں جو لگاتار یہ خدمت انجام دیتے رہتے ہیں۔ مقام مسرت ہے کہ محکمہ تعلیم مغربی پاکستان نے بھی ایک ایسے مستقل ادارے کے قیام کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔

نصاب تعلیم کسی قوم کے مخصوص ثقافتی اور معاشرتی مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہے اور بس۔ معاشرتی زندگی کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ ان مقاصد میں بھی ردوبدل ہوتا رہتا ہے۔ جدید سائنس اور ٹکنالوجی کی برق رفتار ترقی نے معاشرتی تبدیلی کا قدم ناقابل تعین حد تک تیز کر دیا ہے۔ اسی مناسبت سے نصاب کی لگاتار چھان بین بھی ایک غیر معمولی طور پر اہم تعلیمی سرگرمی بن گئی ہے۔ لیکن اس اہم تعلیمی غرض سے کوئی مستقل ادارہ تنہا عہدہ برآ نہیں ہو سکتا اس ادارے کو تمام مدارج پر کام کرنے والے استادوں اور ذی فہم شہریوں کا مکمل تعاون حاصل ہونا چاہیے۔ اس تعاون کی راہ کی طرف ۶، ۷، ۸ فروری کے تعلیمی مذاکرات نے واضح طور پر اشارہ کر دیا ہے۔ تعلیم میں دلچسپی رکھنے والے شہریوں اور اساتذہ کا یہ فرض ہے کہ نصاب کے مسائل کو ہمیشہ پیش نگاہ رکھیں۔

الجبرا سبقوں کے خاکے

سادہ مساوات

عبدالغفور چوہدری   مسلسل نمبر

اس مضمون میں سادہ مساوات پر ایک ایسا سبق دیا جا رہا ہے جو جماعت میں اسی انداز پہ پڑھایا گیا، جیسے جیسے استاد پڑھاتا تھا بچے جواب دیتے تھے، ان سوالات اور جوابات کو ایک مختصر نویس نے جوں کا توں نقل کر لیا۔ آپ دیکھیں گے کہ استاد نے روائتی سانڈ کی طرح اپنے سینگوں سے سیدھا اس موضوع پر دھاوا نہیں بولا، نہ ہی اسے یک بارگی چت گرانے کی کوشش کی بلکہ ایک اچھی خاصی تمہید سے بچوں کی سابقہ واقفیت کا جائزہ لیا ہے، ان کے ذہنوں کو کہیں ٹھونکا دیا ہے کہیں چونکایا ہے، اور اس طرح آہستہ آہستہ بچوں کو اصل موضوع کے لیے تیار کر کے سبق کو آگے بڑھایا اور چلایا ہے۔

استاد:- $9 = 3 + 7$ اس جملے کو ذرا غور سے دیکھو۔ بھلا ایسے جملے کو جس کے درمیان میں مساوات کا نشان ہو اور دونوں طرف کچھ رقم ہو کیا کہو گے؟

شاگرد:- مساوات۔

استاد:- تو پھر مساوات ایک ایسی چیز ہوئی جس کی دو اطراف ہوتی ہیں اور ان کے بیچ میں مساوات کی نشانی ہوتی ہے۔ بھلا بتاؤ تو مساوات کو حل کیسے کرتے ہیں؟

شاگرد:- ہمیں یہ معلوم کرنا چاہیے کہ ۷ کتنے کے برابر ہے۔ اس مساوات میں ۷ ، ۳ کے برابر ہے

استاد:- اس سوال میں ہم نے ۳ کے عدد کو کیا کیا؟

شاگرد:- ہم نے اس کی جمع کی علامت (+) کو بدل دیا۔

استاد:- تو پھر مساوات حل کرنے کا پہلا اصول کیا ہوا؟

شاگرد:- اگر ہم کسی عدد کو دوسری طرف لے جائیں تو ہمیں اس کی علامت کو بدلنا ہوگا۔

استاد:- بالکل ٹھیک جوں ہی ہم ۳ کے عدد کو دوسری طرف لے جاتے ہیں وہ مثبت ۳ کی بجائے منفی ۳ بن جاتا ہے۔

اچھا آئیے اب ایک اور سوال حل کریں۔

لا - ۷ = ۴   اس مساوات کو حل کرنے کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے ؟

شاگرد:- کوئی نہ کوئی ایسی ترکیب نکالی جائے جس سے لا ایک طرف آئے اور سب ہندسے دوسری طرف چلے جائیں۔

استاد:- بتاؤ تو لا کو ایک طرف کرنے میں کیا دقّت ہے ؟

شاگرد:- یہ دقّت تو محض ۷ کے ہندسے کی ہے۔

استاد:- تو اس کو دوسری طرف لے جاؤ۔ اب دیکھو مساوات کیا سے کیا بن گئی۔

لا = ۴ + ۷

لا = ۱۱

اب فرض کرو ہمیں مندرجہ ذیل مساوات حل کرنا ہے۔

۳لا - ۷ = ۸

سب سے پہلے کیا کرو گے ؟

شاگرد:- ۷ کی رقم دوسری طرف لے جائیں گے۔

استاد:- بالکل ٹھیک۔ لیکن ۷ کی علامت کیا ہوگی ؟

شاگرد:- وہ منفی سے مثبت ہو جائے گی۔

استاد:- اچھا تو پھر

۳لا = ۸ + ۷

۳لا = ۱۵

بھی کچھ تو ہم نے پہلے بھی کیا تھا۔ اچھا اب بتاؤ لا کی قیمت کیسے نکالو گے ؟

شاگرد:- ۱۵ کو ۳ سے تقسیم کر کے ۔

استاد:- اس طرح لا = ۵

بتاؤ لا کی یہ قیمت کیسے آئی ؟ تم نے ۱۵ کو ۳ سے تقسیم کیوں کیا ؟

(اس سوال کے جواب میں خاموشی چھا جاتی ہے ۔ بچے ایک دوسرے کا منہ تکتے ہیں)

استاد:- بھئی ہم نے مساوات کو کس چیز کے مانند خیال کیا تھا ؟

شاگرد:- ترازو کی طرح جس کے دونوں پلڑے برابر ہوں ۔

استاد:- اچھا اب فرض کرو کہ دونوں پلڑوں میں برابر باٹ رکھے ہیں تو پلڑے برابر ہوں گے۔ اب ہم ان باٹوں کے دو گنے دو گنے باٹ دونوں طرف رکھ دیں گے تو پلڑوں کی کیا کیفیت

شاگرد:- پلڑے برابر ہی رہیں گے ۔

استاد:- اگر ہم ان دونوں پلڑوں میں ان باٹوں کے ایک ایک تہائی بٹے رکھ دیں تو پلڑوں کی کیا حالت ہوگی ؟

شاگرد:- پلڑے پھر بھی برابر رہیں گے ۔

استاد:- ایک تہائی کا کیا مطلب ؟

شاگرد:- یعنی ہم ان باٹوں کو ۳ کے عدد سے تقسیم کر دیں ۔

استاد:- تو ہم اس مساوات سے بھی یہی کچھ کریں گے ۔ ہم دونوں طرف کی رقموں کو ۳ سے تقسیم کر دیتے ہیں

جواب لا = ۵

تو بھئی مساوات حل کرنے کا دوسرا اصول یہ ہاتھ آیا کہ دونوں طرف کی رقموں کو یا تو ایک ہی رقم سے ضرب دے دو یا ایک ہی سے تقسیم کر لو۔ اب ایک سوال کو حل کرو۔

۵لا + ۲ = ۱۲

اس میں پہلا اقدام کیا ہوگا ؟

شاگرد:- ۵لا = ۱۲ - ۲

استاد:- اس مرتبہ تم نے کون سا اصول یاد کیا؟

شاگرد:- پہلا اصول یعنی اگر رقم کی طرف بدلو تو ساتھ اس کی علامت بھی بدلو۔

استاد:- اس لیے ۵لا = ۱۰

لا = ۲

ہم نے دونوں طرف کی رقموں کو کس سے تقسیم کیا۔

شاگرد:- ۵ سے

استاد:- اچھا آئیے اب ہم ایک اور مساوات حل کریں۔

۱/۳ لا = ۳ اس مساوات کو اور کیسے لکھ سکتے ہو؟

شاگرد:- لا بٹے ۳ بھی

استاد:- اگر ۱/۳ لا برابر ہے ۳ کے تو پورا لا کس کے برابر ہوا؟

شاگرد:- پورا لا برابر ہوا ۹ کے۔

استاد:- اگر ۱/۴ لا برابر ہے ۲ کے تو لا کتنے کے برابر ہوگا؟

شاگرد:- ۸ کے

استاد:- خوب تو لا = ۸ اب ایک اور مساوات لو۔

۲/۳ لا = ۶ اس میں لا کتنے کے برابر ہوا؟

شاگرد:- لا برابر ہوا ۹ کے۔

استاد:- یہ کیسے؟

شاگرد:- ۳×۳ برابر ہوا ۹ کے۔

استاد:- لیکن ابھی ایک تین تو مساوات میں نظر آتا ہے۔ یہ دوسرا تین کہاں سے آ گیا؟

شاگرد:- چھ بٹے دو برابر ہوا تین۔

ستاد:- تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم نے دو اقدام کیے ایک تو چھ کو دو سے تقسیم کر کے ۳ کا عدد حاصل کیا۔ دوسرے تین کو تین سے ضرب دی۔

اچھا تو یہ بتاؤ کہ تم نے دونوں طرفوں کو کیا کیا؟

اگرد:- ہم نے دونوں کو تین سے ضرب دے دی

تاد:- تو پھر مساوات حل کرنے کا ایک قاعدہ کیا ہوا؟

اگرد:- یہ کہ دونوں طرفوں کو ایک ہی رقم سے ضرب دے دو۔ یا ایک ہی رقم سے تقسیم کر دو۔

تاد:- تو بھئی تم نے تو مساوات حل کرنے کا اصول اپنے آپ ہی نکال لیا، اگر انہیں ذہن میں رکھو گے تو مساوات کا ہر قسم کا سوال نکال لو گے۔ آؤ اب ذرا اس سوال کو دوبارہ حل کریں۔

۶ = ۷ $\frac{۲}{۳}$

ہم دونوں طرف کی رقموں کو کس سے ضرب دیتے ہیں۔

گرد:- تین سے

اد:- تو $\frac{۲}{۳}$ ضرب ۳ کیا ہوا؟

گرد:- ایک صحیح ایک بٹے تین

اد:- واہ - یہ کیسے ہوا (دوسرے طالب علم کی طرف اشارہ کر کے) تم بتاؤ۔

:- دو

:- یہ کیسے

:- تین کا عدد تین سے کٹ گیا جواب دو آیا۔

:- اچھا اب یہ بتاؤ کہ $\frac{۳}{۴}$ ضرب ۴ کیا ہوگا؟

:- تین

:- اچھا تو پھر ایسی مساوات جس میں بٹے آتے ہوں اسے کیسے حل کریں گے۔

:- ماسٹر صاحب ان مساوات میں سب سے بڑی مشکل بٹوں کی ہے، اگر یہ کسی ترکیب سے

نکال دیے جائیں تو پھر آسان ہی آسان ہے۔

استاد:- ان کو کیسے نکالا جائے؟

شاگرد:- ان کی ترکیب تو یہی ہے کہ جو نسب نما ہو۔ اسی سے رقم کو ضرب دے دیا جائے نسب نما کو اسی طرح دور کیا جا سکتا ہے۔

استاد:- اچھا تو اگر اس مساوات کے دائیں طرف کو تین سے ضرب دی جائے تو بائیں طرف کی رقم کو کیا کیا جائے؟

شاگرد:- اسے بھی تین سے ضرب دی جائے۔

اس طرح سے ۲/۳ لا = ۶

۲لا = ۱۸

لا = ۹

اب ایک اور سوال حل کرو۔

۳/۴ لا = ۹

شاگرد:- لا برابر ہے ۱۲

استاد:- بھئی جواب بتانے میں اتنی تیزی نہ دکھاؤ۔ ذرا اس کو اطمینان سے حل کرو۔ تم نے دونوں طرفوں کو کس ہندسے سے ضرب دی

شاگرد:- چار سے

استاد:- خوب ۳/۴ کو ۴ سے ضرب دیں تو جواب

شاگرد:- ۳

استاد:- اگر ۳/۴ لا کو ۴ سے ضرب دیں تو؟

شاگرد:- تو پھر جواب ۳ لا آئے گا۔

استاد:- اگر ہم دائیں طرف کی رقم کو چار سے ضرب دیں تو بائیں طرف کی رقم کو کیا کریں گے؟

شاگرد :- اس کو ۴ سے ضرب دیں گے ۔

استاد :- ہاں تو پھر

$$۹ = لا \frac{۳}{۴}$$

$$۳۶ = ۳لا$$

$$۱۲ = لا$$

آؤ اب ایک اور مساوات حل کریں ۔

$$\frac{۲}{۳} + لا \frac{۱}{۲} = \frac{۳}{۴} - لا \frac{۲}{۳}$$

اس مساوات کا کیا کیا جائے ؟

شاگرد :- لا کی سب رقمیں دائیں طرف لے جایئے اور محض ہندسوں کی رقمیں بائیں طرف ۔

استاد :- بہت ٹھیک ہم اس پر عمل کریں گے ۔ اب ہماری مساوات کی صورت یہ ہوگی ۔

$$\frac{۳}{۴} + \frac{۲}{۳} = لا \frac{۱}{۲} - لا \frac{۲}{۳}$$

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ $\frac{۲}{۳}$ لا - $\frac{۱}{۲}$ لا کو کیا کریں ؟

آئیے ہم پہلے $\frac{۲}{۳}$ - $\frac{۱}{۲}$ کو حل کریں

اس کا ذو اضعاف اقل کیا ہوگا !

شاگرد :- ۶

استاد :- بہت ٹھیک اس لیے

$$\frac{۱}{۶} = \frac{۳ - ۴}{۹}$$

$$\therefore \frac{۹ + ۸}{۱۲} = لا \frac{۱}{۶}$$

$$\therefore \frac{۱۷}{۱۲} = لا \frac{۱}{۶}$$

اب بتاؤ کہ اس رقم کو لا بنانے کے لیے ہم کس رقم سے ضرب دیں ۔

شاگرد :- دونوں طرف کی رقموں کو ۶ سے

استاد:- ۶ ضرب ۱/۶ کیا ہوا؟

شاگرد:- ایک

استاد:- اس لیے ۱/۲ لا ضرب ۶ ہوا

۶/۱ × ۱۷/۱۲ = لا

۱۷/۲ = لا

۸ ۱/۲ = لا

بھئی ہم نے مساوات حل کرنے کے جو قاعدے بنائے تھے ان کی رو سے تو یہی ہوا۔

شاگرد:- ماسٹر صاحب جواب تو نکل آیا۔ لیکن اس میں وقت بہت لگا۔

استاد:- ہاں بھئی تو کوئی ایسا طریقہ سوچو جس سے اس کا حل جلدی سے نکل آئے۔

بھلا کون ایسا ہندسہ نہیں جو ایک بار ہی مساوات سے ۲، ۳، ۴ کے نسب نما کو نکال دے

شاگرد:- کیوں نہیں ماسٹر صاحب - ۱۲ کا ہندسہ ہی استعمال کر لیجیے۔

استاد:- شاباش کیوں نہ ہم اس سے دونوں طرفوں کو ضرب دے لیں۔

۲/۳ + لا ۱/۲ = ۳/۴ - لا ۲/۳

۱۲ سے ضرب دو تو اس مساوات کی یہ حالت ہو جائے گی۔

۸ + ۶لا = ۹ - ۸لا

اب تو یہ مساوات بہت سادا اور آسان ہو گئی۔ اس قسم کی مساوات تو تم کئی بار پہلے حل کر چکے ہو گے، اس سے پہلے لا کے عددی سر کیسے تھے؟

شاگرد:- وہ سب کے سب کسریں تھیں۔

استاد:- اور اب؟

شاگرد:- اب سب کے سب ہندسے

استاد:- تو گویا ہم نے اس طرح لا کے عددی سروں کو کسروں سے بدل کر ہندسے بنا دیا۔ اب کیا کرنا چاہیے؟

شاگرد:- اب لا کو ایک طرف لے جائیں اور عددوں کو دوسری طرف۔

استاد:- شاباش اس طرح

۹ + ۸ = لا۶ - لا۱

۱۷ = لا۲

۸ ۱/۲ = لا

اس طرح ہم نے ان مساوات کو حل کرنے کے دو قاعدے معلوم کیے۔ تمہیں ان میں سے کون سا زیادہ آسان نظر آتا ہے ؟

شاگرد:- دوسرا قاعدہ

استاد:- ہاں تو اس کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہم ایک بار ہی سب کسریں دور کر دیتے ہیں۔ جہاں تم نے مساوات کو ۱۲ سے ضرب دی ساری کی ساری کسریں کافور ہو گئیں۔ اگر کسریں اڑیں تو سمجھو کہ تم نے غلط عدد منتخب کیا ہے۔ آؤ اب ایک سوال اور کریں۔

۷/۸ + لا ۵/۱۶ = ۱/۲ - لا ۳/۴

اب بتاؤ اس مساوات کو کس رقم سے ضرب دیں ؟

شاگرد:- ۱۶ سے

استاد:- ٹھیک اس لیے

۱۴ + ۵ = ۸ - لا۱۲

۸ + ۱۴ = لا۵ - لا۱۲

۲۲ = لا۷

۳ ۱/۷ = لا

اب اپنی کاپیاں نکالو اور یہ سوال حل کرو۔

۱/۲ + لا ۱/۴ = ۱/۴ - لا ۱/۲

اب سب سے پہلے یہ معلوم کرو کہ ہمیں اس مساوات کو کس عدد سے ضرب دینی چاہیے
تھی۔ اب تو یہ عدد تم چٹکی بجاتے نکال لو گے (بچے کاپیوں پر سوال حل کرتے ہیں)

استاد:- اچھا اب میں عدد کو بورڈ پر لکھوں گا۔

شاگرد - ۴

استاد:- آؤ اب اسے ۴ سے ضرب دیں۔

۲ + ۷ = ۱ - ۷۲

۱ + ۲ = ۷ - ۷۲

۳ = ۷

دیکھیں کتنے بچوں نے سوال ٹھیک نکال لیا ہے (تقریباً نوے فی صدی بچے ہاتھ اٹھاتے ہیں) اچھا اب وہ لڑکے جنہوں نے ۸ سے ضرب دی تھی، ہاتھ اٹھائیں (کئی لڑکے ہاتھ اٹھاتے ہیں) اس پر استاد کہتا ہے۔ تم نے خوامخواہ زحمت کی۔ جب ۴ سے ضرب دینے پر کام چل سکتا تھا تو ۸ سے ضرب دینے کی کیا ضرورت تھی، اس کے بعد استاد انہیں مشق کے لیے مزید سوالات دیتا ہے۔

انگریزی تعلیم (ہنڈن ٹیکنیکل کالج)

محمد عبد العزیز

مسلسل نمبر ۲

کے ٹرنگ

CATERING ETC.

ان مختلف چیزوں کو دیکھتے دیکھتے ساڑھے بارہ بج چکے تھے۔ ساڑھے بارہ بجے سے یہاں دوپہر کا کھانا شروع ہو جاتا ہے جو ڈیڑھ بجے تک جاری رہتا ہے، ہمیں کالج کے اس حصے کے دیکھنے کا بھی بڑا شوق تھا، اس لیے ہم نے مسٹر کیمبل سے درخواست کی کہ اس سے پہلے کہ ڈائننگ ہال میں بیٹھ کر کھانا کھائیں ہم اس حصے کو بھی دیکھنا چاہتے ہیں، چناں چہ ہم سب مسٹر کیمبل کی رہنمائی میں مس ہیکڈ انلڈ کے پاس پہونچے جو اس شعبے کی صدر ہیں اس ہیکڈ انلڈ نے ہمیں اس مختصر سے وقفے میں اپنے شعبے کی بہت سی چیزیں دکھائیں۔

فل ٹائم کورس کالج کے اس شعبے میں بالعموم ان طلبہ یا طالبات کو داخل کیا جاتا ہے جو اپنی سولہ سالہ عمومی تعلیم کا زمانہ ختم کر چکتے ہیں، اس طرح اس شعبے میں پڑھنے والوں کی عمر سولہ سال یا اس سے زیادہ ہوتی ہے، اس شعبے کا کام ہوٹل اور کیٹرنگ کے سلسلے میں باقاعدہ تعلیم دینا ہے۔ اس کی تفصیلات یہ ہیں۔

(۱) ہوٹل اور لارج اسکیل کیٹرنگ (HOTEL AND LARGE SCALE CATERING)

اس کورس میں بالعموم سولہ سال کے طلبہ داخل ہوتے ہیں جن میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں ہوتے ہیں۔ پہلے سال کے اختتام پر اگر طلبہ امتحان دینا چاہیں تو وہ سٹی اینڈ گلڈز آف لندن انسٹی ٹیوٹ کے CATERING BASIC TRAINING EXAMINATION میں شریک ہو سکتے ہیں، اور دو سال کی تعلیمی مدت ختم کرنے کے بعد وہ انسٹی ٹیوٹ کے COOKERY EXAMINATION FOR

HOTEL AND CATERING ESTABLISHMENT کا امتحان دے سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں طلبہ کو نظری تعلیم بھی دی جاتی ہے اور عملی تربیت بھی لیکن عملی تربیت کی طرف بالخصوص توجہ دی جاتی ہے۔ یہاں لڑکے اور لڑکیاں باقاعدہ کھانا پکانا۔ انہیں سلیقے سے لگانا، دوسروں کے سامنے پیش کرنا، محفل کے آداب، کاروباری معلومات۔ غرض اس پیشے سے متعلق جملہ چیزیں سیکھتے ہیں۔

(۲) HOTEL AND LARGESCAL CATERING

یہ کورس بھی دراصل پہلے کورس کی ایک دوسری تصویر ہے۔ اس میں بالعموم ان طلبہ اور طالبات کو شامل کیا جاتا ہے جو ثانوی مدارس کی باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس پیشے میں آنے کے آرزومند ہیں، یہ طلبہ اور طالبات دو سال بعد سٹی اینڈ گلڈز آف لندن انسٹی ٹیوٹ کا CATERING TRADES BASIC TRAINING EXAMINATION میں شامل ہو سکتے ہیں اور تین سال بعد حسب معمول اسی انسٹی ٹیوٹ کے COOKERY EXAMINATION FOR HOTEL AND CATERING ESTABLISHMENT کا امتحان دے سکتے ہیں۔ اس کورس میں شامل ہونے والوں کا انگریزی اور حساب کا ایک انتخابی امتحان بھی ہوتا ہے۔

(۳) CHEF'S TRAINING COORSE

یہ کورس صرف طلبہ کے لیے مخصوص ہے، اس میں قاعدے کی رو سے لڑکیاں شامل نہیں ہو سکتیں اس کورس کا مقصد یہ ہے کہ طلبہ کو ہوٹل اور کیٹرنگ کی صنعت کے لیے باقاعدہ تیار کیا جائے، یہ کورس خالصتہً عملی ہے لیکن اس میں طلبہ کو کھانا پکانے کی ترکیب بھی سکھائی جاتی ہے۔ ہوشیار طلبہ کو CATERING ESTABLISHMENT میں شریک ہونے کی اجازت ہوتی ہے۔ اس کورس میں شریک ہونے والوں کو بھی انگریزی اور حساب میں داخلے کا امتحان دینا ہوتا ہے۔

(۴) HOTEL BOOK-KEEPER RECEPTION'ST COURSE

یہ کورس ذرا ان تینوں سے مختلف اور مشکل ہے، اس میں صرف ان طلبہ کو داخلہ ملتا ہے جو سٹی اینڈ گلڈز آف لندن انسٹی ٹیوٹ کا BASIC CATERING کا امتحان پاس کر چکے ہوں۔ اس کے

علاوہ انہوں نے لندن یونی ورسٹی کا جی سی۔ای (ORDINARY LEVEL) امتحان بھی پاس کر لیا ہو، اس کورس میں طلبہ کو ہوٹل کا انتظام اور اس کے کاروبار کی عملی اور نظری تربیت دی جاتی ہے کورس کی تکمیل کے بعد طلبہ انسٹی ٹیوٹ کے HOTEL BOOK-KEEPER RECEPTIONIST کے امتحان میں شریک ہو سکتے ہیں۔

(۵) COURSE IN PRE-NURSING

جو لڑکیاں اپنی آئندہ زندگی میں نرسنگ کا پیشہ اختیار کرنا چاہتی ہیں وہ اس کورس میں شامل ہو سکتی ہیں، لیکن اور دوسرے کورسوں کی طرح اس میں بھی انگریزی اور حساب کا امتحان ہوتا ہے۔ جو طالبات کامیاب ہو جاتی ہیں انہیں داخل کر لیا جاتا ہے اور دو سال کی تدریس اور عملی تربیت کے بعد انہیں جنرل نرسنگ کونسل کے ابتدائی امتحان میں شریک ہونے کی اجازت مل جاتی ہے تاکہ اس امتحان کے پاس کرنے کے بعد وہ STATE REGISTERED NURSES کی پیشہ ورانہ تربیت میں شریک ہو سکیں۔

پارٹ ٹائم

فل ٹائم کورسوں کی طرح ان طلبہ اور طالبات کی سہولتوں کے پیش نظر جو ان مختلف پیشوں کی تربیت حاصل کر کے انہیں اپنا پیشہ بنانا چاہتے ہیں، پارٹ ٹائم تدریس و تربیت کا بھی انتظام ہے۔ اس میں مندرجہ بالا کورسوں کے علاوہ {DRESSMAKING CERTIFICATS. اور CERTIFICATE IN CRAFT} بالخصوص قابل ذکر ہیں۔

ہم لوگ مسٹر کیمبل اور مسٹر سیکنڈ انلاٹ کے ساتھ اس شعبے کے مختلف حصوں میں پھرتے رہے، چوں کہ طلبہ اور اساتذہ دوپہر کے کھانے کے سلسلے میں ڈائننگ ہال میں آ چکے تھے اس لیے اس شعبے میں بڑی ہماہمی تھی۔ کچھ چیزیں تو یہ لوگ پہلے ہی تیار کر چکے تھے اور کچھ تازہ تیازہ ضرورت کے مطابق تیار ہو رہی تھیں۔ یہ سارا شعبہ صفائی کے لحاظ سے ممتاز تھا۔ حالاں کہ ہمارے معیار کے مطابق اسے سب سے زیادہ گندہ ہونا چاہیے تھا۔ سیکڑوں طلبہ اور طالبات کھانے کے لیے ڈائننگ ہال میں جمع ہیں — نہ شور، نہ ہنگامہ۔ نہ پلیٹیں بجتی ہیں، نہ سیٹیاں، نہ ہو حق اور نہ غوغا۔ بڑی سلامت روی کے ساتھ

ہر کام انجام پا رہا ہے۔ کیٹرنگ کے محکمے میں سوائے پلیٹوں کی کھنک کے اور وہ بھی لگا ہے گاہے، اور کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی، یہ نظم و ضبط اور یہ خوش سلیقگی فی الواقع قابلِ تقلید ہے۔ زندہ قوموں کے اطوار یہ ہوتے ہیں اور جو قومیں مردہ ہوتی ہیں، ان کے ہر کام میں بھونڈا پن ہوتا ہے۔ میری آرزو ہے اور خدا سے دعا ہے کہ پاکستان کے نظامِ تعلیم میں بھی یہی خوش سلیقگی پیدا ہو جائے اور اس کے اداروں میں بھی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی ایسی عمدہ تربیت کا انتظام ہو کہ اس کا ایک ایک فارغ التحصیل اپنے فن میں ماہر ہو۔

اسٹاف: ۔ اس شعبے میں صدر کے علاوہ چار لکچرر اور تیرہ اسسٹنٹ لکچرر ہیں جن میں سے بعض کے پاس فنی اور پیشہ ورانہ سرٹیفکیٹ کے علاوہ آنرز یا پاس ڈگریاں بھی ہیں۔ مزید برآں وزارت معارف کا ٹیچرز سرٹیفکیٹ تو کم و بیش سبھی کے پاس ہے۔

کامرس اور علوم انصرام

COMMERCE AND MANAGEMENT STUDIES

کیٹرنگ کے مختلف حصوں کو دیکھتے ہوئے ہم لوگ کھانے کے کمرے میں پہونچے۔ ہمارے دوسرے تین ساتھی اپنے رہنما کی معیت میں پہلے ہی سے موجود تھے۔ ہم بھی مسٹر کیمبل کے ساتھ ایک میز کے گرد بیٹھ گئے۔ ہوٹلوں کے دستور کے مطابق ایک طالب علم نے مینو کارڈ پیش کیا۔ اور فرداً فرداً ایک ایک شخص کے کھانے کا آرڈر لکھتا گیا۔ اس کے بعد قرینے سے کھانا چن دیا گیا۔ ہم نے اطمینان سے کھانا کھایا۔ آپس میں خوش گپیاں بھی ہوتی رہیں۔ پرنسپل کی ہدایت کے مطابق ہم لوگوں سے کھانے کے پیسے نہیں لیے گئے۔ لندن کے ہر اسکول، کالج اور اس متعلقہ لائبریریوں میں کھانے کا انتظام ہوتا ہے۔ اس کھانے کی قیمت ہوٹلوں کی نسبت بہت کم ہوتی ہے۔ ایک تو ان میں کاروبار کا سوال نہیں پیدا ہوتا، دوسرے چیزیں تازہ ہوتی ہیں۔ اس وقت تک ہم جن مدرسوں میں گئے حسبِ دستور PAID GUEST ہی رہے۔ یعنی کھانے کی قیمت ادا کر دی۔ اسکولوں میں کھانے کی قیمت ڈیڑھ شلنگ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ یونیورسٹی یونین، اور یونیورسٹی کے مختلف اداروں میں بھی قیمت

دوشلنگ کے لگ بھگ ہوتی ہے۔ بہرصورت یہ پہلا موقع تھا کہ انگلستان میں ہم مہمان تصور کیے گئے۔

کھانا کھانے کے بعد اور کالج کے تفریحی وقفے کے اختتام پر ہمیں کامرس اور علوم انصرام کا شعبہ دیکھنا تھا۔ اس کے متعلق مسٹر ایلین ڈاکٹر اسمتھ سے پہلے ہی گفتگو کر چکے تھے، کھانے کے کمرے سے ہم مسٹر کیمبل کی معیت میں اسٹاف روم گئے۔ یہاں ہماری مختلف لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ تھوڑی دیر تک یہیں بیٹھے ہوئے ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں، ان اداروں کے اسٹاف روم بہت ہی زیادہ آرام دہ ہوتے ہیں بعض اساتذہ پنگ پونگ کھیلتے رہے اور بعض محض تفریحی باتیں کرتے رہے۔

پونے دو بجے ہم لوگ پھر مسٹر ایلین کے کمرے میں پہونچے۔ مسٹر ایلین ہمارے ہی متعلق ڈاکٹر اسمتھ کو پھر فون کر رہے تھے۔ ڈاکٹر اسمتھ سے ایجوکیشن کمیٹی نے ان کے شعبے کے متعلق کچھ اعداد و شمار مانگے تھے۔ اس لیے وہ اس سلسلے میں غیر متوقع طور پر مصروف ہو گئے۔ ہم مسٹر ایلین کے ساتھ ڈاکٹر اسمتھ کے کمرے میں پہونچے جو تیسری منزل پر مسٹر ایلین کے کمرے کے اوپر تھا۔ ڈاکٹر صاحب اپنے کام میں مصروف تھے۔ ان سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے اپنی مصروفیت کے پیش نظر ہم سے معذرت چاہی اور یہ فرمایا کہ اس شعبے کی ایک سینئر لکچرر مس سلتھ اپ میری عدم موجودگی میں آپ کی رہنمائی کریں گی۔ اس کے بعد ڈاکٹر اسمتھ صاحب تشریف لے گئے۔ اور مس اسلتھ اپ نے انھیں کے کمرے میں بیٹھ کر اپنے شعبے کے متعلق بہت سی باتیں بتائیں۔

ان کی یہ گفتگو دراصل مسٹر ایلین کی گفتگو کا تتمہ تھی۔ کالج اور اسکول کے نظام کار میں یا جو باتیں بالخصوص کامرس سے متعلق تھیں ان کا مسٹر ایلین نے اپنی تعارفی گفتگو میں ذکر نہیں کیا تھا۔ مس سلتھ نے ہمیں بعض بظاہر معمولی معمولی چیزیں بتائیں لیکن دراصل یہ سب بجائے خود بہت زیادہ اہمیت رکھتی تھیں۔

شعبے کا پس منظر

ہنڈن ٹیکنیکل اسکول اپنی موجودہ شکل میں زیادہ قدیم نہیں۔ ۱۹۳۹ء میں دوسری عالمگیر

لڑائی شروع ہونے سے کچھ پہلے یہ عمارت مکمل ہوئی۔ لیکن فوجی ضروریات کے پیش نظر اس عمارت کو سول ڈیفنس والوں نے لے لیا اور اختتام جنگ تک اس عمارت میں انہی کے مختلف دفاتر قائم رہے جنگ کے بعد اس عمارت میں دوبارہ تعلیم و تدریس کا کام شروع ہوا۔ چوں کہ لندن کے اور اداروں کی نسبت اس ادارے کی عمارت اتنی زیادہ پرانی نہیں ہے، اس لیے زیادہ بہتر زیادہ کشادہ اور زیادہ خوبصورت ہے۔ یہاں کے اسکولوں میں عام طور پر کھیلنے کے میدان نہیں ہوتے، لیکن اس ادارے کے عقب میں ایک نہایت خوب صورت گھاس کا میدان ہے۔ کالج سے باہر اور گرد نظر دوڑائی جائے تو لندن کے شمالی علاقے کی ہری بھری تصویر اتنی دیدہ زیب معلوم ہوتی ہے کہ دیکھنے والا بڑی دیر تک اس منظر کو دیکھتا رہتا ہے۔ ہنڈن ایک ہرے بھرے پہاڑی پر واقع ہے۔ اس کے سامنے ہی وہ نشیبی وادی ہے جو کسی زمانے میں بہت بڑا ہوائی اڈہ تھی۔ مگر اب چوں کہ آبادی کے بیچ میں آگئی ہے، اس لیے اس سے زیادہ کام نہیں لیا جاتا۔

کامرس اور علوم انصرام کے اس شعبے میں فل ٹائم اور پارٹ ٹائم طلبہ کے لیے بے شمار کورس ہیں۔ ان میں سے چند کی تفصیلات لکھ رہا ہوں تاکہ اس سے کامرس اور اس کے متعلقہ مضامین کی ایک تصویر ہمارے سامنے آجائے۔ ہمارے مدارس میں بلکہ کالجوں میں کامرس کی تعلیم کو اب تک وہ مقام حاصل نہیں ہوا جو اس کا حق ہے۔ لاہور میں صرف ہیلی کالج آف کامرس ہے جس میں کامرس کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام ہے۔ اور شاید اب شیخ عطاء اللہ صاحب پرنسپل اسلامیہ کالج چنیوٹ کی ساعی سے اس سال چنیوٹ میں کامرس کی تعلیم کا انتظام ہو گیا ہو، کیوں کہ جس وقت میں لاہور میں موجود تھا شیخ صاحب کو اس کی پوری پوری امید تو تھی لیکن بعض قانونی الجھنیں اب بھی باقی تھیں۔ یو۔پی کے اسکولوں اور کالجوں میں البتہ کامرس ایک مدت سے ایک اختیاری مضمون کی حیثیت سے جاری ہے۔ ہمارے مدرسوں اور کالجوں میں اس کے اجرا کی نسبتاً زیادہ ضرورت ہے کیوں کہ ملک میں صنعت و حرفت کے فروغ کے ساتھ ساتھ ایسے ماہروں کی زیادہ ضرورت ہوگی جو کاروباری اور انصرامی امور کی ذمہ داری سنبھال سکیں۔

م کورسس :- جو طلبہ فل ٹائم تعلیم حاصل کرنے کے لیے آتے ہیں ان کے واسطے اسس
یں جن کورسوں کا اہتمام ہے ان کی تفصیلات یہ ہیں۔

(1) SECRETARIAL COU

جو طلبہ یا طالبات اس کورس کی تکمیل کرنا چاہتے ہیں، ان کے لیے ضروری ہے کہ انہوں نے
ی۔ای (معمولی درجہ) کا امتحان پاس کرلیا ہو۔ اور ان کی عمر سولہ سال سے زیادہ ہو۔ جو طلبہ
بات اس کورس میں ایک مقررہ حد تک تعلیم حاصل کرتے ہیں اور ان میں اتنی استعداد پید
ہے کہ وہ اونچے درجے کے سیکریٹریل کورس سے استفادہ کرسکیں تو انہیں اس کی
ت دے دی جاتی ہے۔ اس کورس کی مدت ایک سال ہوتی ہے۔

(٢)ADVANCED SECRETARIAL COU

اس کورس میں ان لوگوں کو داخل کیا جاتا ہے جو جی۔سی۔ای (معمولی درجہ) کا امتحان پاس کرچکے
اور اس کے علاوہ تجارت یا کاروباری کاموں میں تھوڑا بہت تجربہ حاصل کرلیا ہو یا اگر تجارتی
وباری تجربہ نہ ہو تو کامرس کے ایک سالہ کورس میں شامل ہو کر اس سلسلے میں ضروری استعداد
لی ہو۔ اس معیار کے طلبہ اور طالبات ہی کو اس کورس میں داخلہ ملتا ہے۔

جی۔سی۔ای (معمولی اعلیٰ، وظیفہ کے مدارج)

اس امتحان میں وہ لڑکے بھی شریک ہوتے ہیں جو انجینرنگ کے شعبے میں تعلیم پاتے ہیں
کامرس کے شعبے میں اس کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے آپ نے ہمیں مختلف جماعتوں کے
کے بعد بڑی سنجیدگی سے یہ فرمایا تھا کہ ان میں سے بیشتر طلبہ وہ ہیں جنھیں گریمر اسکولوں نے
رنے سے انکار کردیا تھا لیکن ہم نے ان کے ساتھ محنت کی اور یہ خود سہ تن کاربن گئے۔ اس لیے
اُن سے اپنی استعداد میں کسی طرح کم نہیں ہیں (اس سلسلہ آپ کی یہ گفتگو آگے چل کر وضاحت
جائے گی)

اس کورس میں طلبہ دو یا تین سال پڑھتے ہیں اور بعض ہوشیار لڑکے تو ایک ہی سال میں

اسے مکمل کر لیتے ہیں۔ یہ ان کی استعداد اور کام کرنے پر منحصر ہے۔

(۴) ڈے کمرشل کورس

اس کورس میں صرف وہی طلبہ شریک ہو سکتے ہیں جن کی عمر پندرہ سال یا اس سے کچھ زیادہ ہو۔ یہ کورس دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک سال اول اور دوسرا سال دوم۔ اگرچہ سال اول بجائے خود ایک مکمل کورس ہے، مگر مناسب یہی سمجھا جاتا ہے کہ طلبہ سال دوم کی بھی تکمیل کر لیں، اور زیادہ تر یہی ہوتا ہے کہ طلبہ دونوں سال مسلسل تعلیم حاصل کرتے رہتے ہیں۔

کامرس کے ان مختلف کورسوں میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں شریک ہو سکتے ہیں کامرس کے شعبے میں ان مخصوص کورسوں کے علاوہ جو دراصل فل ٹائم طلبہ کے لیے مخصوص ہوتے ہیں بعض ایسے بھی کورس ہیں جن سے پارٹ ٹائم طلبہ مستفیض ہو سکیں۔

پارٹ ٹائم کورس

حسب معمول کامرس کے شعبے میں بھی پارٹ ٹائم کورس دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک ڈے کورس اور دوسرا ایوننگ کورس۔

(۱) ڈے کورس

اس کورس میں آٹھ مضامین شامل ہیں جن میں علوم انصرام، نیشنل سرٹیفکیٹ ان کامرس شارٹ ہینڈ اور ٹائپ رائٹنگ اور جی بی۔ ای بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ ان کورسوں میں بالعموم وہ طلبہ اور طالبات شامل ہوتے ہیں جو باقاعدہ کسی کارخانے یا تجارتی مرکز میں کام کرتے ہیں اور روزانہ ایک مخصوص وقت کے لیے کورس کی تکمیل کے لیے کالج آجاتے ہیں۔

(۲) ایوننگ کورس

(ا) پیشہ ورانہ علوم:- ان میں ایسے مضامین شامل ہیں جو تجارت اور صنعت کی دس مختلف ضروریات کو پورا کرتے ہیں۔ (ب) علوم انصرام:- اس کورس میں طلبہ اور طالبات کو ایک تجارتی ادارے کے انتظام اور انصرام کے طریقے اور ان کے اصول و ضوابط سکھائے جاتے ہیں۔ اس

کورس کی تدریس سے بھی کم و بیش چھ مختلف اداروں کی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ (ج) قانون (د) نیشنل سرٹیفکیٹ ان کامرس (ہ) جی سی ای (و) عمرانیات (ز) جدید زبانیں اور (ح) شارٹ ہینڈ اور ٹائپ رائٹنگ۔

ان علوم کی تحصیل کے لیے کم و بیش سات سو طلبہ اور طالبات روزانہ کالج آتے ہیں۔ ہم نے کامرس کے شعبے میں بھی مختلف جماعتوں میں انگریزی، تاریخ، جغرافیہ اور ریاضی کی تدریس دیکھی لیکن ان جماعتوں میں بھی وہی ماحول تھا جو میں ٹیکنیکل کالج کے سلسلے میں بیان کر چکا ہوں۔ کام کا انہماک اور ذوق و شوق وہی۔ جو طلبہ جی سی ای کی تیاری میں مصروف تھے، وہ قدرے اور زیادہ مستعد معلوم ہوتے تھے۔

تعلیمی عدم توازن۔

کالج کے اس شعبے کے دیکھنے کے بعد ہم سب پھر ڈاکٹر اسمتھ کے کمرے میں واپس آئے۔ یہاں ہم لوگ مس سلنتھ اپ سے مختلف موضوعات پر بحث کرتے رہے، دوران بحث میں گریمر اسکول کا ذکر آیا۔ ہمارے ایک ساتھی نے پوچھا کہ گریمر اسکول کے طلبہ کو ذہنی طور پر بڑا اونچا تصور کیا جاتا ہے۔ کیا یہ ہر وقت اور ہر حالت میں صحیح ہے۔ مس سلنتھ اپ نے اس سلسلے میں جن خیالات کا اظہار کیا اس سے ممکن ہے گریمر اسکول کے اساتذہ اتفاق نہ کریں، لیکن اگر حقائق کا صحیح جائزہ لیا جائے تو واقعات کچھ اس قسم کے ہیں۔ گیارہ سال کی عمر میں بچوں کا ایک عمومی امتحان ہوتا ہے۔ اس امتحان کے بعد ذہین اور ہوشیار لڑکے گریمر اسکول میں اور کم ذہین طلبہ دوسرے مدرسوں میں چلے جاتے ہیں لیکن ان کم ذہین بچوں میں بھی آگے چل کر بعض بہت اچھے ثابت ہوتے ہیں۔ مثلاً مس سلنتھ اپ نے ہمیں تین چار ایسے بچوں کو دکھایا جو گریمر اسکول میں داخل نہیں ہو سکے تھے، دو سال تک انہوں نے سیکنڈری ماڈرن اسکولوں میں تعلیم پائی۔ اس کے بعد وہ اس ادارے میں داخل ہوئے معمول کے مطابق انہیں چار سال بعد جی سی ای کا امتحان دینا چاہیے تھا لیکن ہم نے انہیں ایک سال قبل اس امتحان میں بٹھایا اور آپ لوگوں کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ ان چاروں نے اسکالرشپ لیول کا

امتحان دیا اور اس میں کام یاب رہے۔ اس کے بعد مس سلفنداپ نے پچھلے سال کے طلبہ کی کام یابی کی فی صد مضمون وار کے اعداد و شمار سنائے، اس کی تفصیل یہ ہے۔

جی سی۔ ای امتحان ۱۹۵۴ء

مضمون	طبیعیات	کیمیا	ریاضی	انگریزی زبان	انگریزی ادب	فرانسیسی	تاریخ	شہریت	گھریلو کی صنعت	کامرس
فی صد	۹۷	۸۴	۱۰۰	۷۷	۷۸	۵۸	۸۹	۷۹	۷۸	۹۷½

جی سی۔ ای کے امتحان میں یہ ضروری نہیں کہ طلبہ ہر مضمون کے امتحان میں شریک ہوں۔ ان میں سے وہ دو یا چار مضامین میں بھی شریک ہو سکتے ہیں، اس لیے مضمون وار نتیجے ہی سے طلبہ کی کامیابی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مضامین میں سب سے کم فی صد فرانسیسی زبان کی ہے جو انگریزوں کے لیے اتنی مشکل نہیں جتنی ہمارے لیے انگریزی ہے کیوں کہ انگریزی زبان ادب فرانسیسی سے زیادہ متاثر ہے اور عام طور پر انگریز آسانی سے فرانسیسی سیکھ لیتے ہیں۔ فرانسیسی زبان کی ہنوز تدریس اور مقبولیت کی ایک وجہ یہ ہے کہ یورپ میں انگریزی بہت کم کبھی بولی جاتی ہے۔ فرانسیسی آج بھی یورپ کی مختلف اقوام و ملل کے لیے افہام و تفہیم کا واحد ذریعہ ہے۔

فرانسیسی کے علاوہ دوسرے مضامین میں بچوں کی کام یابی خاصی اچھی ہے، اور اس وقت تو اس کے اچھے ہونے میں شبہ ہی باقی نہیں رہتا، جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ گرامر اسکول کے ارباب رائے نے انہیں ذہنی اعتبار سے پست قرار دیا تھا کہ یہ گرامر اسکول کی تعلیم سے متمتع نہیں ہو سکتے۔ مس سلفنداپ نے اس کے بعد گرامر اسکول کی ضروریات یا عدم ضرورت کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ہمارے دو ساتھی جو نائجیریا کے رہنے والے ہیں اور چوں کہ ان کے یہاں انگریزی نظامِ تعلیم کی ہوبہو پیروی کی جاتی ہے، اس لیے انہوں نے اس گفتگو میں زیادہ چڑھ کر حصہ لیا۔ بعض ان حالات کے پیشِ نظر کہ وہ طلبہ جو گرامر اسکولوں کی تعلیم کے اہل نہیں سمجھے جاتے لیکن دراصل گرامر اسکول کے بعض طلبہ سے بہتر ہوتے ہیں۔ کیا گرامر اسکولوں کی موجودہ حیثیت کو قائم رکھنا ضروری ہے، یہ ایک ایسا سوال ہے جس کے متعلق آج برطانیہ کے ہر گوشے سے آوازیں اٹھ رہی ہیں۔ ہم نے

ہنلڈن کالج میں تعلیم و تربیت کا جو معیار دیکھا، اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ بچوں کو ہر صورت بہتر بنایا جا سکتا ہے اس کے لیے گریمر اسکول ہی ضروری نہیں۔ گیارہ سال کی عمر میں جو امتحان ہوتا ہے، اسے طلبہ کی تعلیمی زندگی کی آخری منزل بنا دینا مناسب نہیں اور یہی ایک چیز ہے جس کی اصلاح کے متعلق آج ماہرین تعلیم کے علاوہ دوسرے ارباب فکر و رائے بھی بڑے عزم و حوصلے کا ثبوت دے رہے ہیں۔

ٹائپ :۔ میں نے پہلے بھی تحریر کیا ہے کہ کامرس کے شعبے میں بھی ٹیکنیکل حصے کی طرح مختلف مضامین کی تدریس ہوتی ہے۔ مندرجہ بالا خاکے سے اس کی تفصیلات کا اندازہ ہو جائے گا۔ ہم نے اس شعبے میں بھی اسی طرح ایک ایک جماعت کو پڑھتے اور کام کرتے دیکھا، لیکن چوں کہ دونوں شعبوں میں تعلیم و تدریس کا طریقہ ایک ہی ہے اور معیار بھی ایک ہی ہے، اس لیے دوبارہ ہر مضمون کی تدریس کے متعلق لکھنا موزوں معلوم نہیں ہوتا۔ اس شعبے میں ٹائپ رائٹنگ کی جماعت البتہ ایک ایسی جماعت ہے جس کا اب تک ذکر نہیں ہوا۔

ٹائپ رائٹنگ کے کورس اور اس کی تدریس و امتحان کا سرسری ذکر ہو چکا ہے، ہم اس سلسلہ میں ایک استاد کے ساتھ اس قسم کی دو جماعتوں میں گئے۔ یہاں ٹائپ رائٹنگ کی جماعتوں میں بالعموم طالبات ہوتی ہیں۔ ایک جماعت ایسی طالبات کی تھی جو اسی سال امتحان دینے والی ہے۔ جس وقت ہم لوگ جماعت میں پہنچے تو ہمیں معلوم ہوا کہ ان کی استانی نے انہیں ایک عبارت ٹائپ کرنے کے لیے دی ہے جو انہیں دس منٹ میں مکمل کرنی ہے، چناں چہ ہم لوگ تھوڑی دیر تک کھڑے رہے۔ کام میں اس قدر انہماک تھا کہ ان میں سے ایک ایک مقررہ وقت سے پہلے ہی ختم کرنے کی فکر میں تھی۔ دس منٹ بعد استانی کے اشارے ہی کے ساتھ مشینوں کی آواز بند ہو گئی۔ اور ہر لڑکی کی ٹائپ کی ہوئی عبارتیں فوراً ہی استانی کے پاس آ گئیں۔ اس جماعت میں ایک وقت میں تیس طالبات کام کر سکتی ہیں۔

اسٹاف :۔ کامرس کے شعبے میں بھی اسٹاف کی تعداد کم و بیش وہی ہے جو ٹیکنیکل شعبے میں ہے۔ اساتذہ بالعموم گریجویٹ یا انڈر گریجویٹ ہیں، اس کے علاوہ ان کے پاس ان کی اپنی پیشہ ورانہ

ڈگریاں بھی ہیں۔

تعلیم بالغاں

انگلستان میں تعلیم بالغاں کی نوعیت بالکل مختلف ہے۔ یہاں بوڑھوں کو حروف شناسی یا لکھنا پڑھنا نہیں سکھایا جاتا کیوں کہ یہاں سولہ سال کی عمر تک تعلیم مفت اور لازمی ہے۔ اس مدت میں طلبہ لکھنا پڑھنا سیکھ جاتے ہیں اور اپنی کاروباری زندگی میں حصہ لینے کے اہل ہو جاتے ہیں۔ ہنڈن ٹیکنیکل کالج میں تعلیم بالغاں سے وہ تعلیم مراد ہے جو ایسے بالغ مرد اور عورت حاصل کرنا چاہتے ہیں جو اپنے پیشے میں داخل ہو چکے ہیں اور اس میں مزید مہارت پیدا کرنے کے لیے ان کورسوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اس سے ایک آسانی یہ ہوتی ہے کہ ان کورسوں سے وہ لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں، جنہوں نے سولہ سال کی عمر کے بعد تعلیم جاری رکھنے کے اہل نہ ہونے کی وجہ سے کہیں ملازمت کر لی اور اب وہ اپنے پیشے میں مزید ترقی کے لیے کچھ تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں کی سہولتوں کے لیے ہنڈن ٹیکنیکل کالج میں حسب ذیل مضامین کی تدریس اور عملی تربیت کا انتظام موجود ہے۔

(1) ARCHAELOGY (2) ENGLISH (3) ENGLISH FOR FOREIGNERS. (4) GREEK (5) HORTICULTURE (6) LATIN. (7) LIBRARY (8) MOTOR REPAIRS (9) MUSIC. (10) PUBLIC SPEAKING (11) SOCIOLOGY THEATRE.

ان کورسوں میں داخل ہونے والوں کے لیے صرف ایک ہی عمومی شرط ہے کہ پڑھنے والے کی عمر سولہ سال سے زیادہ ہونی چاہیے۔ نیز یہ کہ جو لوگ کہیں کام کرتے ہیں اور اپنے پیشے کے متعلق ہی مزید تربیت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ان کے کام کی رپورٹ ان کے آجر کو بھی بھیجی جاتی ہے۔ ان میں سے حسب معمول بعض کورس فل ٹائم ہیں اور بعض پارٹ ٹائم۔ پارٹ ٹائم میں بعض مضامین کی تدریس دن میں ہوتی ہے اور بعض کی شام کے وقت۔

نظم و ضبط: — لندن کے عام اسکولوں میں نظم و ضبط کے مسائل قدرے مختلف ہیں۔ اگرچہ

انسان کی فطرت ہر علاقہ اور ہر ماحول میں ایک ہی ہوتی ہے۔ لیکن پھر بھی صحیح تعلیم و تربیت کا اس پر ایک اچھا اثر پڑتا ہے، اس ادارے میں بقول مسٹر ایلین پچھلے دس سال میں کوئی ایسا ناگوار واقعہ نہیں ہوا، جو ادارے کے انتظام کاروں کے لیے پریشان کن ثابت ہوا ہو۔ اکا دکا معمولی واقعات ہوتے رہتے ہیں جسے ہم حتی المقدور آسانی سے سلجھا لیتے ہیں۔ میں نے یہاں اب تک کسی مدرسے میں بچوں کو یوں ہی پھرتے نہیں دیکھا۔ تفریحی وقفے میں ضرور آپ کو بچے گروہ در گروہ خوش فعلیاں کرتے ہوئے مل جائیں گے لیکن برخاد کے الفاظ میں "ولپ ڈگی" والی فضا یہاں کہیں دیکھنے میں نہیں آتی۔ ان مدرسوں کی فضا اس وقت تک بچوں کو نظم و ضبط کا اتنا خوگر بنا دیتی ہے کہ اسے وہ اپنی ذمہ داری سمجھنے لگتے ہیں۔ بلکہ حق یہ ہے کہ شروع ہی سے انہیں اس قسم کی تربیت دی جاتی ہے کہ اس ماحول سے بغاوت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ان کے گھریلو ماحول اور مدرسے کے ماحول میں تضاد نہیں، ایک قسم کی ہم آہنگی ہوتی ہے، اس کے برعکس ہمارے یہاں مدرسے کا ماحول کچھ ہوتا ہے اور گھر کا ماحول کچھ۔ ان کے مابین بچے کی شخصیت پس کر رہ جاتی ہے۔

لائبریری:- طلبہ کی سہولت کے لیے ہر شعبے کی لائبریری علاحدہ علاحدہ ہے۔ ان میں ان مضامین سے متعلق جدید ترین لٹریچر موجود ہے جو یہاں پڑھائے جاتے ہیں بشلاً انگریزی کا درس اور ٹیکنیکل دونوں شعبوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ اس لیے اس کے متعلق دونوں کتب خانوں میں کتابیں مل جاتی ہیں، اس سلسلے میں ایک احتیاط یہ رکھی جاتی ہے کہ ایک ہی کتاب دونوں میں نہ آجائے یہ مختلف کتب خانے ایک مرکزی نظام کے ماتحت ایک ہی لائبریرین کے تابع ہیں۔ یہاں طلبہ بیٹھ کر پڑھ بھی سکتے ہیں اور مستعار بھی لے سکتے ہیں۔

المختصر ہیڈن ٹیکنیکل کالج ایک کثیر المقاصد ادارہ ہے جس میں مقامی ضروریات کے مطابق ہر قسم کے مضامین اور پیشوں کی تدریس و تربیت کا اہتمام ہے۔ اس سے علاقے کی صنعتی، پیشہ ورانہ اور تعلیمی ضروریات پوری ہوتی رہتی ہیں، اس قسم کے اداروں کا قیام اگرچہ ہمارے ملک میں ابھی مشکل ہے لیکن اب وقت ہے کہ اس کی داغ بیل ڈالی جائے۔ دنیا بڑی تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا ہمارے قدم بھی اس تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں؟

میں اور میری بیٹی

شبیر احمد قادری

فوزیہ :- اباجی الجبرا کیا ہوتا ہے؟

میں :- کیوں بیٹی! تمہیں الجبرے کی کیا ضرورت پیش آگئی؟

فوزیہ :- اب میں ساتویں (جماعت) میں ہوں نا۔ اب ہمیں الجبرا پڑھایا جائے گا۔

میں :- یہ بھی حساب کی طرح کی ایک چیز ہے۔

فوزیہ :- کیا بہت مشکل ہوتا ہے؟

میں :- جو چیز سمجھ میں آجائے اور جس پر محنت کی جائے وہ چیز آسان ہو جاتی ہے۔

فوزیہ :- میری سہیلی نسرین آٹھویں میں پڑھتی ہے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ الجبرا بہت مشکل ہوتا ہے

میں :- بالکل غلط۔ الجبرا تو بہت آسان چیز ہے اور بہت دلچسپ۔ جاؤ کاپی اور پنسل لے آؤ میں تمہیں ابھی بتا دیتا ہوں کہ الجبرا کتنا آسان مضمون ہے۔

فوزیہ کاپی اور پنسل لے آئی۔ میں نے کاپی پر مندرجہ ذیل عبارت لکھی:۔

"وہ نہ معلوم رقم بتاؤ جس میں ۱۰ جمع کریں تو ۱۵ ہو جائے"

فوزیہ نے بتادیا کہ وہ نہ معلوم رقم ۵ ہے۔

اب میں نے اس سے کہا کہ عبارت کے جس حصے کے نیچے خط کھینچا ہوا ہے۔ وہ بہت لمبا ہے اور اس کی بجائے حرف لا لکھ دیں تو آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً

نہ معلوم رقم + ۱۰ = ۱۵ کی بجائے اگر ہم

لا + ۱۰ = ۱۵ لکھ دیں تو وقت بچ جاتا ہے۔

پھر اسے سمجھایا کہ ۱۰ کو مساوات کی علامت کے دوسری طرف لے جاتے ہیں۔ اور

۱۰ کی علامت کو بدل دیتے ہیں یعنی اب سوال کی شکل یہ ہو گئی -

لا = ۱۵ - ۱۰

یعنی لا = ۵

گویا جواب وہی آگیا جو اس نے زبانی بتادیا تھا۔ اور آیا بھی پندرہ میں دس گھٹا کر جیسا کہ اس نے اپنے ذہن میں پہلے کیا تھا

اب میں نے دوسرا قدم اٹھایا۔ اور کاپی پہ مندرجہ ذیل فقرہ لکھ دیا :-

”وہ نہ معلوم رقم بتاؤ جس میں سے ۸ گھٹا دیں تو ۱۲ رہ جائے“

فوزیہ نے اس کا جواب زبانی بتادیا یعنی ۲۰

میں نے کہا اب اسے لا کے طریقے سے اس طرح لکھیں گے :-

لا - ۸ = ۱۲

اور یعنی ۸ کو مساوات کی علامت کے دوسری طرف لے جائیں گے اور یعنی ۸ کی علامت بدل کر لکھ دیں گے۔ یعنی سوال کی شکل اب یہ ہو گئی :-

لا = ۱۲ + ۸

یعنی لا = ۲۰

اسی طرح چند مثالیں اس کو دیں اور وہ لا کی قیمت نکالنے لگی۔ اب میں نے تیسرا قدم اٹھایا اور کاپی پہ ذیل کی رقم لکھ دی :-

۴لا + ۳لا =

اب اس سے جواب پوچھا۔ وہ نہ بتا سکی۔ میں نے کہا کہ چار لڈو اور تین لڈو کتنے لڈوؤں کے برابر ہوئے ؟

اس نے جواب دیا ”سات لڈو“

میں نے کہا کہ لا کو لڈو سمجھ لو اور بتاؤ کہ چار لا جمع تین لا کتنے لا کے برابر ہوئے ؟

اس نے جواب دیا "سات Y"

اب میں نے ذرا لمبی رقم لکھ دی

$$= Y۴ - Y۲ + Y۸$$

اس نے جواب صحیح بتا دیا۔ اس کے بعد ایک اور زیادہ لمبی رقم لکھی۔

$$= Y۲ - Y۵ + Y۳ - Y۷$$

اور اسے سمجھایا کہ (i) جس عدد کے پہلے کوئی علامت نہ ہو اسے جمع تصور کیا جاتا ہے۔

(ii) جو عدد جمع کی علامت والے ہیں۔ انہیں آپس میں جمع کر لیا جاتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور جو عدد نفی کی علامت والے ہیں انہیں آپس میں جمع کر کے پہلے مجموعے میں سے گھٹا دیتے ہیں یعنی :-

$$Y۷ = Y۲ - Y۵ + Y۳ - Y۷$$

پھر اسے یہ سمجھانے کے لیے کہ الجبرے میں نفی کی علامت پہلے بھی آ سکتی ہے۔ اسی رقم کو آگے پیچھے کر کے لکھ دیا۔ یعنی :-

$$Y۷ = Y۲ - Y۵ + Y۷ + Y۳ -$$

اور سمجھا دیا کہ جواب میں کوئی فرق نہیں ہوا۔

چوتھا قدم - نفی اعداد تصور واضح کرنے کے لیے اسے یہ سمجھایا گیا :-

اگر تمہیں کسی کے پانچ روپے دینے ہوں اور کسی اور کے چھ روپے دینے ہوں تو تم گیارہ روپے کی مقروض ہو۔ الجبرے کی زبان میں کہا جائے گا کہ تمہارے پاس نفی گیارہ روپے ہیں اور اگر تمہارے پاس پانچ روپے ایک صندوق میں ہوں اور چھ روپے تمہاری جیب میں ہوں تو تمہارے پاس جمع گیارہ روپے ہیں۔ اس طرح سے اس کو معلوم ہو گیا کہ

$$Y۱۱ - = Y۶ - Y۵ -$$

اور $$Y۱۱ = Y۶ + Y۵$$

پانچواں قدم :۔ دلچسپی پیدا کرنے کے لیے اسے حسبِ ذیل سوال لکھ کر دیا گیا :۔

کسی نے فوزیہ سے اس کے باپ کی عمر پوچھی۔ فوزیہ نے جواب دیا۔ میری عمر تیرہ سال ہے میرے باپ کی عمر مجھ سے اڑتیس سال زیادہ ہے۔ تو فوزیہ کے باپ کی عمر بتاؤ۔

اس کا حل الجبرے کے لحاظ سے حسبِ ذیل طریقے سے کرنا بتایا گیا :۔

فرض کیا باپ کی عمر = ی سال

∴ ی = ۱۳ + ۳۸

یا ی = ۵۱

پھر یہی سوال دوسرے الفاظ میں لکھ کر دیا گیا :۔

کسی نے فوزیہ سے اس کے باپ کی عمر پوچھی۔ فوزیہ نے جواب دیا کہ اگر میرے باپ کی عمر میں سے ۳۸ سال گھٹا دیے جائیں تو میری عمر آجائے گی اور میری عمر ۱۳ سال ہے۔ پھر اس کا حل بتایا گیا۔

فرض کیا فوزیہ کے باپ کی عمر = ی سال

∴ ی − ۳۸ = ۱۳

یا ی = ۱۳ + ۳۸

یا ی = ۵۱

چھٹا قدم :۔ اب اسے حسبِ ذیل رقم لکھ کر دی گئی :۔

۸ی + ۴ب + ۳ی + ۲ب =

وہ اس کو حل نہ کر سکی۔ اسے سمجھایا گیا کہ :۔

۸ لڈو اور ۳ لڈو آپس میں جمع کیے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح ۴ بکریاں اور ۲ بکریاں بھی آپس میں جمع کی جا سکتی ہیں۔ مگر لڈو اور بکریاں جمع نہیں کی جا سکتیں۔ پس

۸ی + ۴ب + ۳ی + ۲ب = ۱۱ی + ۶ب

درسی کتاب کا انتخاب

فضل احمد

تدریس کی خوبی جن عناصر پر موقوف ہے ان میں درسی کتاب کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے یہی وجہ ہے کہ بعض لوگوں نے اسے "طبع شدہ نائب مدرس" کا نام دیا ہے، ایک اچھی درسی کتاب یقیناً استاد کی بہترین معاون ثابت ہوتی ہے۔ مگر وہ خود استاد کا مقام کبھی نہیں لے سکتی بعض استاد اور مدرسے اپنے ناتسلی بخش نتائج کی ذمہ داری غیر موزوں درسی کتابوں کے سر تھوپ دیا کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اچھی سے اچھی درسی کتاب بھی اکیلی سب کچھ نہیں کر سکتی اس کے پورے امکانات سے فائدہ اٹھانے کے لیے اچھے کتب خانوں کی سہولتوں۔ حوالے کی کتابوں، بصری امدادوں اور استاد کی رہ نمائی کی ضرورت ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود اس امر میں کلام نہیں کہ درسی کتاب استاد کا اہم ترین اوزار ہے لہٰذا اس کے انتخاب میں پوری ہوشمندی سے کام لینا چاہیے۔ کسی درسی کتاب کے انتخاب سے پہلے اس کی اچھی طرح چھان بین ہونی چاہیے اور اس بات کا اطمینان کر لینا چاہیے کہ وہ اپنے متوقع استعمال کے لیے سہل زود اثر اور کافی ثابت ہوگی۔

کیا کچھ دیکھنا چاہیے؟

کسی درسی کتاب پر غور کرتے وقت اس کے مندرجہ ذیل پانچ پہلوؤں پر غور کرنا چاہیے۔

(۱) تنظیم (۲) مندرجات (۳) اسلوب استخدام (۴) تصویریں (۵) ظاہری شکل و صورت

تنظیم پر ایک نگاہ۔ سب سے پہلی نگاہ کتاب کے موضوعات اور ان کی ترتیب پر ڈالی جانی چاہیے۔ جس نصاب کے لیے کتاب کی تلاش ہے اس کے مقاصد کیا ہیں؟ اس مضمون کے کون کون سے حصے پڑھانے مقصود ہیں۔ زیر غور کتاب مضمون کے ان حصوں کے ساتھ کہاں تک بحث کرتی ہے؟۔

کیا اس میں کچھ ایسے زائد موضوعات بھی شامل ہیں جو مجوزہ نصاب کے لیے کارآمد ثابت ہوں گے؟
کیا اس میں کچھ ایسے زائد موضوعات تو شامل نہیں جو مجوزہ نصاب میں خارج ثابت ہوں۔
کتاب کی تنظیم کی قدر و قیمت جانچتے وقت دیکھنے کی بات یہ ہے کہ مصنف نے جو موضوعات چنے ہیں وہ نصاب کی ضروریات کے ساتھ کس حد تک مطابقت رکھتے ہیں، وہ طلبہ کے لیے کہاں تک دل چسپ اور مفید ہو سکتے ہیں، ان سوالوں کے جواب تلاش کرتے وقت یہ نہ بھولنا چاہیے کہ مصنف اور ناشر نے بے شمار موضوعات کو جانچ تول کر اپنا فیصلہ کیا ہے۔ جہاں استاد کو موضوعات کی ترتیب سے کچھ اختلاف ہو، وہاں اس کے سامنے یہ راستہ کھلا رہے گا کہ کتاب سے کام لیتے وقت وہ اپنی پسند کی ترتیب اختیار کر لے۔
بعض کتابوں کی تقسیم مختلف ابواب میں کی گئی ہوتی ہے۔ ہمارے ملک میں عام کتابوں کی تنظیم اسی طرز پر کی جاتی ہے۔ لیکن مغربی ملکوں میں بہت سی درسی کتابیں موضوعات کی وحدتوں میں منقسم ہوتی ہیں، اس تقسیم کی بڑی سہولت یہ ہے کہ مطالعہ اور امتحان دونوں اغراض کے لیے مضمون زیر بحث کے بڑے بڑے ہم آہنگ پہلو یئے بنائے مل جاتے ہیں۔

مندرجات کی جانچ پڑتال

کتاب کی تنظیم کے متعلق اطمینان کر لینے کے بعد اگلا کام اس کے مندرجات کی چھان بین ہے۔ یہ کام انجام دیتے وقت طلبہ کی ذہنی پختگی، علمی استعداد اور ان کا مخصوص ماحول پیش نظر رہنا چاہیے، استاد کو خصوصیت کے ساتھ ان سوالوں کے جواب تلاش کرنے چاہئیں:-
کیا خیالات کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے؟ کیا نئے خیالات اور تصورات کو قدرتی ترتیب دی گئی ہے یا نہیں ویسے ہی جگہ بہ جگہ بکھیر دیا گیا ہے؟ کیا ان چیزوں کو اسی انداز میں پیش کیا گیا ہے جس میں آپ پیش کرنا چاہتے ہیں؟ کیا کتاب کی زبان اس حد تک صاف اور آسان ہے کہ طلبہ اس سے خود استفادہ کر سکیں؟ کیا اسلوب تحریر میں ایسی رعنائی اور انداز بیان میں ایسی دل کشی ہے کہ بچوں کی دل چسپی مسلسل قائم رہ سکے۔

ایک اور اہم قابل غور چیز یہ ہے کہ کیا کتاب کا مطالعہ ایسی سابقہ واقفیت کا مطالبہ تو نہیں کرتا جو طلبہ کو حاصل نہیں؟ تقریباً اسی قدر اہم یہ امر ہے کہ کیا کتاب اس طور پر تو نہیں لکھی گئی کہ کسی سابقہ واقفیت کا سرے سے مطالبہ ہی نہ کرے؟ ایک اچھی کتاب ان دونوں انتہاؤں کے بین بین ہو گی۔ یہ طلبہ کے ذہنی پس منظر سے کام بھی لے گی اور اس پس منظر کو کشادہ بھی کرے گی۔

انداز استحصار کا جائزہ:- جدید درسی کتابیں مخصوص طریقہ ہائے تدریس کو سامنے رکھ کر لکھی جاتی ہیں۔ ہر درسی کتاب اپنے مندرجات کو کسی خاص طریق تدریس کے مطابق مرتب کرے گی استاد کو یہ دیکھنا چاہیے کہ درسی کتاب کا طریق اس کے مقاصد، اس کے طلبہ اور خود اس کے اپنے لیے کسی حد تک حسب حال ہے۔ اگر کتاب ایسے مصنف کی لکھی ہوئی ہے جو جدید تعلیمی فکر سے پوری طرح آگاہ ہے۔ اور خود ایک ماہر استاد ہے تو اس کا طریق عموماً موثر اور کارآمد نظر آئے گا۔

درسی کتاب کا اختیار کردہ طریق نہ صرف استاد کے مقاصد کے مطابق ہونا چاہیے۔ بلکہ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ جدید نظریوں پر مبنی ہو۔ ایک اچھی درسی کتاب اس بات کی گنجائش پیدا کرے گی کہ طلبہ تدریس کی منصوبہ بندی اور نئے تصورات کی ترقی میں حصہ لیں۔ وہ اپنے مندرجات کو مختلف عملی طریقوں سے طلبہ کی زندگی اور مختلف مضامین کے ساتھ مربوط کرے گی۔

ایک اچھی درسی کتاب کا یہ بھی فرض ہے کہ دوسرے ماخذوں سے تصورات اخذ کرنے اور انہیں اپنے مباحث کے ساتھ منسلک کرنے کا سامان پیدا کرے۔ کسی درسی کتاب کو واقعات وحقائق کا واحد منبع ہونے کا دعویٰ نہ کرنا چاہیے۔ بلکہ دوسرے ماخذوں کی نشان دہی کرنے کے ساتھ ان سے کام لینے کا شوق بھی پیدا کرنا چاہیے۔ یہ غایت حاصل کرنے کے لیے یہ کافی نہیں کہ درسی کتاب واقعات وحقائق کو بیان کر دے۔ بلکہ اسے چاہیے کہ

انہیں ایسی فکر انگیز شکل دے کہ ان کی بدولت تخیل کی نئی وادیاں کھلنے لگیں۔ قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کا شوق پیدا ہو، عام نتائج اخذ کیے جائیں۔ حقائق کے نچوڑ تیار کیے جائیں۔ اور ان سے عملی کام لیا جائے۔

ہر درسی کتاب بعض عملی سرگرمیاں تجویز کرے گی۔ ان پر اچھی طرح تنقیدی نگاہ ڈالنی چاہیے۔ کیا مجوزہ سرگرمیاں ایسی ہیں جو طلبہ کو ابھارنے والی، ان کے دلوں میں شوق پیدا کرنے والی، اور ان کے لیے عملی اہمیت رکھنے والی ہوں؟ کیا یہ سرگرمیاں آپ کے طلبہ اور ان کے ماحول کے لیے موزوں اور قابل عمل ہیں؟ مجوزہ سرگرمیوں میں سے بدیہی طور پر بعض اس قدر آسان ہونی چاہئیں کہ جماعت کا ہر طالب علم ان میں حصہ لے سکے اور بعض اس قدر دشوار کہ وہ زیادہ ذہین اور تیز طبع طلبہ کے ذوق عمل کو مصروف کار رکھ سکیں۔ تاہم مجوزہ سرگرمیوں کی اتنی بھرمار نہ ہونی چاہیے کہ ان سب پر عمل پیرا ہونا ناممکن نظر آنے لگے۔

تصویروں کی موزونیت:۔ استاد کو اس بات کا اچھی طرح خیال رکھنا چاہیے کہ وہ محض تصویروں کی تعداد یا ان کے بھڑکیلے رنگوں ہی سے دھوکہ نہ کھا جائے۔ تصویر کی اصل غرض درسی کتاب کے مندرجات کی وضاحت کرنا ہے اور بس۔ ہر تصویر اس غرض کو پورا نہیں کرتی۔ اگر تصویریں محض زیبائش کے لیے بڑھا دی گئی ہیں تو وہ درسی کتاب کی تصویروں کا مقصد پورا نہیں کر سکتیں۔ تصویروں کے متعلق یہ تعین کر لینا چاہیے کہ وہ طلبہ کے لیے موزوں ہوں، تدریس میں کام دینے والی ہوں اور تعداد میں اتنی ہوں کہ استاد کو آئے دن بصری امدادوں کی فراہمی کے دردسر سے بچا دیں۔

تاہم یہ یاد رکھنا چاہیے کہ کوئی درسی کتاب بھی اتنی تصویریں مہیا نہیں کر سکتی جتنی شاید آپ ضروری سمجھیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ ہر طبع شدہ صفحہ کے لیے تصویر کا ایک صفحہ ہو۔ لیکن بعض اوقات یہ بھی ممکن ہے کہ ایک طبع شدہ صفحہ کے لیے ایک سے زیادہ تصویریں ضروری سمجھی جائیں۔ ہر تصویر اپنے موضوع سے اس قدر قریب ہونی چاہیے جتنی قریب یہ رکھی جا سکے۔ تصویروں کے نیچے درج شدہ وضاحتی عبارت فکر انگیز، دلچسپ اور کارآمد ہونی چاہیے۔

بعض درسی کتابوں میں نقشے اور چارٹ بھی دیے ہوتے ہیں۔ قابل ترجیح نقشے اور چارٹ وہی ہوں گے جو صرف ایک چیز کی وضاحت کے لیے مخصوص ہوں۔ جہاں ایک ہی ساتھ بہت سی چیزوں کی وضاحت کی کوشش کی جائے گی، وہاں خوامخواہ علامتوں کی بھرمار پیدا ہو گی، جو عموماً ذہنی پریشانی پیدا کرے گی۔

عام شکل و شباہت:۔ اگرچہ درسی کتاب کی بنیادی خوبیاں یہی چار ہیں جن کا اوپر ذکر گذر چکا ہے تاہم اگر ان خوبیوں کے ساتھ کتاب دیدہ زیب اور پائدار بھی ہو تو یہ ایک زائد خوبی ہو گی، دیدہ زیبی کا انحصار اکثر اوقات مقامی ذوق پر ہوتا ہے، اگرچہ ابھی تک کوئی ایسا تجرباتی مطالعہ نہیں کیا گیا جس سے یہ ثابت ہو کہ بچے رنگین تصویروں والی کتاب میں سے دوسری کتاب کی نسبت زیادہ جلد مطالب اخذ کرتے ہیں۔ تاہم اس میں کلام نہیں کہ رنگین تصویریں بچوں کے لیے کشش رکھتی ہیں۔ اساتذہ عموماً یہ مطالبہ بھی کرتے ہیں چھوٹے بچوں کی کتابیں زیادہ جلی حروف میں لکھی جائیں۔ تجرباتی مطالعوں نے ثابت کیا ہے کہ جب بچے پڑھنا سیکھ جائیں تو ان کے لیے بہترین خط تقریباً وہی ہے جو بالغ لوگوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

انتخاب اساتذہ کا حق ہے۔

ترقی یافتہ ملکوں میں درسی کتاب کا انتخاب اساتذہ کی ذمہ داری ہے، دوسری عالمی جنگ سے پہلے فسطائی ملکوں میں درسی کتابیں وزارت تعلیم کی طرف سے مقرر کی جاتی تھیں، لیکن فسطائیت کی شکست کے بعد جاپان، اطالیہ اور جرمنی وغیرہ میں بھی یہ اصول تسلیم کر لیا گیا ہے کہ بہترین درسی کتابیں صرف کھلے مقابلے ہی میں پیدا ہو سکتی ہیں۔

ہمارے یہاں صورت حال اس کے برعکس ہے۔ قیام پاکستان سے پہلے محکمہ تعلیم اور یونیورسٹی بعض کتابیں منظور ضرور کرتے تھے، لیکن مدرسوں کے لیے کوئی خاص کتابیں مقرر نہیں کی جاتی تھیں۔ اب محکمہ تعلیم کلی طور پر مقرر کردہ کتابوں کی حکمت عملی اختیار کر چکا ہے اور بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن بھی اسی راہ پر چلنے کا ارادہ ظاہر کر رہا ہے، اس طریق کار میں بے شک

بہت سی خوبیاں ہوں گی لیکن یہ استاد کو اس کے ایک اہم حق سے محروم کرتا ہے جس شخص کو بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ذمہ دار گردانا جاتا ہے۔ جمہوری معاشرے میں اسے یہ حق بھی ملنا چاہیے کہ وہ اپنی پسند کے اوزاروں سے کام کرے۔ اسے اس اختیار سے محروم کرنا اس کی قوتِ فیصلہ کی صحت مندی اور اس کی دیانت پر شک کرنے کے مترادف ہے۔ یہ مفروضہ جمہوری تعلیم کی نشو و نما کی راہ میں ایک رکاوٹ ہے۔

درسی کتابوں کے متعلق موجودہ حکمت عملی کے آغاز سے پہلے کتابوں کا انتخاب گو نام کو استادوں کے ہاتھ میں تھا مگر عملاً یہ انتخاب صدر معلم یا انتظامی افسروں کی جیب میں ہوا کرتا تھا۔ غرض جن دنوں ہمارے استادوں کو درسی کتاب کے انتخاب کا حق حاصل تھا۔ اس وقت بھی انہوں نے اس حق کو استعمال نہیں کیا۔ پیشہ ورانہ فرض کا عدم احساس ہی غالباً اس اہم حق کے چھینے جانے کا باعث ہوا۔ یہ کام اب نوجوان استادوں کا ہے کہ پیشہ ورانہ فرض کے احساس کے نئے معیار قائم کریں اور اپنے جائز حقوق حاصل کر کے ان کا صحیح استعمال کرنا سیکھیں۔

مطالعہ نصاب کی اہمیت

ایم۔ اے۔ مخدومی

تعلیمی میدان میں نصاب کا مطالعہ ایک نئی شے ہے۔ ماضی میں یہ ہوتا رہا ہے۔ کہ خاص طور پر تشکیل دادہ کمیٹیوں نے نصاب مرتب کر دیا، اور مدرسہ کے استاد نے اس کام میں زیادہ سے زیادہ ایک غیر اہم حصہ لیا۔ لیکن پچھلی چند دہائیوں میں نصاب کا مطالعہ تعلیمی منصوبہ بندی کا ایک اہم جزو بن گیا ہے۔

یہ بات اب عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھوں میں بچوں کی تعلیم ہے جب تک وہ یہ جا ہو کر اس معاملہ پر گہرے طور پر سوچ بچار نہ کریں کہ تیزی سے بدلنے والے معاشرے کے مسائل کا سامنا دینے کے لیے نصاب کس طرح وضع کیا جانا چاہیے۔ اس وقت تک تک کسی ملک کا نصاب تعلیم اس کی قومی ضرورتوں کے حسب حال نہیں ہو سکتا۔

کسی ملک کی تعلیمی ہیئت کا مدار ان مقاصد پر ہوا کرتا ہے۔ جو اس ملک کے لوگوں نے اپنے لیے طے کر لیے ہوں۔ لہٰذا تعلیمی نصب العین کی وضاحت ان مقاصد کی روشنی ہی میں کی جا سکتی ہے ... ہے۔ مختلف ملکوں اور مختلف زمانوں میں مختلف معاشروں نے اپنی زندگی کے مقاصد مختلف انداز پر طے کیے ہیں۔ اور اسی مناسبت سے کسی خاص زمانے اور کسی خاص معاشرے کے تعلیمی مقاصد بھی تشکیل پذیر ہوتے رہے ہیں نصاب سازی سے پہلے ہی ہمیں اپنے ذہن اس بارے میں صاف کر لینے چاہئیں کہ ہمارے تعلیمی مقاصد کیا ہیں۔ پاکستان کی تمنا یہ ہے کہ وہ اپنے معاشرتی اور سیاسی نظام کو ایسی شکل دے جو زندگی کی مختلف میحی اسلامی اقدار کے عین مطابق ہو۔ لہٰذا ہمارے نظام تعلیم کی ہیئت وہی ہونی چاہیے جو ہمارے معاشرے کی

مخصوص ضرورتوں کو پورا کر سکے۔ مثلاً ہمیں یہ کرنا چاہیے کہ اپنی نوزائیدہ ریاست کے متعلق لوگوں کے دلوں میں فخر کے جذبات پیدا کریں اس کے ساتھ ہی ہمیں ان کے دلوں میں اسلام کی عالمگیر اخوت کا جذبہ بھی پیدا کرنا چاہیے۔ ہمیں اتحاد صداقت۔ اخوت اور نیکی کے اسلامی نصب العین کو پیش نگاہ رکھنا چاہیے۔ انسان اشرف المخلوقات ہے، اس لیے ہر مسلمان کی زندگی کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ انسانی سرگرمی کے میدان میں کمال حاصل کرے۔ چوں کہ ہم ایک جمہوری ملک ہیں۔ اس لیے ہمارا نظام تعلیم جمہوری ہونا چاہیے۔ ہر ایک کو یکساں مواقع میسر آنے چاہئیں خواہ وہ امیر ہوں یا غریب۔ ذہنی طور پر آگے بڑھے ہوئے اور غیر معمولی ذہانت کے بچوں کے لیے بھی انتظام ہونا چاہیے اور کم ذہین بچوں کے لیے بھی۔

جمہوری جذبہ

ہمارے بچوں کو اس طور پر تربیت ملنی چاہیے کہ وہ ایک جمہوری طور پر چلائے جانے والے معاشرے میں موثر حصہ لے سکیں۔ ہمارے طریق ہائے تدریس ایسے ہونے چاہئیں کہ آزادی فکر و بیان کی حوصلہ افزائی ہو۔ تاکہ ہر بچے کی تخلیقی قوتیں پورے طور پر ترقی پائیں اس بات کے لیے یہ ضروری ہوگا۔ کہ مضامین کے انتخاب میں آزادی ہو۔ مختلف افراد کے رجحانات مختلف ہوتے ہیں۔ اگرچہ بعض ایسے لازمی مضامین بھی ہونے چاہئیں جن کے مطالعہ کے بغیر کوئی شخص اچھی تعلیم حاصل کرنے کا دعوی نہ کر سکے۔ تاہم بہت سے ایسے مضامین بھی موجود ہونے چاہئیں جن میں سے ہر طالب علم اپنی پسند اور ناپسندیدگی کے مطابق انتخاب کر سکے۔ جب بچہ ثانوی درجہ میں پہنچے تو اسے اس بات کے کافی مواقع ملنے چاہئیں۔ کہ وہ اپنی دلچسپیوں اور صلاحیتوں کا کھوج لگا سکے۔ ایک نیا جمہوری جذبہ پرانے استعماری نظام کی زنجیروں سے نجات پانے کے لیے سخت کوشش کر رہا ہے۔ نیا نظام تعلیم جمہوریت پسند قوم کی تعلیمی ضرورتوں کے حسب حال بھی ہونا چاہیے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس سے ماہرین تعلیم کو کسی صورت میں آنکھیں بند نہ کرنی چاہئیں۔ مدرسہ کو یہ ذمہ داری بھی قبول کرنی چاہیے کہ

وہ بچے کی مکمل تربیت کرے۔ اور نصاب تعلیم میں ایسی سرگرمیوں کا بندوبست کرے جو اس کی ضرورت۔ جرات عمل۔ صلاحیت قیادت اور اس کے کردار کو ترقی دیں۔ آج ہمیں ایسے مردوں اور عورتوں کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ جو صرف اپنے آپ کو اپنے ماحول سے ہم آہنگ کرنا ہی نہ جانیں، بلکہ ان میں آتنی قوت اور ہمت بھی ہو کہ وہ اس ماحول پر اپنا نقش باقی چھوڑ جائیں

نصاب کو چاہیے کہ بچے کی انفرادی ضرورتیں بھی پوری کرے اور معاشرے کی ضرورتیں بھی تعلیم کا ہمہ گیر مقصد یہ ہے کہ وہ ہر فرد میں ایسے علم۔ دل چسپیوں۔ مشاغل مہارتوں اور قوتوں کو ترقی دے جن کی بدولت وہ اپنا مقام پہچاننے اور حاصل کرنے کے قابل ہو جائے۔ اور اس مقام کی بدولت اپنی ذات اور اپنے معاشرے کو بہتر سے بہتر اخلاقی شکل دے۔ ہمارے نصابوں میں کافی لچک ہونی چاہیے۔ مختلف مقامی آبادیوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ان میں بہت سا تنوع داخل کیا جانا چاہیے، یہ اہم نقطہ نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ دیہاتی اور شہری لڑکے لڑکیوں کے طرز عمل میں تھوڑا بہت فرق موجود ہے۔ ثقافتی اور کاروباری سرگرمیوں میں اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ان کا مطالبہ یہ ہے کہ مختلف مقامی آبادیوں کے ماحول کے مطابق نصاب میں لچک ہو۔

توازن کی ضرورت

اس لیے ایک دیہاتی مدرسہ میں زراعت، باغبانی۔ اوزاروں کی مرمت۔ منڈیوں۔ مرغی خانے بیماریوں اور فصلوں کو تباہ کرنے والے کیڑوں۔ مکوڑوں کے متعلق پڑھائی کا بندوبست ہونا چاہیے۔ شہری رقبوں میں کاروباری تعلیم دھات کے کام۔ لکڑی کے کام۔ جلد سازی اور اسی قسم کے دوسرے کاموں کی تعلیم کا بندوبست ہونا چاہیے۔ یہ چیزیں عام علمی مضامین کے ماسوا ہوں گی۔ ایک مثالی نصاب علمی اور ثقافتی مضامین کے درمیان مناسب توازن قائم رکھے گا وہ نہ حد سے زیادہ بے لوچ ہوگا اور نہ حد سے زیادہ لچکدار۔ وہ دل چسپیوں اور قابلیتوں میں انفرادی اختلافات کا لحاظ بھی رکھے گا۔

کثیر المقاصد تکنیک

تقسیم ملک کے بعد ہمارے حالات اس قسم کے رہے ہیں کہ ہم اپنے نظام تعلیم کو اپنی ضروریات کے مطابق نہیں بنا سکے۔ یہ ضروریات اب نئے معانی اختیار کر چکی ہیں اور انہیں پورا کرنے کے لیے پہلے سے مختلف نقطۂ نگاہ کی ضرورت ہے۔ اب ہمیں تعلیم میں ایک کثیر المقاصد تکنیک کی ضرورت ہے جو انسانی علوم کو پورا کرنے کے ساتھ ہی اس کاروباری دنیا کے متعلق کافی حد تک عملی رجحان، مہارت اور فہم پیدا کر سکے۔ اور ایسی عادات اور استحسان پیدا کر سکے جن کی بدولت طلبہ قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں قابل کارندے بن سکیں۔ آج ایسے ممالک بھی موجود ہیں جہاں ہائی اسکول کے نصاب میں ۲۷ مضامین شامل ہیں اور طالب علم ان میں سے آزادی کے ساتھ انتخاب کر سکتے ہیں۔ اس کے برعکس ہم نے اپنے آپ کو صرف کوئی ایک درجن مضامین تک محدود رکھنا پسند کیا ہے۔ یہ تفاوت کام کی کیفیت کے لحاظ سے اسی قدر نمایاں ہے جس قدر گنتی کے لحاظ سے۔ جہاں ہمارے ملک میں زیادہ زور وسیع المشرب فنون کی تدریس پر دیا جاتا ہے، وہاں دوسرے ترقی پسند ممالک میں وسیع المشرب فنون اور عملی افادیت کے مضامین پر ایک سا زور دیا جاتا ہے۔

یہاں شاید یہ دلیل دی جائے کہ ہمارے حالات مختلف ہیں۔ اگر ہم اس قابل ہو بھی جائیں کہ مدرسوں میں متنوع نصاب مہیا کریں تو شاید ہم تربیت یافتہ اساتذہ ساز و سامان اور عمارت مہیا نہ کر سکیں۔ مجھے ان مشکلوں کا پورا احساس ہے۔ اور میرا یہ مقصد نہیں کہ ایسی تجاویز کے اختیار کیے جانے کی حمایت کروں جن پر پوری طرح سوچ بچار نہ کیا گیا ہو۔ یا جن کی قدر و قیمت معلوم نہ کی گئی ہو اور جو مدرسے کے نصاب کو ناقابل عمل بنا دیں۔ لیکن کم از کم ایسے مدرسوں میں اس چیز کا اہتمام ضرور ہونا چاہیے جو اس قسم کا انتظام کر سکتے ہوں۔ ایسا کرتے وقت اسکول کے مخصوص حالات اور اس کے گرد و نواح کی زندگی اور کاروبار کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ موجودہ کتابی نصاب ذہن پر گرفت حاصل کرنے یا لوگوں کی ہمدردی اور تائید حاصل کرنے میں ناکام رہا ہے

اور جب تک اسے مقامی آبادی کی ضرورتوں کے ساتھ مطابقت نہ دی جائے گی تعلیم کے بارے میں بے چینی بڑھتی جائے گی لیکن یہ ایک خوش آئند علامت ہے کہ محکمہ تعلیم نے درست سمت میں قدم اٹھایا ہے۔ اور حال ہی میں کچھ ٹیکنیکل ہائی اسکول کھولے گئے ہیں۔ بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن نے یہ تجویز پیش کر کے کہ آئندہ ہائی اسکول اور ہائر سیکنڈری اسکول کی سطح پر بہت سے متبادل مضامین کا بندوبست کیا جائے، آگے کی طرف ایک اور قدم اٹھایا ہے۔

خامیاں

اپنے مدرسوں کے موجودہ نصاب پر ایک اور زاویہ نگاہ سے دیکھتے ہوئے میں اس کی بعض خامیوں کی طرف اشارہ کروں گا۔ ہمارا ہائی اسکول بنیادی طور پر کالج کی تیاری کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ زندگی کی تیاری کے لیے نہیں اس کی تعمیر چوٹی سے آغاز کر کے نیچے کی طرف کی گئی ہے بجائے اس کے کہ نیچے سے اوپر کی طرف کی جاتی۔ کسی عمارت کو اٹھانے کی ترتیب یہ ہوتی ہے کہ بنیاد سے آغاز کر کے اوپر کی منزل بنائی جائے نہ کہ اوپر کی منزل سے آغاز کر کے بنیاد کی طرف آیا جائے۔ ہمارا نصاب قابلیتوں کے انفرادی اختلافات کا لحاظ نہیں رکھتا اور اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ مختلف ذہانتوں کے بچے خواہ وہ اونچے پائے کے ہوں، درمیانے ہوں، یا کند ذہن، سب ایک ہی جتنا کام کریں۔ سائنس اور ریاضی کی تدریس خالص طور پر علمی ہے اور اسے ہمارے روزمرہ کے تجربے اور ضروریات سے کچھ سروکار نہیں۔ کالج کی تیاری کرانے والی ریاضی کو لازمی قرار دینا ایسے بہت سے بچوں کے لیے ایک ذہنی بوجھ ہے جو نہ اس کا کچھ ذوق رکھتے ہیں اور نہ ہی یہ ارادہ کہ اس مضمون کو یونیورسٹی میں لیں۔ اس کی بجائے ان کو روزمرہ ریاضی کیوں نہ سکھائی جائے وہ مدرسے کی ساری زندگی میں ایک ناخوشگوار اور غیر ضروری بوجھ کیوں اٹھائے رہیں؟ ان کا وقت ابتدائی پیشہ ورانہ تربیت میں کیوں صرف نہ ہو؟ انگریزی اور ریاضی کی تدریس پر جو بے حد زور دیا جاتا ہے اس سے استادوں اور شاگردوں دونوں کا بہت سا وقت اور قوت صرف ہو جاتی ہے۔ اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دوسرے مضامین کو نقصان پہنچتا ہے بعض مضامین

مثلاً ریاضی اور تاریخ میں ہمارے ثانوی مدرسوں کا نصاب ضرورت سے زیادہ دہرائی اور اعادہ کا درجہ رکھتا ہے کیوں کہ بہت سی حالتوں میں ان کے موضوعات وہی پرانے ہوتے ہیں۔ مڈل جماعتوں میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے اس کا ایک خاصہ حصّہ ہائی اسکول میں دہرا دیا جاتا ہے۔ میری تجویز ہے کہ اس غیر ضروری تکرار کو ختم کر کے وقت اور قوت کو بچایا جائے اور انہیں دوسرے مضامین کے مطالعہ میں صرف کیا جائے۔

میری یہ خواہش نہیں کہ موجودہ نصاب پر کوئی سخت نکتہ چینی کی جائے تقسیم کے بعد سے اس نصاب میں کئی ایک اصلاحیں ہو چکی ہیں لیکن میں جس بات پر زور دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے، کہ نہ ہی تقسیم ملک سے پہلے اور نہ ہی اس کے بعد اس ملک میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ اس مسئلہ کا مطالعہ سائنسی طور پر ہو۔ نصاب سازی کا موجودہ طریقہ بڑی حد تک آمرانہ ہے متعلقہ افسر اس غرض کے لیے ایک چھوٹی سی کمیٹی نامزد کر دیتے ہیں، وہ دو یا تین مہینے کے وقت کی قید بھی لگا دیتے ہیں جس کے اندر اندر سارے نصاب کو نئی شکل دینی ہوتی ہے۔ جن لوگوں کے ذمہ یہ مشکل کام لگایا جاتا ہے۔ انہیں معمول کے فرائض بھی انجام دینے ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کام کو پوری طرح کرنے کے لیے بہت کم وقت نکالتے ہیں۔ وہ چند دفعہ بحث و تمحیص کے لیے جمع ہوتے ہیں اور پرانے نصاب کو نئی شکل دے کر چلے جاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ کچھ مفید اور نئی باتیں شامل کر لی جاتی ہیں لیکن ان کی بنیاد کسی حقیقی تحقیقی کام پر نہیں ہوتی۔

ہمارے لیے اب یہ ممکن نہیں کہ اس بے حد اہم مسئلہ کے ساتھ اس طرح ٹال مٹول سے کام لیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مطالعہ نصاب کو حقیقی بنیادوں پر رکھنے کے لیے کچھ کام کیا جائے۔ مطالعہ نصاب ہمارے نصاب تعلیم کا ایک مستقل پہلو ہونا چاہیے۔ یہ ممکن نہیں کہ ہم ایک نصاب وضع کر لیں اور پھر اگلے پانچ سالوں کے لیے اس کے متعلق سب کچھ بھول جائیں نصاب کی ترقی ایک مسلسل عمل کا نام ہے۔ نصاب کو ہمیشہ کے لیے وضع نہیں کیا جا سکتا۔ نہ ہی اس کی ہمیشہ کے لیے اصلاح کی جا سکتی ہے۔ ہمارے طرز زندگی میں جس تیزی سے تبدیلی آر

وہ چاہتی ہے کہ نصاب ایک متحرک معاشرے کی ہمیشہ بدلنے والی ضرورتوں کے مطابق لگاتار بدلتا رہے۔ ایک جدید مدرسہ میں نصاب سازی کا کام باہمی طور پر مل جل کر کرنے کا کام ہے۔ اس میں انتظامی افسر، استاد، مقامی آبادی، حتیٰ کہ بچوں کو بھی حصہ لینا ہوتا ہے۔ جب نصاب کمیٹی کے کمرہ سے باہر نکلے تو اس سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اس کے مندرجات اور طریقہ ہائے کار کمرہ جماعت میں آزمائے گئے ہوں۔ اس کام کے متعلق کمیٹی کے ممبر، استاد اور وہ لوگ جو نوجوانوں کی تعلیم کے ساتھ دلچسپی رکھتے ہیں سب آزادانہ طور پر تبادلۂ خیالات کریں۔ یہ غیر سائنسی طریق کار ہے کہ کمیٹی کے کمرہ میں بیٹھ کر نصاب بنا لیا جائے۔ اور اسے استادوں پر ٹھونس دیا جائے۔ خواہ وہ اسے پسند کریں یا نہ کریں۔ بہر حال وہ جوں توں کر کے اسے چلائیں۔ ترقی پسند ملکوں میں نصاب سازی کے لیے ایسی کمیٹیاں ہوتی ہیں جن کے ذمہ صرف یہ کام ہوتا ہے کہ نصاب کے مختلف مسائل کے متعلق تحقیق جاری رکھیں یہ کمیٹیاں مختلف اداروں کے ماتحت کام کرتی ہیں۔ اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ اس قسم کی کمیٹیاں ہمارے ملک میں بھی قائم کی جائیں ؎

(انگریزی سے ترجمہ)

جغرافیہ کی اہمیت

عنایت الرحمٰن صدیقی

زیرِ نظر مقالہ میں جغرافیہ کی اہمیت پر ادبی نقطۂ نگاہ سے بحث کی گئی ہے۔ جو خاص طور پر جغرافیہ کے اساتذہ کے لیے مفید ہے۔ ہمارے ہاں جس طرز پر جغرافیہ کی تعلیم بغیر کسی نظریہ کے دی جاتی ہے وہ نہ صرف یہ کہ غیر مفید ہے بلکہ بچے کی ذہنی اور روحانی صلاحیتوں کو پامال کر دیتی ہے، بچے کو چند حقائق و واقعات امتحانی نظریے کے تحت یاد کرا دیے جاتے ہیں اور اس میں جستجو کا مادہ پیدا نہیں ہوتا۔ اب جب کہ ہم آزاد ہیں، ہمارا فرض ہے کہ بچوں کو اس اہم ترین مضمون کی تعلیم ایک اہم مقصد کے پیشِ نظر دیں تاکہ وہ جدید علم کے زیور سے آراستہ ہو کر اپنے آپ کو اس ماحول کے مطابق بنا سکیں اور اگر ماحول ان کے مطابق نہ ہو تو خود ماحول کو اپنے مطابق ڈھالنے کی صلاحیت پیدا کر سکیں۔

پاک ہے وہ ذات جس نے اس کائنات کو پیدا کیا۔ ذرّے ذرّے کو ایک فریضۂ عظیم سونپا، جھلملانے ستاروں کو حسن دیا۔ چاندنی کو ٹھنڈک دی۔ سورج کو تپش دی، دریاؤں کو نغمہ دیا اور چشموں کو راگ دیا اور یہ سب زبانِ حال سے اس مالکِ حقیقی کا شکریہ ادا کر رہے ہیں جس نے ان کو پیدا کیا پھر غفورٌ رحیم ہے وہ ذات جس نے انسان کو جو قدرت کا شاہکار ہے احسنِ تقویم میں تخلیق کر کے اسے عقل و شعور کا خوب صورت جامہ پہنایا۔ انسان نے زندگی اور ساتھ ہی شعور کا تحفہ پا کر دنیا کی تمام مخفی طاقتوں پر حکم رانی کی اور کر رہا ہے، یہ چھوٹا سا انسان کبھی فلسفی بنا کبھی سائنس داں اور کبھی بقول اے "بقدرِ ظرف ہے ساقی خمارِ تشنہ کامی بھی" ولی اور پیغمبر بنا۔ اس ضعیف البنیان انسان کی حقیقت بھی نرالی ہے کہ ایک طرف وہ اپنے شعور سے کام لے کر پوری دنیا کو مسخر کر لیتا ہے۔ اور دوسری طرف وہ "خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا" کی مصداق ہے۔ کبھی کہتا ہے کہ "ہائے مرنے پہ بھی اختیار نہیں

اور کبھی کہتا ہے ؎

بہانِ چار سو اندر برِ من ❖ ہوائے لامکان اندر سرِ من

الغرض انسان سوچتا ہے اور اسے سوچنا چاہیے کہ انا عرضنا الامانۃ علی السمٰوٰت والارض فابین ان یحملنہا وحملہا الانسان کی تفسیر کیا ہے؟ اس نے یہ ذمہ داری کس مقصد کے پیشِ نظر قبول کی؟ اگر ذرا استغراق اور امعانِ نظر سے کام لیا جائے تو اب بھی انسان کے اندر ایک قوت ہے جسے فطرتِ سلیم کہہ سکتے ہیں، وہ خود اس کا جواب دیتی ہے اور قالو بلیٰ کی صدا لگا رہی ہے۔ اگرچہ رازی کے کان اس آواز کو سننے سے قاصر ہیں، مگر رومیؒ کا دل اس صدائے حق کو مانند جرس سُن رہا ہے اور اس میدان میں سے جیتا ہے رومی ہارا ہے رازی اور بقول رومیؒ ؎

بر سماعِ راست ہر کس چیر نیست ❖ طعمۂ ہر مرغکے انجیر نیست

پھر یہ صدا ہمیں کیسے سنائی دے گی؟ اگر یہ ہر کوئی نہیں سن سکتا تو ہم عام انسان اس کو کیسے سنیں .... مگر .... مگر یہ صدا تو سنائی جا چکی ہے۔ یہ زمین کے چپے چپے میں پہونچ چکی۔ اس صدا کو پہونچانے کے لیے ایسے افراد کو تیار کیا گیا جن کی نظیر عام انسانوں میں نہیں مل سکتی۔ کبھی یہ صدا، یا موسیٰ لا تخف انی انا اللہ رب العالمین، کے پس پردہ سنائی گئی۔ کبھی ونادینا ہ ان یا ابراھیم کے ساتھ اور سچ تو یہ ہے کہ سارے کا سارا خزانہ ہی حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد فرما دیا کہ ؎

ادب گاہیست زیرِ آسمان از عرش نازک تر
نفس گم کردہ مے آید جنیدؒ و بایزیدؒ اینجا

اور جس کی عام بات بھی عین برحق اور بے چون وچرا مان لینے کے قابل ہے کیوں؟ اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی، پھر اس چراغ سے کئی چراغ روشن ہوئے اور یہ صدائے حق بادِ نسیم کے جھونکوں کے ساتھ دنیا کے کونے کونے میں گونج اٹھی۔ اس صدا نے ہمیں کیا دیا؟ وہی ہمارا مقصد جسے بظاہر ہم سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اس صدا میں ہمارے لیے سادہ اور منفرد مثالیں تھیں، ہماری ہی زندگی سے متعلق باتیں تھیں جن کو سمجھنے میں ہمیں کوئی دقت نہ ہو سکتی تھی اور نہ ہے۔ اب یہ

انسان کی اپنی بساط ہے کہ وہ چاہے تو اس پیغام کو قبول کرکے اشرف المخلوقات بنے یا اس سے غافل و برگشتہ ہو کر اسفل السافلین میں مقام حاصل کر لے۔ اس صدا نے جب ہمیں اپنے مقصد زندگی سے آگاہ کیا تو یوں گویا ہوئی:۔

والشمس وضحٰھا، والقمر اذا تلٰھا، والنھار اذا جلّٰھا، والسماء وما بنٰھا والارض وما طحٰھا (ترجمہ: قسم ہے سورج کی اور اس کے دھوپ چڑھنے کی اور چاند جب کہ آوے اس کے پیچھے اور دن کی جب اس کو روشن کرے، اور رات کی جب اس کو ڈھانک لیوے اور آسمان کی اور جیسا اس کو بنایا اور زمین کی جیسا اس کو پھیلایا) اور کبھی صاف کہہ دیا:۔

افلا ینظرون الی الابل کیف خُلقت، والی السماء کیف رفعت، و الی الجبال کیف نصبت، والی الارض کیف سُطحت (ترجمہ:۔ بھلا کیا نہیں نگاہ کرتے اونٹوں پر، کیسے بنائے ہیں، اور آسمان پر کیسا بلند کیا ہے۔ اور پہاڑوں پر کیسے کھڑے ہیں اور زمین پر کیسی صاف بچھائی ہے؟) اس پیغام میں قسم سے شہادت مراد ہے اور منشائے ایزدی یہ ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ قدرت الٰہی کا مظہر ہے اور انسانی مقصد کی طرف بھی شاہد بن کر نشاندہی کر رہا ہے۔ گو اس کے لیے وسعت نظر اور چشم بینا درکار ہے۔ صاحب دل شاعر اقبال نے ہمالیہ پہاڑ کو مخاطب کر کے فرمایا تھا ۔

ایک جلوہ تھا کلیم طور سینا کے لیے ؛ تو تجلی ہے سراپا چشم بینا کے لیے

اس کائنات کی سادہ سے سادہ اور معمولی سے معمولی چیز بھی قدرت کا ایک عجیب و غریب کرشمہ ہے جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ خدا کی سماوی و ارضی نعمتیں لامتناہی اور لازوال ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ہر چیز کی باقاعدگی اور مطابقت فطرت میں ہمارے لیے درس عبرت ہے کہ جس طرح یہ بے جان چیزیں اپنے اپنے فرض کو بحسن و خوبی سرانجام دے رہی ہیں اور اس خدائے لم یزل کے آگے سر تسلیم خم کیے ہیں۔ اسی طرح انسان جس پر سب سے زیادہ عنایات کی گئیں وہ بھی اسی مالک کے آگے اپنا سر رکھ دے اور بے چون و چرا اس کے احکام بجا لائے۔

اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو گویا وہ قدرت کی عطا کردہ نعمتوں سے ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے بلکہ باغی و سرکش ہے جس کے لیے اس مختصر سی زندگی کے بعد دوسرے جہان میں عقوبت شدید ہے!

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کائنات سے ایک ایسا فرد کیسے سبق حاصل کر سکتا ہے جو کائنات ہی سے ناواقف ہے؛ حقیقت یہ ہے کہ کائنات جس میں خود انسان کا وجود بھی شامل ہے، کو سمجھے بغیر ممکن نہیں کہ انسان خدا کو بھی پہچان سکے۔ خلق پر غور کیے بغیر خالق کو کیسے سمجھا جا سکتا ہے؛ پس اس کو پہچاننے اور صحیح شکر ادا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ان چیزوں کی حقیقت پر تدبر و تفکر کریں۔ جانیں کہ یہ بہتے ہوئے شیریں پانی کے چشمے اور نغمہ سنج دریا کیا ہیں؛ یہ سر بفلک پہاڑیاں کیا ہیں۔ یہ اتھاہ سمندر کیا کام کرتے ہیں۔ چاند کی روشن ضیا کہاں ہے اور کیا فریضہ انجام دے رہی ہے۔ یہ سیارے کیا ہیں۔ زہرہ، زحل اور دیگر اجرام فلکی کی کیا ماہیت ہے۔ پھر اس ننھی زمین کا کیا مقام ہے، یہ کیسی ہے اور کس طرح عالم وجود میں آئی۔ اس کے تین چوتھائی پر پانی کا خول کیسے اور کیوں ہے؛ زمین کے پیٹ میں کیسے کیسے خزانے دفن ہیں۔ ہم خوراک کیسے اور کہاں سے حاصل کرتے ہیں۔ یہ کس طرح کن وقفوں میں کن حالات کے ماتحت پیدا ہوتی ہے ___ الغرض ہر وہ چیز جو ہمیں اپنے گرد و پیش میں نظر آتی ہے۔ زبان حال سے پکار پکار کر اس صناع حقیقی کی قدرت پر دلالت کر رہی ہے۔ اسی ماحول اور گرد و پیش کا نام جغرافیہ ہے جس کی مثالیں دے دے کر قدرت نے انسان کو راہ ہدایت دکھائی ہے۔ پس اگر ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں اور اس مالک حقیقی کو پہچاننا چاہتے ہیں تو پہلا کام یہ ہوگا کہ ہم دنیا کے جغرافیے پر غور و فکر کریں۔ اپنے ماحول کا جائزہ لیں اور اپنی راہ متعین کریں! بلاشبہ ہمارا جغرافیہ ہی اس خدائے بزرگ کی قدرت کے کرشمے دکھاتا ہے اور انسان ان سے سبق لے کر گمراہی کی تاریکی سے نکل کر نور ہدایت پاتا ہے جس طرح اس جغرافیہ کا سورج دنیا کو جسمانی طور پر روشن کرتا ہے اور اس کی رات انسانوں کے لیے سکوت و سکون کا سامان میسر کرتی ہے، اس طرح سورج اور زمین روحانی طور پر بھی دلوں کو روشن اور قلوب کو طمانیت عطا کرتے ہیں اور یہی ہے تفسیر والشمس وضحٰھا کی!

یہاں تک کی گفتگو سے مقصود یہ تھا کہ جغرافیہ پڑھنے پڑھانے وقت ہمارے ذہن میں بلند نظریہ ہونا چاہیے کہ یہ محض چند معلومات کا مجموعہ نہیں ہے۔ بلکہ اس خالق کو پہچاننے کے لیے اور پھر ایک معزز زندگی بسر کرنے کے لیے اس کا حصول ضروری ہے۔ عام تعلیم کا مقصد یہ بتایا جاتا ہے کہ انسان اپنے ماحول کے مطابق ہو جائے۔ لیکن جغرافیہ کی تعلیم ہم کو یہ سکھاتی ہے کہ ہم کس طرح ماحول کو اپنی مرضی کے مطابق نئے سانچوں میں ڈھال سکتے ہیں! انسانی زندگی کا دارومدار اسی پر ہے کہ وہ کائنات کے اس زنگارنگ مواد خام سے اپنے شعور کے مطابق کام لے اور اس سے اپنی آرائش کا سامان بنائے، چنانچہ علامہ اقبال خدا کے حضور میں فرماتے ہیں ؎

نمی بینی کہ ما خاکی نہادان ٭ چہ خوش آراستیم ایں خاکداں را

دنیا کی آزاد اور ترقی یافتہ قوموں کے ارتقا کا واحد سبب یہ ہے کہ انہوں نے اپنے جغرافیہ میں اپنے حسب منشا تبدیلی پیدا کر لی ہے۔ زراعت، آب پاشی، صنعت و حرفت، تجارت اسی جغرافیہ کی مرہون منت ہیں۔ جس قوم کے جغرافیائی حالات ناقص ہوں، وہ کبھی اپنی ضروریات پوری نہیں کر سکتی۔ اسے ہمیشہ دوسروں کی طرف للچاتی ہوئی نگاہوں سے دیکھنا پڑتا ہے اور آخر کار اس کا انجام تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

آج پاکستان کی اس نوزائیدہ سلطنت کو ایسے نوجوان جغرافیہ دانوں کی ضرورت ہے جو جغرافیہ سے مکمل واقفیت بہم پہنچا کر اپنے ملک کی معیشت، معاشرت اور تہذیب کو بام عروج تک پہنچائیں اور ان بگڑے ہوئے حالات کو سنواریں۔ پاکستانی اساتذہ کا فرض ہے کہ وہ اپنے طلبہ کو انہی مقاصد کے پیش نظر جغرافیہ پڑھائیں، جس سے ان میں خدمت کا جذبہ پیدا ہو۔ ضرورت ہے کہ ہر سکول اور ہر کالج میں جغرافیہ کی ترقی و ترویج کے لیے سوسائٹیاں قائم کی جائیں اور ساتھ ساتھ باقاعدہ تحقیقاتی اداروں کا قیام عمل میں لایا جائے۔ اس طرح جغرافیہ کا جو نظریہ بنے گا اس سے روشناس ہو کر ہمارا طالب علم ایک ریگستان کو دیکھ کر صرف اپنے مشاہدہ میں اضافہ نہیں کرے گا۔ بلکہ سوچے گا کہ اب اس ریگستان کو سرسبز و شاداب کیسے بنایا جا سکتا ہے ◆

سعودی عرب میں تعلیم

شیخ اصغر علی

جس سرزمین سے آج سے چودہ سو برس پیشتر نورِ علم کا سوتا پھوٹا تھا، اور جہاں آفتابِ علم کی کچھ ایسی تابانیوں سے نمودار ہوا تھا کہ اس کی کرنوں سے دنیا کے دور افتادہ گوشے بھی جگمگا اُٹھے آج اسی سرزمین پر جہالت کے گھپ اندھیرے کا راج ہے۔ وہ خطۂ ارض جہاں سب سے پہلے حصولِ علم کو ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض قرار دیا گیا تھا اور وہ دھرتی جس پر پیغمبرِ خدا نے یہ اعلان کیا تھا کہ علم حاصل کرو خواہ چین جانا پڑے۔ آج اس تعلیم کی گھڑ دوڑ میں وہی ملک سب سے پیچھے ہے اور اس دیس میں لاکھوں انسان علم کی روشنی سے محروم جہالت کی تاریکیوں میں سر پٹخ رہے ہیں۔ مذہبِ اسلام میں علم کی جس قدر فضیلت بیان کی گئی ہے اور ایک عالم کے جس قدر مراتب و مدارج کا تذکرہ کیا گیا ہے، اس کی مثال دنیا کے کسی دوسرے مذہب میں نہیں مل سکتی اور یقیناً اس کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ تعلیم و تعلم کی طرف رغبت بڑھے اور لوگ شمعِ علم پر پروانہ وار نثار ہوں۔ لیکن آج اس دیار میں جسے ہم سرچشمۂ اسلام کا نام دیتے ہیں اور جو پورے عالمِ اسلام کا دل کہلاتا ہے۔ جہالت کا گھٹا ٹوپ اندھیرا دیکھ پاتے ہیں تو دل تھام کر رہ جاتے ہیں۔

یہ جزیرہ نمائے عرب تقریباً ۸ لاکھ مربع میل کے رقبہ میں پھیلا ہوا ہے، اس کا درمیانی حصہ بنجر اور غیر آباد ہے۔ البتہ اس کے ساحلی علاقے اور کنارے سرسبز و شاداب ہیں، پہاڑوں کا جال تمام ملک میں پھیلا ہوا ہے۔ اور اس خطہ میں پچھتر لاکھ لوگ آباد ہیں۔ جدہ۔ مکۃ المکرمہ مدینہ منورہ۔ ریاض۔ طائف وغیرہ اس کے چند ایک مشہور شہر ہیں۔ باقی شہروں میں کچھ تو ایسے بدوی قبائل آباد ہیں جو تا حال خانہ بدوشوں کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور کچھ ایسے ہیں

جو چھوٹی چھوٹی بستیوں کی صورت میں آباد ہو گئے ہیں۔ خانہ بدوشوں کی تعلیم کا تو اس وقت تک سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جب تک وہ ایک جگہ پر ٹک کر زندگی بسر کرنا شروع کردیں۔ جہاں تک دیہات اور بستیوں کا تعلق ہے وہاں بھی تعلیم صفر ہے۔ کسی بستی یا گاؤں میں آپ کو کوئی مدرسہ با قاعدہ مکتب نظر نہیں آئے گا۔ بچے بوڑھے۔ مرد، عورت سبھی الا ماشاء اللہ ان پڑھ اور جاہل ہیں اس لیے اس مضمون میں جس نظام تعلیم کا ذکر کیا جائے گا وہ صرف شہروں میں رائج ہے اور اس سے محض چند لاکھ لوگ مستفید ہو رہے ہیں۔

اگر آج سے چند سال قبل اس مضمون پر کوئی شخص قلم اٹھاتا تو یقیناً اسے وہاں کی جدید تعلیم پر تبصرہ کرنے کے لیے کوئی سواد ہاتھ نہ آتا اور اسے وہاں کے چند دینی مدارس کے تذکرہ پر ہی اکتفا کرنا پڑتی اس لیے کہ سعودی عرب میں جدید تعلیم کو رائج ہوئے ابھی چند ہی سال ہوئے ہیں، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ میں دینی تعلیم کا ہمیشہ سے اچھا خاصہ چرچا رہا ہے۔ اور آج بھی وہاں بیت اور شریف اور مسجد نبوی دینی تعلیم کے بہت بڑے مراکز ہیں۔ اور ان کے گردو نواح میں مدرسہ فخریہ عثمانیہ۔ مدرسہ صولتیہ۔ مدرسہ علوم شرعیہ ایسے مکاتب قائم ہیں جو طلبہ کی خوراک اور کتابوں تک کے کفیل ہیں لیکن اب سے چند برس پیشتر جدید طرز کے ابتدائی اور ثانوی مدارس قطعاً موجود نہ تھے۔ سرکاری طور پر نہ کوئی نظام تعلیم موجود تھا نہ شعبۂ تعلیم، حکومت اس فرض سے بالکل غافل تھا، اور یوں اس کی اقتصادی حالت بھی کوئی ایسی اچھی نہ تھی۔ مختلف مگر محدود ذرائع سے جس قدر آمدنی ہوتی وہ بادشاہ اور اس کے وسیع خاندان کے لیے بمشکل کفیل ہوتی لیکن چند سالوں سے پیٹرول اور سونے کی برآمد سے سرکاری خزانہ میں ایک گراں قدر اضافہ ہو گیا ہے جس کی وجہ سے ملک کی اقتصادی حالت بھی قدرے بہتر ہو رہی ہے۔ ہزاروں بدو جو اس سے قبل بھیک مانگا کرتے تھے اب تیل کی کمپنیوں میں معقول مشاہروں پر کام کر رہے ہیں۔ اس طرح فوج اور پولیس کی نفری بڑھا دینے سے ہزاروں آدمیوں کو ملازمت مل گئی ہے۔ ملک کی بین الاقوامی ساکھ قائم ہو گئی ہے، اور مختلف ممالک سے سیاسی و تجارتی روابط استوار ہو گئے ہیں۔ سیاسی میدان میں والیان ملک نے

دوسرے ممالک میں گھومنے اور وہاں کے حالات کا مطالعہ کرنے کے متعدد مواقع ہاتھ آئے ہیں۔ اور اس سے جہاں ان کے نظریات میں وسعت پیدا ہوئی ہے وہاں قومی فلاح و بہبود اور ملکی ترقی کے منصوبے سوچنے کا جذبہ بھی پیدا ہوا ہے، چنانچہ موجودہ حکومت یہ محسوس کرتی ہے کہ ملک میں امن و امان قائم رکھنا اور چوریوں اور ڈاکوں کا انسداد ہی اس کا واحد فریضہ نہیں بلکہ عوام کی تعلیم اور صحت اور معاشرہ کی بہبود کے بہت سے کام بھی ان کے فرائض میں شامل ہیں۔ ملک کی تعلیمی حالت کو سدھارنے کے لیے منصوبے بنائے جا رہے ہیں اور فی الحال شہروں میں تعلیم عام کرنے کی طرف اپنی ساری توجہ مبذول کر رکھی ہے۔

وزارۃ المعارف کے نام سے محکمہ تعلیم قائم ہو چکا ہے اس کا صدر دفتر مکہ معظمہ میں ہے اور فہد بن عبدالعزیز آل السعود وزیر معارف ہیں۔ شیخ عبدالعزیز بن حسن ان کے وکیل یعنی سیکرٹری ہیں۔ عبداللہ بغدادی مدیر التعلیم (ناظم تعلیمات) ہیں۔ مکہ مکرمہ۔ مدینہ طیبہ۔ جدہ۔ ریاض۔ طائف۔ مناو غیرہ میں مدارس قائم ہو چکے ہیں۔ مکہ شریف میں دس ابتدائی مدارس اور چھ ثانوی مدارس ہیں۔ مدینہ منورہ میں چار ابتدائی مدارس ہیں اور ایک ثانوی مدرسہ۔ طائف میں بھی ایک ثانوی مدرسہ ہے جدہ میں بہت سے ثانوی اور ابتدائی مدارس ہیں۔

ابتدائی مدارس

ابتدائی مدارس کا کورس چھ سال کا ہے، اور یہاں سے طلبہ چھٹی جماعت پاس کر کے یا ثانوی مدارس میں داخل ہو جاتے ہیں۔ یا کوئی کاروبار اور ملازمت اختیار کر لیتے ہیں، ان مدارس میں صرف ایک زبان پڑھائی جاتی ہے اور وہ ان کی مادری زبان عربی ہے۔ اس کے علاوہ قرآن فقہ، حدیث۔ حساب۔ تاریخ جغرافیہ اور املا وغیرہ بھی نصاب میں شامل ہیں۔ اگر آپ ان کے نصاب پر نظر ڈالیں تو آپ دیکھیں گے کہ مذہبی تعلیم پر ابتدائی جماعتوں میں زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ اور جوں جوں بچے اوپر کی جماعتوں میں ترقی پاتے جاتے ہیں۔ قرآنی تعلیم کی گھنٹیاں کم ہوتی جاتی ہیں۔ وضاحت کے لیے ذیل میں ابتدائی مدارس میں مضامین تدریس کا ایک خاکہ دیا جاتا ہے

اور ساتھ ہی تفویض کردہ اوقات کا نقشہ بھی :-

	مضمون	درجہ اول	دوم	سوم	چہارم	پنجم	ششم	کیفیت
۱	القرآن	۱۸	۱۵	۱۲	۶	۳	۳	چھٹی جماعت تک پورا قرآن ناظرہ ختم
۲	التجوید	×	×	×	۱	۱	×	اور تین پارے حفظ۔ اس کا آغاز
۳	التوحید	۲	۲	۴	۴	۳	۳	جماعت چہارم سے ہوتا ہے۔
۴	الفقہ	۲	۲	۳	۴	۳	۳	فقہ امام حنبل پڑھائی جاتی ہے
۵	الحدیث	×	×	×	×	۲	۲	اس کا آغاز جماعت پنجم سے ہوتا ہے
۶	جغرافیہ	×	×	×	×	۲	۲	جغرافیہ کا آغاز جماعت پنجم ״ ״
۷	تاریخ	×	×	۲	۲	۲	۲	تاریخ کا ״ ״ سوئم سے ״
۸	قواعد	×	×	×	۳	۵	۵	قواعد کا ״ ״ چہارم سے ״
۹	مطالعہ	×	۳	۳	۲	۱	۲	
۱۰	المحفوظات	×	×	×	۲	۲	۱	عربی اشعار حفظ کرائے جاتے ہیں
۱۱	الخط	۴	۳	۳	۲	۲	۲	
۱۲	الاملا	×	۶	۳	۲	۲	۲	
۱۳	الانشاء	×	×	×	۲	۲	۲	
۱۴	الحساب	۲	۳	۴	۴	۴	۴	
۱۵	الہندسہ	×	×	×	×	×	۱	ہندسہ کا آغاز جماعت ششم سے ہوتا ہے
	میزان	۲۸	۳۴	۳۴	۳۴	۳۴	۳۴	

پہلی جماعت کے صرف ۲۸ گھنٹے فی ہفتہ ہوتے ہیں اور باقی جماعتوں کے ۳۴ گھنٹے فی ہفتہ یہ مدارس تقریباً چھ گھنٹے روزانہ کام کرتے ہیں۔ یہاں کے اسباق میں مذہبی اسباق کو جتنی گھنٹیاں دی گئی ہیں کسی دوسرے عرب یا غیر عرب ملک میں نہیں دی گئیں۔

ثانوی مدارس

ثانوی مدارس کا کورس ۵ سال کا ہے اور اس کا عام معیار تقریباً ہمارے ہاں کے میٹرک کے معیار کے برابر ہے۔ یہاں چھٹی جماعت پاس بچے داخل ہوتے ہیں۔ اور ان مدارس میں انگریزی، عربی، حساب، الجبرا، اقلیدس اور سائنس کی تعلیم دی جاتی ہے۔ انگریزی لازمی مضمون کی حیثیت سے شامل نصاب ہے، ذریعہ تعلیم عربی ہے۔ ان مدارس کا الحاق کسی مصری یونیورسٹی سے ہے۔ امتحانات یہاں ہوتے ہیں لیکن پرچہ جات مصر سے چھپ کر آتے ہیں اور وہیں جانچے جاتے ہیں، عرب میں نہ کوئی یونیورسٹی ہے نہ جدید طرز کا کالج۔ البتہ مکہ مکرمہ میں صرف عربی کی اعلیٰ تعلیم کے لیے کلیتہ الشریعہ کے نام سے ایک دارالعلوم ہے۔ اس کا کورس چار سال کا ہے۔ اور یہاں ثانوی مدارس کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مزید عربی تعلیم کے لیے طلبہ داخل ہوتے ہیں۔

فنی تعلیم

عرب میں فنی تعلیم کا فقدان ہے۔ فنون لطیفہ کو بھی نصاب سے خارج رکھا گیا ہے۔ طبی یا تکنیکی تعلیم کا بھی کوئی انتظام نہیں، چنانچہ ڈاکٹر اور انجینئر تو الگ رہے معمولی ڈسپنسر اور الیکٹریشن بھی بیرونی ممالک سے درآمد کیے جاتے ہیں۔ سعودی عرب سے طلبہ ثانوی تعلیم حاصل کر چکنے کے بعد اعلیٰ فنی اور طبی تعلیم کے لیے مصر جاتے ہیں۔ مکہ مکرمہ میں اساتذہ کا ایک تربیتی ادارہ معہد المعلمین کے نام سے کام کر رہا ہے۔ بعض یتیم خانوں میں بچوں کو معمولی پیمانے پر چھوٹی چھوٹی صنعتیں سکھائی جاتی ہیں۔

اساتذہ:۔ سعودی عرب میں تربیت یافتہ اساتذہ کی قلت ہے۔ انگریزی پڑھانے کے لیے اکثر اساتذہ مصر سے منگوائے جاتے ہیں۔ سائنس اور ریاضی وغیرہ کی تعلیم بھی یہی اساتذہ دیتے ہیں۔ ابتدائی مدارس میں کام کرنے والے اساتذہ البتہ مقامی ہیں۔ ابتدائی مدارس کے صدر مدرسین کی تنخواہیں چار ساڑھے چار سو ریال ماہوار ہیں۔ انگریزی کے اساتذہ کی ابتدائی ساڑھے چار سو ریال ماہوار ہے۔ عام مدرسین ۲۰۰ سے ۴۰۰ ریال کے درمیان تنخواہ پاتے ہیں۔ ثانوی مدارس کے

صدر مدرسین کی تنخواہ ۴۵۰۰ ریال ماہوار کے قریب قریب ہے۔ جملہ ادنیٰ ملازمین مدرسہ کی تنخواہ ۱۵۰ ریال فی کس ہے۔

تعطیلات: — جہاں تک ان مدارس میں تعطیلات کا تعلق ہے، یہ ملک غالباً سب سے نرالا ہے۔ کسی ملک میں سخت سردی کے مہینوں میں چھٹیاں ہوتی ہیں کہ بچوں کو سردی کے ایام برفباری مدرسوں میں آنے جانے کی دقت نہ ہو، کہیں موسم گرما میں تعطیلات ہوتی ہیں کہ ناقابل برداشت گرمی میں آمدورفت اور درس و تدریس کٹھن ہوتی ہے۔ اور کسی ملک میں موسم بہار میں تعطیلات منائی جاتی ہیں کہ سال بھر تھکے ماندہ ذہن ذرا ستا لیں اور کثرت کار سے مرجھائے ہوئے چہروں پر ذرا پھر سے شادابی اور رونق پیدا ہو لیکن سعودی عرب میں ملکی اور قومی ضرورت اور تقاضوں کے پیش نظر تعطیلات کسی خاص طبعی موسم کے پیش نظر نہیں کی جاتیں بلکہ ایام حج میں جب کہ دنیائے اسلام کے گوشہ گوشہ سے لاکھوں انسان اس سرزمین پر حج اور زیارت حرمین شریفین کی غرض سے وارد ہوتے ہیں مدارس بند کر دیے جاتے ہیں ان مہینوں میں اس قدر گہما گہمی، رونق اور ہجوم ہوتا ہے کہ وہاں کے مقامی باشندوں کی عام زندگی میں بھی کافی تغیر واقع ہو جاتا ہے۔ کاروبار بڑھ جاتا ہے، مصروفیات میں بے انتہا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور ان مدارس کے اکثر بچے بلکہ اساتذہ بھی مختلف قسم کے کاروبار شروع کر دیتے ہیں اور اس طرح انہیں خاصی معقول آمدنی ہو جاتی ہے۔ چوں کہ رمضان شریف ہی میں حجاج کرام کی آمد شروع ہو جاتی ہے۔ اور ویسے بھی دینی مدارس میں رمضان المبارک میں تعطیلات کی ایک دیرینہ روایت چلی آتی ہے۔ اس لیے رمضان، شوال، ذیقعد اور ذی الحجہ پورے چار ماہ کے لیے یہ مدارس بند رہتے ہیں

عمارات مدارس: — اکثر مدرسے پرانے رہائشی مکانات کی عمارات میں کھول دیے گئے ہیں۔ لیکن بعض مدارس کے لیے نئی عمارتیں بھی بنائی جا رہی ہیں۔ بڑے شہروں میں آبادی کے اندر مدارس کے لیے قطعات زمین حاصل کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ بالخصوص مکہ مکرمہ میں جو ایک گنجان آباد شہر ہے اور بلند پہاڑوں سے چاروں طرف سے گھرا ہوا ہے۔ ویسے نئی عمارات کا بنوانا بھی وہاں کوئی آسان کام نہیں، ایک ایک عمارت پر لاکھوں ریال خرچ آ جاتے ہیں۔ سامان تعمیر میں لکڑی اور مزدوری بہت مہنگی ہے —

اچھا معمار پندرہ بیس ریال یومیہ سے کم اجرت پر دستیاب نہیں ہوتا۔ اس طرح ایک مزدور پانچ سات ریال یومیہ اجرت پاتا ہے۔ انہی مجبوریوں کے پیش نظر فی الحال رہائش، مکانات، دفاتر اور مدارس کے لیے استعمال کیے جا رہے ہیں۔ مدارس کی عمارات عموماً سہ منزلہ ہیں، ان میں سب سے بڑی کمی کھیل کے میدانوں کی ہے۔ زمین کے سنگلاخ ہونے کی وجہ سے کھیل کے میدان مہیا کرنا خاصا دشوار کام ہے۔ اس لیے مدارس میں تربیت جسمانی کو نصاب میں شامل نہیں رکھا گیا۔ جماعتوں کے کمرے تنگ لیکن صاف ستھرے ہیں۔ صدر مدرسین کے دفاتر اچھے خوب صورت اور آراستہ ہوتے ہیں اور میز اور کرسیوں کے علاوہ وہاں اساتذہ اور ملاقاتیوں کے لیے مشرقی طرز کی دیوار نشست کا انتظام بھی ہوتا ہے۔ جہاں بہت سے تکیے رکھے رہتے ہیں۔ مکہ مکرمہ کے ہر مدرسہ میں ٹیلیفون لگا ہوا ہے، اکثر مدارس میں برقی پنکھے اور قمقمے آویزاں نظر آتے ہیں۔ یہ عمارات عموماً کرایہ کی ہیں اور حکومت کو کئی ہزار ریال سالانہ ہر عمارت کے کرائے کے طور پر ادا کرنے پڑتے ہیں۔

درسی کتب :۔ سعودی عرب میں چونکہ کوئی عمدہ مطبع نہیں، اس لیے تمام درسی کتابیں مصر سے چھپ کر آتی ہیں۔ بعض ابتدائی درسی کتابیں عرب مصنفین کی لکھی ہوئی ہیں۔ لیکن اکثر و بیشتر مصری ماہرین تعلیم کی تصانیف ہیں۔ مصر سعودی عرب کا تعلیمی کعبہ اور امام ہے۔ اور جدید تہذیب کی طرح سعودی عرب میں تعلیم بھی مصر ہی کے راہ سے آ رہی ہے۔ جدید تعلیم میں مصری نظام کو اپنایا گیا ہے وہیں کے اساتذہ ہیں اور وہیں کی کتابیں، مذہبی و درسی کتابوں کے علاوہ مخرب اخلاق اور فحش لٹریچر بھی چلا آتا ہے۔

سعودی عرب میں کوئی ادبی یا سیاسی رسالہ نہیں چھپتا۔ اور اس لحاظ سے شاید یہ دنیا کا سب سے پس ماندہ ملک ہے۔ صرف ایک روزانہ اخبار "بلاد السعودیہ" کے نام سے مکہ مکرمہ سے شائع ہوتا ہے۔ ایک ہفتہ وار اخبار "أم القرآئی" بھی یہیں سے نکلتا ہے، یہ دونوں اخبار سرکاری گزٹ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہاں کسی سیاسی جماعت۔ سیاسی آرگن، یا آزاد پریس کے بارے میں سوچنا بھی جرم ہے۔ جدہ میں حال ہی میں ایک بہت بڑا مطبع قائم کیا گیا ہے

اور طباعت کے لیے سعودی عرب کو مصر کا محتاج نہیں ہونا پڑے گا۔

مدرسہ عزیزیہ مکۃ المکرمہ :- ستمبر ۱۹۵۴ء میں مکۃ المکرمہ کے بہت سے مدارس دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ تمام مدارس کا حال یہاں لکھنا تو ممکن نہیں البتہ ایک ابتدائی مدرسہ کا ذکر کیا جاتا ہے اس سے باقی مدارس کی حالت کی عکاسی ہو جائے گی۔ یہ مدرسہ بیت اور شریف کے قریب باب الزیادہ کے باہر ایک بازار میں واقع ہے۔ اس میں اس وقت جب میں نے اسے دیکھا ۶۵۸ طلبہ زیر تعلیم تھے، اور کل چودہ فریق تھے۔ پہلی اور دوسری جماعت کے تین تین فریق تھے اور باقی چاروں جماعتوں کے چار چار۔ ہر جماعت میں تقریباً ۵۰ بچے زیر تعلیم تھے۔ مدرسین کی کل تعداد ۲۲ تھی۔ اور اکثر مدرسین غیر تربیت یافتہ تھے۔ اس کی عمارت میں ۱۹ کمرے تھے اور ان میں سے ایک دفتر کے طور پر اور ۱۸ جماعتوں کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ مدرسہ کا نظم و نسق خوب تھا۔ طلبہ کے بیٹھنے کے لیے ڈیسک مہیا کیے گئے تھے۔ دفتر اور جماعتوں کے کمرے صاف ستھرے اور خوب صورت تھے بچوں کا لباس نہایت عمدہ اور نفیس تھا۔ بچوں نے انگریزی وضع کے بال سروں پر رکھے ہوئے تھے لیکن کوئی بچہ سر سے ننگا نہ تھا۔ سب کے سروں پر مخصوص عربی ٹوپیاں تھیں اور انہوں نے چوکور رومالوں کو تکون بنا کر کندھوں کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ ہر طالب علم کے پاس کتابیں رکھنے کے لیے چمڑے یا پلائی وڈ کا ایک عمدہ جزدان موجود تھا۔ بچوں کے چہروں سے شوخی اور ذہانت کے آثار نمایاں تھے۔

شہروں میں جو بچے زیر تعلیم ہیں، ان میں امرا کے بچوں کی تعداد زیادہ ہے، غربا کے بچے یا محنت مزدوری کرتے ہیں اور یا بھیک مانگتے ہیں، موجودہ مدارس ان شہروں کی ضروریات کے لیے کافی نہیں۔ مکہ مکرمہ میں کوئی دو لاکھ آدمی آباد ہوں گے اور وہاں صرف چھ سات ہزار بچے ابتدائی مدارس میں زیر تعلیم ہیں اور ظاہر ہے کہ ایسے بچوں کی ایک کثیر تعداد جنہیں مدرسہ میں جانا چاہیے تنگ گلیوں میں آوارہ پھرتی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ موجودہ جدید تعلیمی اداروں کی عمر پانچ سال سے زیادہ نہیں۔ اور اس قلیل مدت میں حکومت نے تعلیم کو عام کرنے کے سلسلے میں خاصی۔

سرکاری جریدہ کے اعلانات

صیغہ رجسال ـــــــــــــــــ شعبۂ مدارس

۴۴۹۶۴ عبدالحمید ایم، ایس سی (زراعت)، بی ٹی (۲۵۰ ـــ ۳۵۵) زراعت ماسٹر گورنمنٹ نارمل اسکول
یکم ستمبر ۵۵ء قصور کو تاریخ حاضری سے م۔ نور احمد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر زراعت ماسٹر
گورنمنٹ نارمل اسکول چنیوٹ مقرر کیا گیا۔

〃 م۔ نور احمد بی، ایس سی (زراعت) (۱۳۰ ـــ ۲۵۰) زراعت ماسٹر گورنمنٹ نارمل اسکول
چنیوٹ کو تاریخ حاضری سے م۔ سردار احمد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر زراعت
ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول شرق پور مقرر کیا گیا۔

〃 سردار محمد بی۔ ایس سی (زراعت) (۱۳۰ ـــ ۲۵۰) زراعت ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول
شرق پور کو تاریخ حاضری سے۔ م۔ تنویر احمد خاں کی جگہ جو لمبی رخصت پہ گئے ہیں اپنی تنخواہ پر
زراعت ماسٹر گورنمنٹ نارمل اسکول لکھوڑ مقرر کیا گیا۔

۵۹۰ ۱۔ محمد افضل بی کام، بی۔ ٹی۔ انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول رتیالہ خورد کو تاریخ حاضری سے
۲ جنوری ۵۶ء م۔ نیاز محمد بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۲۵۰ ـــ ۳۵۵) جو یکم جنوری ۵۶ء سے ریٹائر ہو چکے
ہیں کی جگہ اپنی تنخواہ پر انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول منٹگمری مقرر کیا گیا۔

۷۲۲ ۱۔ م۔ مرتضےٰ حسین منشی فاضل، مولوی فاضل (۶۰ ـــ ۱۴۰) عربی ٹیچر گورنمنٹ ہائی اسکول
۷ جنوری ۵۶ء باغبان پورہ کو (۶۰ ـ ۴ ـ ۱۰۰) کے گریڈ میں یکم نومبر ۵۴ء سے کلاسیکل اور ورنیکلر
سیکشن میں مقرر کیا گیا اور ان کو اسی سکیل میں یکم نومبر ۵۵ء سے مستقل کیا گیا۔

۶۸۶ م۔ محمود علی خاں میٹرک، ایس، وی (۶۰ ـــ ۱۴۰) ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی اسکول چونیاں
۷ جنوری ۵۶ء کو ۲ جنوری ۵۶ء کے بعد سے یا تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر م۔ محمد ابراہیم فاروقی

جن کا انتقال ہو چکا ہے کی جگہ ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی اسکول شیخوپورہ مقرر کیا گیا۔

۶۸۷ امیدوار مرزا مجید حسن میٹرک کو تاریخ حاضری سے (۶۰ - ۴ - ۱۰۰) کے گریڈ میں۔

جنوری ۱۹۵۸ء م محمود علی خاں جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ کی جگہ ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی اسکول چونیاں مقرر کیا گیا۔

۱۰۴۶ م نعیق رسول شاہ بی۔ ایس سی۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ ـــ ۲۵۰) انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی

۱۱ جنوری ۱۹۵۸ء اسکول دیپوآ کو تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر م فیض محمد خاں جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ کی جگہ انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول جام پور مقرر کیا گیا۔

۳۵۹۲۶ ۱۔ م عبدالغفور بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ ـــ ۲۵۰) انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول دیپوآ

۱۲ دسمبر ۱۹۵۸ء کو تاریخ حاضری سے گورنمنٹ ہائی اسکول ڈیرہ غازی خان میں اپنی تنخواہ پر انگلش ماسٹر مقرر کیا گیا۔

" ۲۔ م محمد راجن شاہ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ ـــ ۲۵۰) انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول جام پور کو تاریخ حاضری سے گورنمنٹ ہائی اسکول ڈیرہ غازی خان میں اپنی تنخواہ پر انگلش ماسٹر مقرر کیا گیا۔

" ۳۔ م عبدالحمید سلیمی۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ ـــ ۲۵۰) انگلش ماسٹر ہائی اسکول پاکپتن کو تاریخ حاضری سے گورنمنٹ ہائی اسکول لئیہ میں اپنی تنخواہ پر مقرر کیا گیا۔

" ۴۔ م گل محمد بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ ـــ ۲۵۰) انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول رنگپور کو تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر م مجید اللہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے کی جگہ انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول علی پور مقرر کیا گیا۔

" ۵۔ م مجید اللہ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ ـــ ۲۵۰) انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول علی پور کو تاریخ حاضری سے م سید رحمت علی شاہ کی جگہ جو رخصت پر ہیں۔ اپنی تنخواہ پر انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول دیپوآ مقرر کیا گیا۔

۳۵۹۲۱ م۔ عبدالحکیم ظفر بی۔ اے۔ بی۔ ٹی ہیڈ ماسٹر کو تاریخ حاضری سے م۔ عبدالحمید سلیمی کی جگہ جن کا
۱۱ دسمبر ۵۵ء تبادلہ ہو چکا ہے۔ انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول پاک پتن مقرر کیا گیا۔

۳۶۳۶۲ مسٹر نثار الحسن ایم۔ اے (فارسی) بی۔ ٹی۔ انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول جھنگ کو مورخہ
۱۶ دسمبر ۵۵ء ۱۱ جون ۵۵ء سے دو سو روپے ماہوار تنخواہ مع الاونس عارضی جونیئر لیکچرر سنٹرل
ٹریننگ کالج لاہور کی آسامی پر مقرر کیا گیا۔

۳۶۶۳۴ ایس خان شاہ (۶۰ — ۱۴۰) پی۔ ٹی۔ آئی۔ گورنمنٹ ٹیکنیکل ہائی اسکول جوہر آباد کو اپنی تنخواہ
۱۹ دسمبر ۵۵ء پر تاریخ حاضری سے م۔ احمد علی حسن جن کا تبادلہ ہو چکا ہے کی جگہ پر پی۔ ٹی۔ آئی گورنمنٹ
ہائی اسکول پھالیہ مقرر کیا گیا۔

" م۔ احمد علی حسن میٹرک پی۔ ٹی (۶۰ — ۱۴۰) عارضی پی۔ ٹی آئی گورنمنٹ ہائی اسکول
پھالیہ کو اپنی تنخواہ پر تاریخ حاضری سے ایس خان شاہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے کی جگہ عارضی
پی۔ ٹی۔ آئی گورنمنٹ ٹیکنیکل ہائی اسکول جوہر آباد مقرر کیا گیا۔

۳۶۷۲۱ م۔ فیض محمد خان بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ — ۲۵۰) انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول دھوآ کہ
۲۰ دسمبر ۵۵ء جن کے تبادلہ کے احکام جاری کیے جا چکے ہیں۔ تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر م۔ حبیب الرحمن
بی۔ اے۔ بی۔ ٹی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول تونسہ مقرر کیا گیا۔

" م۔ حبیب الرحمن بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ — ۲۵۰) انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول
تونسہ کو تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر م۔ فیض رسول جن کا تبادلہ ہو چکا ہے کی جگہ پر
انگلش ماسٹر ہائی اسکول راجن پور مقرر کیا گیا۔

" م۔ فیض رسول بی۔ ایس سی (۱۳۰ — ۲۵۰) انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول
دھوآ کو تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر فیض محمد خان جن کا تبادلہ ہو چکا ہے کی جگہ پر
انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول راجن پور مقرر کیا گیا۔

۳۷۱۳۰ م۔ ظفر اقبال ظفر میٹرک۔ پی۔ ٹی (۶۰ — ۱۴۰) پی۔ ٹی۔ آئی گورنمنٹ ہائی اسکول
۲۲ دسمبر ۵۵ء

چکوال کو تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر مسٹر محمد اسلم شیخ جن کو عارضی پی۔ٹی
آئی۔ گورنمنٹ نارمل اسکول گکھڑ مقرر کیا گیا کی جگہ پر پی۔ٹی۔آئی گورنمنٹ ہائی اسکول
گوجرانوالہ مقرر کیا گیا۔

۳۷۱۳۷ ۲۴ دسمبر ۵۵ء م۔ محمد مسعود امیدوار، میٹرک پی۔ٹی کو تاریخ حاضری سے -/-/۷۲ روپے ماہوار (۶۰ — ۴ — ۱۰۰) کے گریڈ میں ماسٹر ظفر اقبال ظفر جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ کی جگہ پر مقرر کیا گیا۔

ر م۔ عبدالرشید امیدوار میٹرک پی۔ٹی کو تاریخ حاضری سے -/۷۲ روپے ماہوار (۶۰ — ۴ — ۱۰۰) کے گریڈ میں محمد زمان اللہ خان۔ پی۔ٹی۔ آئی۔ گورنمنٹ ہائی اسکول مٹھا ٹوانہ جو لمبی رخصت پر ہیں، کی جگہ عارضی پی۔ٹی۔ آئی گورنمنٹ ہائی اسکول شورکوٹ مقرر کیا گیا۔

۳۷۱۴ ۲۴ دسمبر ۵۵ء حافظ عبدالرزاق۔ ایم۔ اے۔ بی۔ٹی۔ انگلش ٹیچر گورنمنٹ ہائی اسکول چکوال (۳۰ — ۱۰ — ۲۰۰) کو ۲۹ نومبر ۱۹۵۵ء قبل دوپہر سے -/۲۵۰ روپے ماہوار (۲۵۰ — ۲۰ — ۴۵۰) کے گریڈ میں عارضی جونیئر لیکچرر اسلامیات و عربی ایمرسن کالج ملتان ایک خالی اسامی پر مقرر کیا گیا۔

۳۷۲۶۵ ۲۷ دسمبر ۵۵ء مسٹر عباس علی شاہ ایم۔ اے (فارسی) بی۔ٹی۔ اے۔ ڈی۔ آئی ضلع جہلم کو ۷ ر اکتوبر ۱۹۵۵ء سے (۲۵۰ — ۲۰ — ۴۵۰) کے گریڈ میں بجا مسٹر محمد علی ایم۔ اے سینئر لیکچرر جو ریٹائر ہو چکے ہیں کی جگہ پر عارضی جونیئر لیکچرر گورنمنٹ کالج ڈیرہ غازی خان مقرر کیا گیا۔

۳۷۳۱۰ ۲۸ دسمبر ۵۵ء الیس۔ سردار شاہ بی۔ اے۔ بی۔ٹی (۱۳۰ — ۲۵۰) انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول کروڑ پکہ ضلع ملتان کو تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر چوہدری عبدالعزیز بی۔ اے۔ بی۔ٹی (۲۵۰ — ۳۵۵) مقرر شدہ ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول علی پور کی بجائے اے۔ ڈی۔ آئی۔ ضلع لائل پور مقرر کیا گیا۔

۱۳/۴ ۳ جنوری ۵۶ء م۔ عبدالمجید بی۔ اے، ایس۔ اے، وی (۲۵۰ — ۳۵۵) سیکنڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی ا

پسرورکو تاریخ حاضری سے، م فضل کریم کی جگہ جن کا تبادلہ گورنمنٹ ہائی اسکول خانیوال میں ہوچکا ہے اپنی تنخواہ پر ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول کروڑ پکہ متقرر کیا گیا۔

۳۶۲۲۸ م۔ منظور احمد۔ ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی (۲۵۰ — ۳۵۰) ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول
۱۵ دسمبر ۵۵ء علی پور کو م۔ محمد ضمیر عالم رٹیائرڈ کی جگہ تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول چونیاں متقرر کیا گیا۔

〃 چودھری عبدالعزیز بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۲۵۰ — ۳۵۵) اے۔ ڈی۔ آئی ضلع لائل پور کو تاریخ حاضری سے م۔ منظور احمد کی جگہ جن کا تبادلہ ہوچکا ہے اپنی تنخواہ پر ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول علی پور متقرر کیا گیا۔

〃 م۔ انور علی قریشی۔ ایم۔ اے، بی۔ ٹی (۲۵۰ — ۳۵۵) سیکنڈ ماسٹر گورنمنٹ سنٹرل ماڈل اسکول لاہور کو تاریخ حاضری سے م رشید احمد کی جگہ جن کا تبادلہ ہوچکا ہے اپنی تنخواہ پر ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول ساہی وال متقرر کیا گیا۔

〃 م۔ رشید احمد ایم۔ اے، ایس۔ اے، وی (۲۵۰ — ۳۵۵) ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول ساہی وال کو م۔ محمد اسحاق کی جگہ جن کا تبادلہ ہوچکا ہے تاریخ حاضری سے، اپنی تنخواہ پر ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول مظفر وال متقرر کیا گیا۔

〃 شیخ طالع منار۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۲۵۰ — ۳۵۵) ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول قصور کو تاریخ حاضری سے انعام علی رٹیائرڈ کی جگہ اپنی تنخواہ پر ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول باغبان پورہ متقرر کیا گیا۔

〃 م۔ نعمت علی خاں، ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی (۲۵۰ — ۳۵۵) سیکنڈ ماسٹر گورنمنٹ نارمل اسکول شاہ پور صدر کو م۔ شیر محمد کی جگہ جن کا تبادلہ گورنمنٹ ہائی اسکول چکوال ہوچکا ہے تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول للہ متقرر کیا گیا۔

〃 چودھری سلطان احمد ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی اسسٹنٹ انسپکٹر راولپنڈی ڈویژن

(۲۵۰ ـــ ۳۵۵) کو م بشیر بہادر کی جگہ جن کا تبادلہ گورنمنٹ ہائی اسکول میانوالی میں ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول عیسے خیل مقرر کیا گیا۔

۳۶۲۲ م۔ فضل کریم بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول کروڑ پکہ کو فتح شیر خان جنہیں یکم جنوری ۱۹۵۶ء سے ریٹائر ہو جانا ہے کی جگہ تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول خانے وال مقرر کیا گیا۔
۱۰ دسمبر ۱۹۵۵ء

〃 امیر عالم۔ ایم۔ اے۔ ایس۔ اے۔ وی (۲۵۰ ـــ ۳۵۰) اے۔ ڈی۔ آئی کیمبلپور کو۔ م۔ امیر الدین بی۔ اے۔ بی۔ ٹی کی جگہ جن کا تبادلہ گورنمنٹ ہائی اسکول کیمبلپور میں ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول حضرو مقرر کیا گیا۔

۱۰۴۶ م۔ فیض محمد خان۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ ـــ ۲۵۰) انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول جام پور کو تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر م۔ حبیب الرحمٰن کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول تونسہ مقرر کیا گیا۔
۱ جنوری ۱۹۵۶ء

〃 م۔ حبیب الرحمٰن۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ ـــ ۲۵۰) انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول تونسہ کو تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر م۔ فیض رسول شاہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے کی جگہ انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول دھوآ مقرر کیا گیا۔

۱۱۹۵ سید توکل حسین ایس۔ وی (۶۰ ـــ ۱۲۰) ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ نورمل اسکول چنیوٹ کو ۸ جنوری ۱۹۵۶ء یا بعد یا ان کی تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر م۔ اللہ دین ورنیکلر ٹیچر کی جگہ جنہوں نے ۸ جنوری ۱۹۵۶ء کو ریٹائر ہو جانا ہے۔ ورنیکلر گورنمنٹ ہائی اسکول جڑانوالہ مقرر کیا گیا۔
۱۲ جنوری ۱۹۵۶ء

〃 شاہ عالم شاہ گیلانی میٹرک۔ ایس۔ وی (ایک امیدوار) کو تاریخ حاضری سے سید توکل حسین کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے ۷۰/- روپے ماہوار (۶۰ ـ ۴ ـــ ۱۰۰) کے گریڈ میں ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ نارمل اسکول چنیوٹ مقرر کیا گیا۔

آموزش

۱۴۰) ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی اسکول شرقپور

1195 ۱۔ م۔ محمد نصر اللہ خاں میٹرک۔ ایس۔ وی (۶۰ —

۱۲ جنوری ۱۹۵۵ء کو ۱۵ جنوری ۱۹۵۶ء کے بعد سے یا ان کی تاریخ حاضری سے م۔ عبد الغفور ایس۔ وی۔ کی جگہ

جنہوں نے ۱۵ جنوری ۱۹۵۶ء کو ریٹائر ہو جانا ہے۔ ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی اسکول

جڑاں والہ مقرر کیا گیا۔

۲۔ م۔ عبد العلیم خاں ایس۔ وی (۶۰ — ۱۴۰) ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی اسکول جھنگ کو تاریخ

حاضری سے اپنی تنخواہ پر م۔ محمد نصر اللہ خاں کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے ورنیکلر ٹیچر

گورنمنٹ ہائی اسکول شرقپور مقرر کیا گیا۔

۳۔ م۔ محمد صدیق میٹرک ایس وی (۶۰ — ۱۴۰) ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی اسکول کمالیہ کو

تاریخ حاضری سے اپنی تنخواہ پر م۔ عبد العلیم خاں کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے ورنیکلر ٹیچر

گورنمنٹ ہائی اسکول جھنگ مقرر کیا گیا۔

۴۔ م۔ کرم الٰہی ایس۔ وی (۶۰ — ۱۴۰) ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ نارمل اسکول چنیوٹ کو تاریخ

حاضری سے اپنی تنخواہ پر م۔ محمد صدیق جن کا تبادلہ ہو چکا ہے کی جگہ ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ

ہائی اسکول کمالیہ مقرر کیا گیا۔

۵۔ م۔ عبد الرشید ارشد۔ ایس وی، منشی فاضل ایف۔ اے۔ ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی اسکول

پاک پتن کو تاریخ حاضری سے م۔ کرم الٰہی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ

اسکول چنیوٹ مقرر کیا گیا۔

۶۔ م۔ اقبال احمد میٹرک۔ ایس۔ وی (ایک امیدوار) کو (جو مسٹر عبد الغفور ایس۔ وی

گورنمنٹ ہائی اسکول جڑاں والہ کی جگہ کام کر رہے ہیں) تاریخ حاضری سے

عبد الرشید ارشد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی اسکول

پاک پتن - /۰/ ۷۲ روپے ماہوار (۶۰ — ۴ — ۱۰۰) کے گریڈ میں مقرر

کیا گیا۔

Regd. No. L. 5327

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اور

آموزش (اردو)

۱ - پاکستان بھر میں یہ دو ہی تعلیمی رسالے ہیں - جنکو سرکاری سرپرستی اور امداد حاصل ہے -

۲ - پاکستان بھر میں یہی دو تعلیمی رسالے ہیں - جو مرکزی اور صوبائی درسگاہوں اور تعلیمی حلقوں میں مقبول ہیں -

۳ - ان رسالوں کے متعلق ادارتی خطوط اور چھپنے والے مضامین ایڈیٹر (پرنسپل) سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور کو بھیجے جائیں - ان رسالوں میں چھپے ہوئے مضامین کیلئے معاوضہ دیا جاتا ہے -

۴ - یہ رسالے ہر مہینے کے دوسرے ہفتہ میں چھپتے ہیں اور ان کا چندہ آٹھ روپیہ (انگریزی) اور چھ روپیہ (اردو) ہے - جو کہ مینجر کو بھیجنا چاہئیے -

۵ - ان رسالوں میں اشتہار دینے سے آپکی اشیاء مقبول ہونگی - تجارتی معاملات کیلئے خط وکتابت مینجر سے کریں -

مینجر پنجاب ایجوکیشنل جرنل
آموزش

۷ کچہری روڈ - لاہور (پاکستان)

آموزش

جلد ۹ شمارہ ۱] لاھور [اپریل ۱

اس شمارہ میں

تعلیمی ماہ نامہ

آموزش

لاہور

اپریل سنہ ۱۹۵۶ء

جلد ــــــــــــ ۹

شمارہ ــــــــــــ ۱

سالانہ چندہ

پاکستان کے لیے ۶ روپے

غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز

یونی ورسٹی بک ایجنسی لاہور

آر۔ ایچ۔ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کے
یونی ورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

اداریہ

ایم۔ اے مخدومی

اپریل ۱۹۵۶ء سے ہم نئے تعلیمی سال میں داخل ہو چکے ہیں۔ ختم ہونے والا سال ایسے واقعات سے بھرپور ہے جو تعلیم کے لیے بے حد اہمیت رکھتے ہیں۔ ان میں اہم ترین واقعہ دستور کی تشکیل ہے یہ دستور ان توقعات اور آرزوؤں کا مجسمہ ہے جو پاکستان کو وجود میں لانے کا موجب بنی تھیں۔ پاکستان کے اسلامی جمہوریہ بن جانے سے قومی زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ بے شک پچھلے آٹھ برس سے ہمیں سیاسی آزادی حاصل رہی ہے لیکن سیاسی آزادی ہمیشہ بلند تر مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہوا کرتی ہے، دستور نے ان مقاصد کو واضح شکل دے کر قومی زندگی کی منزل کی نشان دہی کر دی ہے۔ یہ منزل تمام شہریوں کے لیے یکساں مواقع، فرد کی آزادی، ضمیر اور طریق عبادت کی آزادی۔ جان و مال کی حفاظت، اور سب سے بڑھ کر رائے عامہ کی فوقیت سے عبارت ہے۔

دستور ان تمام برکات کا سرچشمہ ثابت ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے لیے ضروری شرط یہ ہے، کہ عوام اپنے حقوق اور فرائض کو اچھی طرح سمجھنے لگیں۔ سیاسی آزادی کو با معنی بنانے کے لیے عوامی زندگی کے معیار میں نمایاں اصلاح ہونی چاہیے، دستور نے تعمیر و اصلاح کی عام ہیئت کی تعین کر دی ہے۔ مگر افلاس اور جہالت کے خلاف مہم میں یہ صرف پہلا قدم ہے۔ ناخواندگی اور فاقہ مستی سے چھٹکارا پانے کے لیے جو جنگ لڑی جا رہی تھی وہ اب ایک نئے دور میں داخل ہو رہی ہے۔ تعلیم کو اس جنگ میں اہم ترین کردار ادا کرنا ہوگا۔

تعلیم ایک صوبائی ذمہ داری ہے، اس کے باوجود مرکزی حکومت نے پہلے دن سے یہ

ذمہ داری قبول کی ہے کہ تعلیمی میدان میں رہنمائی کرے۔ مرکزی میزانیہ میں تعلیم کے لیے ہر سال پہلے سے زیادہ رقم وقف کی جاتی رہی ہیں۔ سالِ رواں کے میزانیہ نے بھی یہ خصوصیت برقرار رکھی ہے۔ حکومت کو اس بات کا قوی احساس ہے کہ نئی پود کی تعلیم ہی ملک کے مستقبل کی بہترین ضمانت ہے۔ یہ اسی یقین کا نتیجہ ہے کہ سالِ رواں کے میزانیہ میں کم آمدنی والے ملازمین کے بچوں کا تعلیمی بوجھ بٹانے کے لیے گنجائش رکھی گئی ہے۔ یہ مدد فی بچہ دو سو روپے سالانہ ہے اور اس کی زیادہ سے زیادہ حد چھ سو روپے سالانہ تک ہے۔ یہ مالی مدد کم آمدنی والے والدین کے ایک چھوٹے سے گروہ تک محدود ہے۔ اس قسم کے امدادی منصوبوں کی تعداد اور ان کے دائرۂ عمل میں لگاتار اضافہ ہونا چاہیے۔ تاآں کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے ہر شہری کو یہ موقع میسر آجائے کہ اپنے خداداد جوہروں کو امکانی حد تک ترقی دے سکے۔

یہ ایک بہت بڑا کام ہے جس میں ملک کے روشن خیال طبقہ کو اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔ پاکستان جیسے کم ترقی یافتہ معاشرے میں نجی اداروں پر یہ فرض شدت سے عائد ہوتا ہے کہ وہ حکومت کی فلاحی کوششوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔ سچ یہ ہے کہ معاشرتی بہبود اور تعلیم کے میدانوں میں رہنمائی کا کام ان شہریوں کے ہاتھ میں ہونا چاہیے جو باقیوں کے مقابلہ میں اس لحاظ سے خوش نصیب ہیں کہ انہیں بہتر تعلیم اور وسیع تر علم و تجربہ کے مواقع ہاتھ لگے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو فکر و عمل کی بہتر صلاحیتیں رکھتے ہیں۔ ان لوگوں کا فرض ہے کہ جہالت اور بدحالی کے خلاف جہاد میں ہراول دستے کا کام دیں۔ جن نوجوانوں نے حصولِ پاکستان کے لیے جنگ لڑی تھی، ان کا فرض ہے کہ آج پاکستان کے خوب صورت خواب کو عملی شکل دینے کے لیے پہلے سے زیادہ مستعدی کے ساتھ مصروفِ جہاد ہوں۔ انہیں عوام سے اس قدر قریب ہو جانا چاہیے، کہ عوامی مفاد ان کا اپنا مفاد اور عوامی مسائل ان کے اپنے مسائل بن جائیں، صرف یہ جذبۂ خدمت ہی وہ جادو ہے جو عوام کو زندگی کے نئے معانی کی خبر دے سکتا ہے اور انہیں ان چیزوں کے اخذ کرنے پر ابھار سکتا ہے جو انہیں باشعور اور معاشی طور پر قابل شہری بنادیں۔

اشیاء حرارت سے کیسے پھیلتی ہیں
سبقوں کے خاکے

عبدالغفور چوہدری — مسلسل

کثافت سائنس کے نصاب کا ایک موضوع ہے، اس مضمون پر ایک ایسے سبق کا خاکہ دیا گیا ہے جس میں اس کی تدریس کا مقصد بچوں کو سائنس کی معلومات بہم پہنچانا نہیں بلکہ ان میں طریق سائنس کے مطابق استدلال کرنے اور غور و فکر کی عادت پیدا کرنا ہے۔ اب آپ اس سبق کو پڑھ کر اندازہ لگائیں کہ استاد اپنے اس مقصد میں کہاں تک کامیاب رہا۔ بچوں کی عمر ۱۳ - ۱۴ سال ہے اور آٹھویں درجہ میں پڑھ رہے ہیں۔

استاد:- اگر ہم ایک کارک کو پانی میں ڈالیں تو وہ تیرتا ہے۔ اب ہم اس پانی میں لوہے کا یہ ٹکڑا ڈالیں تو یہ ڈوب جاتا ہے۔ بھلا بتاؤ تو یہ کیا بات ہے کہ کارک تیرتا ہے اور لوہا ڈوب جاتا ہے۔

شاگرد:- لوہا زمین سے نکالا جاتا ہے۔

دوسرا شاگرد:- لوہے کی کثافت کارک کی کثافت سے بہت زیادہ ہے۔

تیسرا شاگرد:- لوہے کا وزن کارک کے وزن سے زیادہ ہے۔

چوتھا شاگرد:- کارک میں ہوا بھری ہوئی ہے اور اس ہوا کی وجہ سے وہ تیرتا ہے۔

(استاد کارک اور لوہے کے ٹکڑے کو ترازو کے دو پلڑوں میں رکھ دیتا ہے۔ وہ پلڑا جس میں کارک رکھا ہوا ہے)

استاد:- ہاں بھئی احمد نے کہا ہے کہ لوہا اس لیے ڈوب جاتا ہے کہ اس کا وزن کارک سے زیادہ ہے۔ مگر تولنے سے ہمیں کیا پتہ چلا۔

شاگرد:- یہ کہ کارک کا وزن لوہے سے زیادہ ہے۔

دوسرا شاگرد:- تو ماسٹر صاحب اس سے تو یہ ثابت ہوا کہ وزن کا کسی شے کے تیرنے پر کوئی

اثر نہیں۔ لیکن اگر وزن کا نہ ہو تو اور کس چیز کا ہو سکتا ہے؟

استاد:۔ تو بھئی یہ ایک پلاسٹیسن کا ٹکڑا ہے۔ اس کو پانی میں ڈالیں تو کیا ہوگا۔

شاگرد:۔ یہ ڈوب جائے گا۔

استاد:۔ کوئی ایسی ترکیب ہو سکتی ہے کہ یہ نہ ڈوبے۔

شاگرد:۔ ماسٹر صاحب اس کو پھیلا کر اس کی ایک کشتی سی بنا دیجیے پھر اسے پانی میں ڈال دیجیے بڑے مزے سے یہ تیرنے لگے گی۔

(ماسٹر صاحب اس کی کشتی بنا کر پانی میں ڈالتے ہیں۔ کشتی تیرنے لگتی ہے۔ اب ماسٹر صاحب لڑکوں سے پوچھتے ہیں)

استاد:۔ اچھا اب یہ بتاؤ کہ یہ پلاسٹیسن کا ٹکڑا پہلے تو پانی میں ڈوب گیا۔ اب تیرنے لگا۔ کیا اس کے وزن میں پہلے سے کوئی تبدیلی آگئی ہے۔

شاگرد:۔ نہیں ماسٹر صاحب بس آپ نے اس کو خول دار بنا دیا ہے۔

استاد:۔ ہاں تو بھئی اگر اس کے وزن میں تبدیلی نہیں ہوئی تو کس چیز میں تبدیلی ہوئی۔

شاگرد:۔ حجم میں۔

استاد:۔ اچھا آئیے اب ایک اور تجربہ بھی کریں۔

(ماسٹر صاحب ایک ٹین کا ڈبہ لیتے ہیں اور اس کے برابر لوہے کا ٹکڑا۔ ان دونوں کو پانی میں ڈالتے ہیں۔ ٹین کا ڈبہ تیرنے لگتا ہے اور لوہے کا ٹکڑا ڈوب جاتا ہے)

استاد:۔ اچھا اب بتاؤ کہ کسی چیز کے پانی میں ڈوبنے یا تیرنے کا کس بات سے پتہ چلتا ہے۔

شاگرد:۔ بعض چیزیں پھولی سی ہوتی ہیں اور ٹھوس نہیں ہوتیں وہ تیرتی ہیں۔ بعض بالکل ٹھوس ہوتی ہیں وہ ڈوب جاتی ہیں۔

استاد:۔ تو بھئی یوں کہو کہ اس بات کا انحصار اس بات کے ٹھوس پن پر ہے۔ ٹھوس پن کو کثافت بھی کہتے ہیں۔

تمہیں معلوم ہے کسی شے کی کثافت کیسے معلوم کرتے ہیں۔ اس کا گُر میں بورڈ پر لکھے دیتا ہوں۔

$\frac{\text{وزن}}{\text{حجم}}$ = کثافت

دیکھو ٹین کے ڈبے کا وزن تو بالکل لوہے کے ٹکڑے کے برابر ہے۔ مگر لوہے کا وہ ٹکڑا جس کا ڈبہ بنا ہوا ہے، اتنا کھوکھلا اور اس کا حجم اتنا زیادہ ہے کہ اس کی کثافت لوہے کے ٹھوس ٹکڑے سے بہت کم ہے۔ اب کسی چیز کا حجم جتنا ہوگا اتنی ہی اس کی کثافت کم ہو گی۔ کارک کا بھی یہی حال ہے۔ اس کا وزن لوہے کے ٹکڑے کے برابر تھا۔ مگر اس کا حجم زیادہ تھا۔ اس لیے اس کی کثافت بھی کم تھی۔

بھلا بتاؤ تو لوہے کی کثافت کتنی ہوتی ہے؟

شاگرد:- ۷٫۸ گرام فی مکعب سینٹی میٹر

استاد:- اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر ہم لوہے کا ایک ایسا مکعب لیں جس کی لمبائی چوڑائی اور موٹائی ایک ایک سینٹی میٹر ہو تو اس کا وزن ۷٫۸ گرام ہوگا، اسی کو کثافت کہتے ہیں۔

شاگرد:- تو ماسٹر صاحب کیا پانی کی بھی کثافت ہوتی ہے۔

استاد:- کیوں نہیں۔ تم اپنے خیال میں پانی کے ایک ایسے مکعب کا تصور کرو جس کی لمبائی چوڑائی اور موٹائی ایک ایک سینٹی میٹر ہو اور اسے وزن کرلو۔ وہ پانی کی کثافت ہو گی۔ پانی کی کثافت ایک گرام ہوتی ہے۔

شاگرد:- تو لوہے کا ٹکڑا پانی میں کیوں ڈوب جاتا ہے۔

استاد:- کیوں کہ اس کی کثافت پانی سے زیادہ ہے۔

شاگرد:- ماسٹر صاحب کل ہمارے ہاں مچھر مار محکمے کے لوگ آئے تھے۔ انہوں نے جوہڑ میں تیل پھینکا تو سب کا سب اوپر ہی رہا۔ پانی کے اندر نہیں ڈوبا۔

استاد:- بھئی ڈوبے کیسے، تیل کی کثافت پانی سے بھی کم ہے۔ اس لیے وہ پانی میں ڈوبتا نہیں۔

شاگرد:- مگر ماسٹر صاحب ہمارے بڑے بھائی نے ہمیں ایک دفعہ جادو کا تماشہ دکھایا ان کے

پاس لوہے کی ایک گولی تھی۔ انہوں نے بوتل میں سے ایک چاندی کی طرح چمکتا ہوا مائع نکالا اور گولی کو اس پر رکھا تو وہ اس پر لڑکھنے لگی اور دبانے سے اس کے اندر نہ ڈوبی۔

استاد:- ہاں بھئی یہ تم نے خوب بتائی۔ ہم بھی تمہیں جادو کا تماشہ دکھاتے ہیں (استاد چینی کی ایک ڈش میں پارہ ڈالتا ہے اور اس میں لوہے کے ٹکڑے کو رکھتا ہے جو تیرتا ہے۔ لڑکے اس تماشے کو حیران ہو ہو کر دیکھتے ہیں۔ استاد ٹکڑے کو نکال لیتا ہے۔ اتنے میں ایک لڑکا ڈش کو اٹھاتا ہے اور حیران سا ہو کر دوبارہ نیچے رکھ دیتا ہے)

شاگرد:- ماسٹر صاحب یہ پارہ تو بہت بھاری ہے۔

استاد:- ہاں بھئی اس لیے کہ اگر کوئی بہت کھالے تو کہا کرتے ہیں کہ اس کا پیٹ تو اتنا بھاری ہو گیا ہے۔ جیسے کسی چوہے کو پارہ پلا دیا ہو۔ تمہیں معلوم ہے پارے کی کثافت کتنی ہے۔ اس کی کثافت ۶ء۱۳ گرام ہے۔

شاگرد:- ماسٹر صاحب اب سمجھ میں آیا کہ اس میں لوہا کیوں تیرتا ہے۔ لوہے کی کثافت تو ۵ء۸ گرام ہے۔ چوں کہ لوہے کی کثافت پارے کی کثافت سے اتنی کم ہے اس لیے لوہا پارے میں تیرنے لگتا ہے۔

استاد:- اچھا تو بتاؤ کارک کی کثافت کتنی ہوتی ہے۔

(بچے خاموش رہتے ہیں)

کارک کی کثافت ۱۵ء گرام ہے۔ یعنی پانی کی کثافت سے کوئی چھ سات حصے کم۔ اس لیے کارک پانی میں خوب تیرتا ہے۔

(اب استاد اپنے ہاتھ میں شیشے کا ایک ٹکڑا اٹھاتا ہے)

اچھا اب یہ بتاؤ شیشے کا یہ ٹکڑا پانی میں تیرے گا یا ڈوب جائے گا۔

شاگرد:- ماسٹر صاحب پہلے یہ بتایئے کہ اس کی کثافت پانی سے زیادہ ہے یا کم۔

استاد:- شیشے کی کثافت تقریباً ۵ء۲ گرام ہے۔ اب بتاؤ کیا یہ پانی میں ڈوب جائے گا؟

شاگرد:۔ ضرور ڈوبے گا۔

استاد۔ اچھا ہم شیشے کے اس ٹکڑے کی جگہ یہ آزمائشی نلی پانی میں ڈال کر دیکھتے ہیں (استاد شیشے کی ایک آزمائشی نلی پانی میں ڈالتا ہے۔ نلی پانی پر تیرتی رہتی ہے)

دیکھو یہ نلی پانی میں ڈوبی نہیں بلکہ برابر تیر رہی ہے۔

ایک لڑکا:۔ اس کا منہ پانی میں الٹ کر دیکھیں۔

(استاد اسے الٹا کر دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ اس حالت میں بھی آزمائشی نلی پانی میں نہیں ڈوبتی)

دوسرا لڑکا:۔ اسے پانی سے بھر دیجیے۔

(استاد اس میں کچھ پانی ڈالتا ہے لیکن نلی اب بھی نہیں ڈوبتی بلکہ برابر تیرتی رہتی ہے۔

استاد:۔ ایک جہاز کا معاملہ بھی اس آزمائشی نلی کا سا ہی ہوتا ہے۔ ہاں ایک فرق ضرور ہے آزمائشی نلی کو پانی سے بھر بھی دیں تب بھی نہیں ڈوبتی۔ جہاز کا معاملہ مختلف ہے۔ اس میں تھوڑا بہت پانی بھی آجائے تو ڈوب جاتا ہے۔ آئیے اب تماشا دکھائیں۔ اس آزمائشی نلی کو پانی میں ایسے انداز سے رکھیں کہ بالکل متوازن ہو جائے۔

شاگرد:۔ متوازن کیا۔

استاد:۔ بچوں کبھی تم نے دوکاندار کو ترازو سے تولتے نہیں دیکھا۔ ذری سی چیز نکال لیتا ہے تو ایک پلڑا جھک جاتا ہے۔ ذری سی اور ڈال دیتا ہے تو دوسرا پلڑا جھک جاتا ہے۔ اب میں اس نلی میں لوہے کے چھرّے ڈالتا ہوں۔ بھلا میں اس کے وزن کو کیا کر رہا ہوں۔

شاگرد:۔ آپ اس کے وزن کو بڑھا رہے ہیں پھر یہ ڈوبنے لگے گی۔ عین اس وقت جب پوری آزمائشی نلی کی کثافت پانی کی کثافت سے زیادہ ہو جائے گی۔

استاد:۔ پانی کی کثافت کیا ہے

شاگرد۔ ایک گرام فی مکعب سینٹی میٹر۔

(استاد بچوں کو پھر تیرتی ہوئی آزمائشی نلی کو دکھاتا ہے)

استاد:- اس سے تم کیا نتیجہ نکالتے ہو۔

شاگرد:- یہی کہ اس پوری آزمائشی نلی کی کثافت پانی کے برابر ہے۔

(اب استاد اس میں جست کا ایک چھرّہ اور ڈالتا ہے اور نلی ڈوبنے لگتی ہے)

استاد:- بھلا کسی طرح کارک بھی پانی میں ڈوب سکتا ہے۔

شاگرد:- کیوں نہیں ماسٹر صاحب اس کو کسی دھات کے بھاری ٹکڑے سے باندھ دیجیے۔ آپ ہی آپ ڈوب جائے گا۔

استاد:- کیوں اس کی کیا وجہ ہے

شاگرد:- اس کی وجہ یہ ہے کہ دھات کے بھاری ٹکڑے سے مل کر ان دونوں کی کثافت پانی سے زیادہ ہو جائے گی۔

استاد:- آئیے اس تجربے کو اپنے ہاتھ سے کرکے دیکھیں۔

(استاد کارک کے ساتھ دھات کا ایک مکعب ٹکڑا باندھ کر انہیں پانی میں ڈالتا ہے)

استاد:- بچو دیکھو چونکہ کارک پانی سے ہلکا ہے، اس لیے تیر رہا ہے، دھات کا ٹکڑا بھاری تھا اس لیے پانی کے اندر چلا گیا۔ اب دیکھو میں نے دھات کا ٹکڑا کارک کے اوپر رکھ دیا۔ یہ اب بھی تیر رہا ہے، اس کی کیا وجہ ہے۔

شاگرد:- کارک کی کثافت یا ٹھوس پن کم ہے اس لیے وہ زیادہ حجم گھیرتا ہے۔ اور وزن اتنا بھاری نہیں ہوتا جو اسے پانی میں غرق کرے۔

استاد:- بالکل ٹھیک اب ایک جہاز کا معاملہ بھی اسی طرح سمجھ لو۔ اگر تم اس میں بہت زیادہ وزن لاد دو گے تو یہ ڈوب جائے گا۔ اس کارک پر تو ہم نے اتنا وزن نہیں رکھا کہ یہ ڈوب جائے ہم نے اس پر المونیم کا ایک مکعب ٹکڑا رکھا تھا۔ تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ اس کا وزن کتنا ہوگا۔ اس کا وزن تقریباً چالیس گرام ہے۔ کارک کا وزن دس گرام ہے

دونوں کا وزن کتنا ہوا۔

شاگرد۔ تقریباً پچاس گرام۔

استاد۔ اچھا اب ان دونوں کے حجم کا کچھ اندازہ لگاؤ (بچے سوچتے ہیں)

دیکھو۔ کارک اور المونیم کا یہ مکعب پانی میں تیر رہا ہے تو ان کی کثافت پانی سے زیادہ ہوگی یا کم۔

شاگرد۔ پانی سے کچھ کم ہی ہوگی۔ اگر زیادہ ہوتی تو یہ ضرور ڈوب جاتی۔

استاد۔ اچھا پانی کی کثافت کتنی ہوتی ہے؟

شاگرد۔ ایک گرام فی مکعب سی سی

استاد۔ فرض کرو کہ یہ دونوں بس ایسی حالت میں ہیں کہ ڈوبنے اور تیرنے کے درمیان ہیں۔ نہ بالکل تیر رہے ہیں۔ نہ ڈوب رہے ہیں تو ان کا حجم کیا ہوگا۔

شاگرد۔ ماسٹر صاحب ان کا وزن تو ۵۰ گرام تھا۔ ان کا حجم پچاس سی۔سی سے کچھ زیادہ ہوگا۔ کیوں کہ ان دونوں کی کثافت ایک سے کچھ ہی کم ہوگی۔ اس لیے۔

استاد۔ یعنی۔

شاگرد۔ یعنی $\frac{\text{۵۰ گرام}}{\text{حجم}}$ = ایک سے قدرے کم۔ اس لیے اس کا حجم پچاس سی سی سے کچھ زیادہ ہوگا۔

استاد۔ بالکل ٹھیک۔ اچھا ایک بات بتاؤ کسی چیز کو ہاتھ سے چھوڑ دیں یا گرائیں تو زمین پر گرتی ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے۔

شاگرد۔ اسے زمین اپنی طرف کھینچتی ہے

استاد۔ تو یہ کارک اور المونیم کا مکعب ٹکڑا جو پانی پر تیر رہا ہے نیچے کیوں نہیں جاتا۔ اس کو پانی کی قوت اوپر کو دھکیل رہی ہے اور زمین نیچے کو کھینچتی ہے

شاگرد۔ اگر پانی کا زور زمین کی کشش سے زیادہ ہوجائے تو یہ پانی سے بالکل باہر نکل آئے گا۔

اور اگر زمین کی کشش پانی کے دباؤ سے جو اسے اوپر کو دھکیل رہا ہے زیادہ ہو تو پھر یہ پانی کی تہ میں بیٹھ جائے گی۔ مگر اس وقت تو یہ بالکل بیچوں بیچ کی حالت میں ہے۔

استاد:۔ اس کا کیا مطلب ہے۔

شاگرد:۔ یعنی پانی کی قوت زمین کی کشش کے برابر ہے۔

استاد:۔ اچھا کل ہم یہ معلوم کریں گے کہ پانی کتنے زور یا دباؤ سے کسی جسم کو اوپر دھکیلتا ہے۔

سہ روزہ تعلیمی مذاکرات

فضل احمد

فروری کے دوسرے ہفتے کے آغاز میں سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں جو سہ روزہ تعلیمی سرگرمی جاری رہی۔ وہ مغربی پاکستان میں اپنی نوعیت کی پہلی تعلیمی سرگرمی تھی، ان تین دنوں میں صوبہ بھر کے ذمہ دار تعلیمی افسر، استادوں کے نمائندے اور تعلیم میں دل چسپی رکھنے والے دوسرے صاحب الرائے لوگ اس غرض سے جمع ہوئے کہ مروجہ نصاب تعلیم کا جائزہ لیں اور اس کی اصلاح و ترمیم کے ذرائع پر غور کریں۔ ہماری تعلیمی زندگی میں یہ پہلا موقع ہے کہ سرکاری اور غیر سرکاری نمائندوں نے یوں ایک ساتھ بیٹھ کر نصاب کے مسائل پر اپنے ذہنوں کو صاف کیا ہو۔ نصاب میں ردو بدل پہلے بھی ہوتا رہا ہے، لیکن اس کی صورت ہمیشہ یہی ہوتی تھی کہ وزارت تعلیم نے اصلاح نصاب کے لیے ایک کمیٹی مقرر کر دی جس نے اپنی بہترین دانست کے مطابق کچھ تجویزیں پیش کر دیں اور ان کی روشنی میں نصاب میں ردو بدل کر دیا گیا۔

نصاب سازی کا یہ پرانا تصور جدید سائنسی زمانے کی ضرورتوں کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ وہ زمانہ بہت پیچھے رہ گیا جب معاشرتی زندگی کی ہیئت صدیوں تک کم و بیش ایک سی رہتی تھی۔ اس قسم کے جامد معاشروں میں یہ ممکن تھا کہ سوچ بچار کے بعد ایک دفعہ نصاب تیار کر لیا جائے اور پشت بہ پشت اس پر عمل ہوتا رہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی برق رفتار ترقی نے اس چیز کا خاتمہ کر دیا ہے۔ مثلاً علم طب نے پچھلی چند دہائیوں میں اتنی پیش رفت کی ہے جتنی پچھلے تین سو سال میں بھی نہ ہوئی تھی۔ معاشرتی زندگی کی اس ہوش ربا ترقی کے زمانے میں یہ کیونکر ممکن ہے کہ کوئی نصاب تعلیم، خواہ وہ کتنی ہی احتیاط اور پیش بینی کے ساتھ تیار کیوں نہ کیا گیا ہو، بہت دیر تک زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرے؟ مسلسل تغیر پذیر معاشرتی حالات نے یہ بات ناگزیر

بنا دی ہے کہ نصاب پر بھی مسلسل نظرِ ثانی ہوتی رہے۔

عہدِ حاضر کی دوسری قوت جس نے نصاب سازی کے عمل پر گہرا اثر کیا ہے وہ جمہوری جذبے کی روز افزوں تقویت ہے۔ پہلے یہ عام خیال تھا کہ چوٹی پر کام کرنے والے لوگ حکمت و بصیرت کے سرچشمے ہیں۔ اس لیے ان کے نیچے کام کرنے والوں کا فرض ہے کہ آنکھیں بند کیے ان کے بنائے نسخوں پر عمل کرتے جائیں۔ اس عقیدہ کی آبیاری دراصل استعماری قوتوں نے کی تھی مگر اس صدی کی دو عالمی جنگوں نے عوام کو ان کی صدیوں کی نیند سے جھنجوڑ کر جگا دیا ہے۔ انہیں یک دم یہ احساس ہوا کہ سوجھ بوجھ کے معاملے میں خواص ان پر کسی طرح برتری نہیں رکھتے۔ ان کا یہ پیدائشی حق ہے کہ ان تمام معاملات کے طے کرنے میں حصہ لیں جو ان کی زندگی پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ اس ابھرتی ہوئی جمہوری روح نے نصاب سازی کے تصور میں دوسری بنیادی تبدیلی کی ہے اور وہ یہ کہ نہ صرف نصاب کی لگاتار جانچ ہوتی رہنی چاہیے بلکہ جانچ کے اس کام میں ان اساتذہ کو بھی شریک ہونا چاہیے جن کے ذمے ان کو عملی جامہ پہنانے کا کام ہے۔

نصاب سازی کا یہ تصور نسبتاً نیا ہے۔ ٹریننگ کالج میں جو سہ روزہ تعلیمی مذاکرہ جاری رہا وہ اس ملک میں جدید نصاب سازی کی پہلی عملی مثال تھی، جیسا پروفیسر ایم۔ اے مخدومی نے افتتاحی اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا۔ جدید نصاب سازی لگاتار تحقیقی کام کا مطالبہ کرتی ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں یہ کام مستقل اداروں کے ہاتھ میں ہے۔ نصابِ تعلیم کو سائنسی بنیادوں پر تعمیر کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس ملک میں بھی ایک ایسا مستقل ادارہ قائم ہو جو تحقیق و تجربہ کا کام مسلسل جاری رکھے۔

مختصر روئداد | اس اہم تعلیمی اجتماع کے پہلے اجلاس میں صرف چند خطبات پڑھے گئے۔ اس شام وزیرِ تعلیم نے تعلیمی نمائش کا افتتاح کیا۔ دوسرا دن ماتحت کمیٹیوں کے کام کے لیے مخصوص تھا۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنے صبح اور بعد دوپہر کے اجلاسوں میں نصاب کے مختلف پہلوؤں

بحث و تمحیص کی۔ نصاب کے یہ پہلو مندرجہ ذیل تھے (۱) ابتدائی جماعتوں کا نصاب (۲) مڈل جماعتوں کا نصاب (۳) ہائی جماعتوں کا نصاب (۴) نصاب میں انگریزی کا مقام (۵) نصاب میں ریاضی کا مقام (۶) نصاب میں اردو کا مقام (۷) نصاب میں معاشرتی علوم کا مقام (۸) نصاب میں سائنس کا مقام (۹) نصاب میں ٹیکنیکل تعلیم کا مقام وغیرہ

ان تمام ماتحت کمیٹیوں نے دوسرے دن کی شام تک اپنی سفارشیں مرتب کر لیں تیسرے روز یہ تمام تجویزیں اور سفارشیں عام اجلاس میں پیش ہوئیں ان پر گرما گرم بحثیں ہوئیں اور اس طرح یہ سہ روزہ تعلیمی مذاکرات کامیابی کے ساتھ ختم ہوئے۔

ثانوی نصاب: ان تعلیمی مذاکروں میں ثانوی نصاب سب سے زیادہ مرکز توجہ بنا رہا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ جہاں ابتدائی اور مڈل جماعتوں کے نصابوں میں چند مرتبہ ترمیم و اصلاح ہو چکی ہے ثانوی نصاب کو ابھی تک چھوا نہیں گیا، دوسری وجہ سیکنڈری بورڈ آف ایجوکیشن کی وہ مجوزہ اصلاحات تھیں جو ثانوی نصاب کے متعلق صرف چند روز پہلے اخباروں میں چھپی تھیں۔ ثانوی نصاب پر غور کرنے والی ماتحت کمیٹی کی طرف سے حسب ذیل سفارشیں عام اجلاس میں پیش کی گئیں۔

(۱) اسلامیات کو ایک لازمی امتحانی مضمون قرار دیا جائے۔ میٹرک کے امتحان میں شامل ہونے والے امیدواروں کے لیے صرف اسلامیات کا مضمون لینا ہی ضروری نہ ہو بلکہ اس میں کامیاب ہونا بھی لازمی ہو۔

(۲) اردو ہر امیدوار کے لیے ایک لازمی مضمون ہو۔

(۳) انگریزی کو ایک اختیاری مضمون قرار دیا جائے تاہم جو طلبہ انگریزی کے بغیر میٹرک کا امتحان پاس کریں انہیں اس بات کی اجازت ہو کہ اگر بعد میں چاہیں تو اکیلی انگریزی میں بھی امتحان دے لیں۔ ایسے طلبہ کے لیے مدرسوں میں ایک سالہ نصاب انگریزی کا انتظام ہونا چاہیے۔

۴ ۔ ثانوی درجے پر ریاضی صرف الجبرے اور جیومیٹری پر مشتمل ہو اور یہ مضمون بھی اختیاری ہو
۵ ۔ تاریخ اور جغرافیے کو دو الگ الگ مضامین قرار دیا جائے ۔ تاریخ کے نصاب میں سے تاریخ انگلستان کو نکال کر اس کی جگہ مختصر تاریخ عالم کے لیے جگہ پیدا کی جائے۔ اس عالمی تاریخ میں تاریخ انگلستان اور تاریخ اسلام کو ان ہر دو کے حسب حال جگہ دی جائے

۶) میٹرک کا امتحان محض مدرسہ کی پڑھائی کا آخری امتحان ہو۔ اس کا سرٹیفکیٹ یونیورسٹی داخلے کا پروانہ ہو۔ یونیورسٹی اپنے داخلے کے لیے الگ شرائط مقرر کرے ۔

(۷) مڈل درجے کے بعد طلبہ کو ان کی دلچسپیوں اور استعدادوں کے مطابق حسب ذیل تین گروہوں میں بانٹا جائے

(ا) علمی قسم کے نصاب کے لیے موزوں طلبہ (ب) سائنسی مضامین کے لیے موزوں طلبہ (ج) ٹیکنیکل اور پیشہ ورانہ نصاب کے لیے موزوں طلبہ ۔ اگرچہ چاہیے یہ کہ یہ سہ گانہ تقسیم نفسیاتی شہادت، اور پیشہ ورانہ راہ نمائی کی بنا پر عمل میں آئے۔ لیکن سردست یہ معاملہ والدین اور طلبہ کی پسند پر چھوڑنا پڑے گا۔ تاہم مدرسوں کو چاہیے کہ طلبا از جلد راہ نمائی کی خدمات کا اہتمام کریں

(۸) نصاب کے مضامین کو چار گروہوں میں بانٹ دیا جائے ۔ ان میں سے پہلا گروہ ان مضامین کا ہو جن کا لینا ہر امیدوار کے لیے لازمی ہو۔ دوسرا گروہ سائنسی مضامین کا ہو تیسرا ٹیکنیکل اور پیشہ ورانہ مضامین کا اور چوتھا علمی مضامین کا۔ ہر امیدوار کو اجازت ہو کہ پہلے گروہ کے لازمی مضامین کے علاوہ باقی تین گروہوں میں سے کسی ایک میں سے اپنی پسند کے مضامین چن لے۔

دلچسپ بحث | کھلے اجلاس میں بحث کا موضوع زیادہ تر یہی سفارشیں تھیں۔ اس بحث و تبصرہ کے زیادہ اہم اور مفید مطلب نکات کا ذکر نیچے کیا جاتا ہے ۔

ریاضی :- ماتحت کمیٹیوں کی رپورٹ پیش ہو جانے کے بعد سب سے پہلے پاکستان کے معروف ریاضی دان خواجہ دل محمد شیخ پر تشریف لائے اور حاضرین سے اپیل کی کہ ریاضی کو بدستور

ایک لازمی مضمون رہنے دیا جائے۔ اس کے جواز میں انہوں نے ذہنی ضبط کے اصول سے سہارا لیا بلکہ یونانی فلسفی افلاطون سے سند پیش کی جس نے اپنی اکادیمی کے دروازے پر جلی حروف سے لکھ دیا تھا "جس کو علم ہندسہ نہیں آتا وہ ہمارے دارالتعلیم میں نہ آئے۔" خواجہ صاحب نے حضرت علامہ اقبال مرحوم کا حوالہ بھی دیا اور کہا، آخری عمر میں حضرت علامہ کو ریاضی کی افادیت کا اتنا شدید احساس ہو گیا تھا کہ ایک روز مجھے فرمانے لگے کیا یہ ممکن ہے کہ میں اب ریاضی سیکھ جاؤں؟ اس کے لیے اندازاً کتنا وقت درکار ہوگا۔

خواجہ صاحب کی تائید پروفیسر فضل عزیز خاں صاحب نے کی۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے نوجوان سہل انگاری کا شکار ہیں۔ ریاضی کا مضمون اس سہل انگاری کے لیے اب تک تازیانہ کا کام کرتا رہا ہے۔ اس کے اختیاری بن جانے کی صورت میں یہ خطرہ بالکل حقیقی ہے، کہ سہل انگاری کا مرض خوفناک طور پر بڑھ جائے گا۔ ہندوستان کے صوبہ یو۔پی کی مثال دیتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ تقسیم ملک سے پہلے اس صوبے میں ریاضی کو اختیاری بنا کر دیکھا گیا تھا۔ چند ہی سال میں ریاضی لینے والے طلبہ کی تعداد برائے نام رہ گئی تھی۔ موجودہ سائنس اور ٹکنالوجی کی جڑیں ریاضی میں بہت گہری گڑی ہوئی ہیں۔ جو ملک صنعت اور ٹکنالوجی میں آگے بڑھنے کا ارادہ رکھتا ہو، اسے ریاضی سے غفلت نہ برتنی چاہیے۔ انہوں نے ایران، عراق اور مشرق اوسط کے دوسرے ملکوں کی مثال بھی پیش کی جنہوں نے ریاضی کو ایک لازمی مضمون قرار دے رکھا ہے۔

ریاضی کے حق میں یہ دلیلیں بظاہر بہت وزنی نظر آتی ہیں لیکن ان کے پیش کرنے والوں نے ریاضی کی ناقابل انکار افادیت کو اس کے لازمی قرار دیے جانے کے حق میں استعمال کرنا چاہا جو منطقی طور پر درست نہیں۔ بے شک سائنس اور ٹکنالوجی کے مطالعہ کے لیے ریاضی ناگزیر ہے۔ لیکن ہر پاکستانی ماہر سائنس یا ماہر ٹکنالوجی نہیں بن سکتا۔ اب تک ریاضی ہمارے ثانوی مدرسے کا لازمی مضمون ہے۔ اگر سائنس اور ٹکنالوجی کے خزانوں کو صرف اس

ایک چابی سے کھولا جا سکتا تو آج ہم صنعت اور ایجادات کے میدان میں امریکہ سے بھی دور آگے نکل گئے ہوتے کیوں کہ امریکہ کے ثانوی نصاب میں ریاضی لازمی مضمون نہیں۔ ریاضی کے لازمی مضمون بن جانے سے اگر ایسی بیدار مغزی پیدا ہو سکتی تو ایران۔ عراق اور شرق اوسط کے دوسرے ملک سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں دنیا کو راستہ دکھانے والے بن گئے ہوتے

یہ دلیل کہ ریاضی کی بدولت لگ لپیٹ کر محنت کرنے کی عادت پیدا ہوتی ہے۔ مدت سے غلط ثابت کی جا چکی ہے۔ مدرسوں کے روایت پرست نصاب کی بنیاد اس مفروضے پر ہوا کرتی تھی کہ نصاب کے مندرجات جس قدر دشوار اور محنت طلب ہوں گے۔ اسی قدر زیادہ ذہنی ضبط پیدا ہوگا جو آگے چل کر زندگی کے ہر کام میں مدد دے گا۔ جدید نفسیات نے اس نظریے کا کھوکھلا پن پوری طرح واضح کر دیا ہے۔ زندگی میں صرف وہ چیز کام دیتی ہے جو سمجھ کر اخذ کی گئی ہو۔ اس کے لیے دلچسپی پہلی شرط ہے۔ جو ذہنی فوائد ریاضی سے مترتب ہوتے ہیں۔ ان سے بہتر فوائد ایسے مضامین کے مطالعہ سے حاصل ہو سکتے ہیں جو طلبہ کے لیے حقیقی دلچسپی کا باعث بن سکیں۔ ریاضی کو لازمی قرار دے کر جو وقت اور محنت اس کی نذر کی جا رہی ہے۔ اس کے صرف سے کئی گنا زیادہ مفید علوم اور مہارتیں اخذ کر سکتے ہیں۔ جو طلبہ اس قسم کے سائنسی، ٹیکنیکل یا پیشہ ورانہ نصاب پڑھنے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ جن کے لیے ریاضی میں دستگاہ ناگزیر ہے۔ ان کے لیے ریاضی کو لازمی قرار دیا جا سکتا ہے لیکن اسے ہر ایک کے لیے لازمی قرار دینا تعلیمی لحاظ سے غلط ہے۔ زندگی میں حساب کتاب کی جس قدر ضرورت پیش آتی ہے۔ اس کے لیے آٹھویں جماعت تک کی ریاضی اچھی طرح کام دے سکتی ہے ہائی جماعتوں کا الجبرا اور جیومیٹری کالج کے بعض سائنسی اور ٹیکنیکل نصابوں کی تیاری کا درجہ رکھتے ہیں اور انہیں صرف ان طلبہ کے لیے لازمی قرار دینا چاہیے جو ان اعلیٰ نصابوں میں جانے کا ارادہ رکھتے ہوں۔

انگریزی :- موجودہ ثانوی نصاب کا [illegible] مضمون انگریزی ہے۔ اس وقت میٹرک کے امیدواروں کی تیاری میں انگریزی کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ پروفیسر ایم اے [illegible] نے

پنے خطاب میں بہت بجا کہا تھا کہ اس وقت حالت یہ ہے کہ اساتذہ اور والدین ساری توجہ انگریزی اور ریاضی پر دیتے ہیں۔ مدرسے میں زائد وقت دیا جائے گا تو انگریزی اور ریاضی کو والدین بچوں کو ٹیوشن رکھ کر دیں گے تو انگریزی اور ریاضی کی۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ دوسرے مضامین توجہ سے محروم رہتے ہیں اور بے چارے طلبہ میں وہ وسیع ذہنی افق اور فہم کی وہ گہرائی پیدا نہیں ہوتی جو دوسرے ملکوں کی ثانوی تعلیم کا خاصہ ہے۔

انگریزی کی ہمہ گیر مانگ کی بڑی وجہ اس کا ملک کی سرکاری زبان ہونا ہے۔ بہت سے طلبہ میٹرک پاس کر کے چھوٹی موٹی سرکاری یا غیر سرکاری ملازمت اختیار کر لیتے ہیں۔ سرکاری زبان انگریزی ہونے کے باعث کاروبار کی عام زبان بھی انگریزی ہو چکی ہے۔ یہ عملی افادیت والدین کو اس بات پر ابھارتی ہے کہ ان کے بچے انگریزی ضرور پڑھیں۔ لیکن یہ صورت حال ہمیشہ باقی رہنے والی نہیں۔ ملک کے دستور میں اردو اور بنگالی زبانوں کو قومی زبانوں کا درجہ مل چکا ہے، کچھ عرصہ تک وہ عملی طور پر ملک کی سرکاری زبانیں ہوں گی۔ جوں جوں یہ منزل قریب آتی جائے گی انگریزی کی موجودہ مانگ گھٹتی جائے گی۔

کھلے اجلاس میں انگریزی کے لازمی یا اختیاری مضمون بننے کے متعلق کچھ نہیں کہا گیا۔ البتہ ابتدائی، مڈل اور ہائی جماعتوں کی ماتحت کمیٹیوں نے ایک مشترکہ اجلاس میں یہ طے کیا تھا کہ انگریزی چھٹی جماعت سے لے کر آٹھویں جماعت تک ہر ایک کے لیے لازمی ہو۔ تاکہ ہر طالب علم معمولی انگریزی نوشت وخواند سے واقف ہو جائے۔ ثانوی درجے پر انگریزی کو ایک اختیاری بنا دینا چاہیے تاکہ ایسے طلبہ اور طالبات جو اپنے آپ کو اس مشکل غیر ملکی زبان سیکھنے کے بالکل نااہل پاتے ہیں اور صرف اس کی وجہ سے لگاتار سالوں تک فیل ہوتے رہتے ہیں وہ بھی واجبی محنت اور توجہ سے میٹرک پاس کر سکیں۔ ایسے طلبہ اور طالبات جو میٹرک کے بعد زندگی کے ایسے مشاغل اختیار کرنے والے ہیں جہاں انگریزی کی چنداں ضرورت نہیں، انہیں محض انگریزی میں کمزور ہونے کی وجہ سے میٹرک کی سند سے محروم رکھنا مناسب نہیں۔

انگریزی کے لازمی رہنے کے حق میں جو دلیل بہت شد و مد سے دی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ زبان اعلیٰ علوم اور بالخصوص جدید سائنس اور ٹکنالوجی کے خزانوں کی چابی ہے اور اسکی بدولت بین الاقوامی مراسم پیدا کیے جا سکتے ہیں، یہ دونوں فوائد بے شک اہم ہیں۔ لیکن یہاں پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا میٹرک کے ہر طالب علم کو یہ دونوں ضرورتیں پیش آتی ہیں؟ اس سوال کا جواب صریح نفی میں ہے۔ میٹرک پاس کرنے والوں میں سے آدھے بھی ایسے نہیں ہوتے جنہیں سائنس اور ٹکنالوجی کے خزانوں کو کھولنے کے لیے انگریزی کی چابی درکار ہو یا جنہیں بین الاقوامی مراسم پیدا کرنے پڑیں۔ جن لوگوں کو یہ ضرورتیں پیش آنے والی ہیں ان کے لیے انگریزی کا پڑھنا لازمی کیجیے۔ باقیوں کے لیے بلا وجہ تعلیم کو ایک کٹھن بوجھ نہ بنائیے۔

جو بزرگوار انگریزی کے حق میں بہت جوش و خروش کا مظاہرہ کرتے ہیں ان میں سے اکثر یہ نہیں سوچتے کہ وہ خود بھی انگریزی کو بذاتِ خود مقصود نہیں سمجھتے۔ بلکہ اسے ایک بلند تر مقصد کے حصول کا ذریعہ بتاتے ہیں وہ بلند تر ۔۔ ہے جدید سائنس اور ٹکنالوجی۔ مگر ہمارے میٹرک کے طلبہ کی جو بھاری اکثریت اپنا بیشتر وقت اور توانائی انگریزی ہی کی نذر کر دیتی ہے۔ وہ سائنس اور ٹکنالوجی کی مبادیات سے بھی باخبر نہیں ہونے پاتی۔ ہم ذریعہ کو اصل مقصود سمجھ کر اصل مطلوب سے اس قدر بیگانہ ہو چکے ہیں کہ ترقی یافتہ ملکوں میں سائنس کے بنیادی حقائق کا جو علم وہاں پرائمری مدرسے میں بہم پہونچا دیا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں ثانوی مدرسہ بھی اس سے محروم ہے۔ سائنس کی بنیادی معلومات کے لیے انگریزی چنداں ناگزیر نہیں۔ یہ خدمت اردو سے بھی لی جا سکتی ہے۔ لہٰذا انگریزی سے کہیں زیادہ اہم بنیادی سائنسی حقائق کا علم ہے جس کے بغیر جدید سائنسی تہذیب میں انسان کو ان پڑھ سمجھنا چاہیے۔ جو طلبہ سائنس اور ٹکنالوجی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں ان کے لیے انگریزی لازمی ہو مگر جو ایسا ارادہ نہ رکھتے ہوں ان پر خواہ مخواہ انگریزی کو ٹھونسنے سے کہیں زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ انہیں جدید سائنسی علوم کی

مبادیات کی تعلیم دی جائے۔

ہم سب طبعاً قدامت پسند واقع ہوئے ہیں۔ جو چیز کسی وجہ سے پشت ہا پشت سے چلی آ رہی ہو، اس کا وجود ہی قدرتی اور ناگزیر نظر آنے لگتا ہے۔ ہم اس کے متعلق معقولیت کی بجائے جذبات سے زیادہ کام لینے لگتے ہیں۔ کم و بیش یہی حال انگریزی کا ہے۔ ہم میں سے ہر ایک نے زندگی کا بہترین حصہ انگریزی کی نذر کیا ہے۔ ہمیں اپنے اندر جو علمی اور ذہنی کمال نظر آتا ہے۔ ہم اسے نادانستہ انگریزی ہی کی پیداوار سمجھتے ہیں اور ہمارے لیے یہ باور کرنا دشوار ہے کہ ہمارا کوئی ہم وطن انگریزی سے بڑی حد تک بے نیاز ہو کر بھی ہماری علمی سطح کو پہونچ سکتا ہے۔ اس عجیب و غریب نفسیاتی کوتاہی کی ایک بے حد دلچسپ مثال ثانوی تعلیم کی کمیٹی کے اجلاس میں دیکھنے میں آئی جب ایک بزرگوار نے حاضرین کو یہ کہہ کر محو حیرت کر دیا کہ مخصوص تاریخی اور جغرافیائی حالات کی بنا پر پاکستانی بچوں کو قدرت نے غیر معمولی لسانی صلاحیتیں بخشی ہیں۔ جہاں دوسری قوموں کے بچے بمشکل ایک آدھ غیر ملکی زبان سیکھ سکتے ہیں وہاں ہمارے بچے بڑی آسانی سے تین چار زبانیں سیکھ لیتے ہیں۔ اس قدرتی عطیہ سے فائدہ اٹھا کر ہمیں چاہیے کہ ہر پاکستانی بچے سے کم سے کم ایک غیر ملکی زبان (انگریزی) پر قدرت حاصل کرنے کا مطالبہ کریں۔ اس پر حاضرین نے ان کی خدمت میں گذارش کی کہ وہ اس لحاظ سے بڑے خوش نصیب ہیں کہ انہیں زندگی میں غیر معمولی لسانی استعداد رکھنے والے طلبہ سے سابقہ پڑتا رہا۔ ورنہ ایک عام پاکستانی استاد کا تجربہ اور مشاہدہ اس کے بالکل برعکس ہے۔

اس میں کلام نہیں کہ انگریزی ایک روز افزوں مقبولیت پانے والی جدید غیر ملکی زبان ہے۔ ہر مدرسے کو اس کے پڑھانے کا بندوبست کرنا چاہیے۔ لیکن اسے لازمی قرار دے دینا کئی صورتوں میں ناروا تحکم کے مترادف ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً طالبات کی غالب اکثریت جنہیں عمر بھر گھروں میں بیویوں اور ماؤں کے فرائض انجام دینے ہیں۔ انگریزی میں بہت زیادہ مہارت حاصل کیے بغیر بھی اپنے فرائض بے حد خوش اسلوبی سے انجام دے سکتی

ان کے لیے یہ شرط لگا دینا کہ وہ انگریزی میں ایک مقررہ استعداد پیدا کیے بغیر میٹرک کا امتحان پاس نہیں کر سکتیں، ایک زیادتی ہے۔ ہندوستان کے بعض صوبوں میں انگریزی لڑکیوں کے لیے ایک اختیاری مضمون کا درجہ رکھتی ہے۔ لڑکوں کو اگر سردست یہ رعایت دینے کا ارادہ نہ ہو تو بھی اتنا ضرور ہو جانا چاہیے کہ جو امیدوار انگریزی میں ناکام رہنے کی وجہ سے امتحان میں فیل ہو رہا ہو اسے اجازت ہو کہ اگلے امتحان میں صرف انگریزی کا امتحان دے سکے۔

اردو | ثانوی نصاب کی کمیٹی نے سفارش کی تھی کہ قومی زبان کی حیثیت سے اردو کو ہر امیدوار کے لیے لازمی مضمون قرار دیا جائے۔ اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر تاج محمد نے فرمایا کہ بے شک مغربی پاکستان کے مختلف حصوں میں ایک اہم قدر مشترک کے طور پر اردو کو نصاب میں ایک ممتاز جگہ ملنی چاہیے۔ مگر اس کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ دہلی اور لکھنؤ کے ٹکسالی محاورے کی سند پر اصرار کرنے کی بجائے اردو کو اپنے نئے ماحول میں پھلنے پھولنے دیا جائے اور مغربی پاکستان کے مختلف حصوں کے لسانی اثرات کو اس میں جگہ حاصل کرنے کی اجازت دی جائے۔ اپنے نقطۂ نگاہ کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ مغربی پاکستان میں کئی ایک علاقائی بولیاں موجود ہیں۔ جن میں سے ہر ایک کا اپنا مخصوص لب و لہجہ ہے۔ مثلاً پنجابی، سندھی اور پشتو اپنا الگ الگ لب و لہجہ رکھتی ہیں۔ اردو کا لب و لہجہ ان تینوں سے مختلف ہے۔ ان مقامی بولیوں کا لب و لہجہ قدرتی طور پر اپنے مدرسوں میں پڑھائی جانے والی قومی زبان کے لب و لہجہ کو متاثر کرے گا۔ ہمیں اس مقامی رنگ کو بخوشی قبول کرنا ہوگا۔ اس مقامی لسانی رنگ پر ناک بھوں چڑھانے کا مطلب اردو کی ہمہ گیری کے لیے رکاوٹیں پیدا کرنا ہوگا۔

اس موقع پر اجلاس کے صدر ڈاکٹر جہاں گیر خاں نے یہ کہہ کر ایک قہقہہ پیدا کر دیا کہ اگر مقامی لسانی رنگ کو اردو میں داخل ہونے کی اجازت ہے تو اسے انگریزی سے کیوں دور

رکھا جائے ۔ کیا مناسب نہیں ہوگا کہ ہر لسانی علاقے کی انگریزی بھی اپنا الگ رنگ رکھتی ہو
اس پر مقرر نے جواب دیا کہ انگریزی پہلے ہی یہ مقامی لسانی رنگ قبول کر چکی ہے ۔

دینی تعلیم لازمی دینی تعلیم بہت لمبی چوڑی بحث کا موضوع بنی رہی ۔ ماتحت کمیٹی کے اجلاس میں ہی گھوڑا گلی کالج کے سابق پرنسپل نے اس بات پر زور دیا تھا کہ دینی تعلیم کی بجائے مدرسے میں دینی اور اخلاقی ماحول پیدا کرنا زیادہ فائدہ بخش ہے ۔ اگر مدرسے کو ایسا صدر معلم میسر آ جائے جو دینی روح کا حامل ہو اور اسلامی اخلاق میں زندہ یقین رکھنے والا ہو تو یہ تدریس اسلامیات کی مؤثر ترین صورت ہوگی ۔ اس کے برعکس اگر اسلامیات کی تدریس کو امتحانی مضمون قرار دے کر لازمی کر دیا جائے اور مدرسے میں اسلامی اخلاق کی عملی کارفرمائی نظر نہ آئے تو ایسی دینی تعلیم کوئی مفید مطلب نتائج پیدا نہ کرے گی ۔

مقرر نے اپنے نقطۂ نگاہ کی مزید وضاحت میں کہا کہ برطانوی پبلک اسکولوں میں اعلیٰ پائے کی تشکیل کردار کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ ان کے صدر معلم پادری لوگ ہوا کرتے تھے جو ایک مبلغ کے جذبے کے ساتھ اپنے دین کی جیتی جاگتی تصویر طلبہ کے سامنے پیش کرتے تھے ۔ اس دلیل کے جواب میں کہا گیا کہ بے شک یہ ایک مثالی بندوبست ہوگا ، اگر اسلامیات کی تعلیم کے ساتھ مدرسے کا صدر معلم اور دوسرے استاد سب کے سب اسلامی اخلاق کے پیکر ہوں ۔ مگر افسوس اس مثالی بندوبست کی مستقبل قریب میں کوئی صورت نظر نہیں آتی ۔ اس بات کا یقین بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ہر مدرسے کو کم سے کم ایسا صدر معلم ہی نصیب ہو جائے جو سچی اسلامی روح کا حامل ہو ۔ اس کی وجہ بالکل عیاں ہے ۔ ہمارے یہاں دینی تعلیم اور تبلیغی خدمت کے ساتھ شغف رکھنے والے لوگ مدرسوں کی صدر معلمی کی اہلیت نہیں رکھتے اور جو لوگ یہ اہلیت رکھتے ہیں وہ عموماً دینی تعلیم سے کنارہ کش رہتے ہیں انگلستان میں اس قسم کے صدر معلموں کی فراوانی کے باوجود یہ ضرورت پیش آئی کہ دینی تعلیم کو مدرسوں میں لازمی قرار دیا جائے ۔ ایسی صورت میں پاکستان میں یہ کیوں کر فرض کر لیا جائے کہ دینی

تعلیم کو لازمی امتحانی مضمون قرار دیے بغیر ہی یہاں کے مدرسوں میں اسلامی اخلاق اور اسلامی اقدار کی حکمرانی نظر آنے لگے گی۔

کیفے اجلاس میں پروفیسر تاج محمد خیال نے بھی یہی رائے ظاہر کی کہ دین کتابی مضمون کی طرح پڑھانے سے نہیں بلکہ عملی مثال سے سکھایا جاتا ہے۔ دنیا میں اسلام کی اشاعت کا سبب قرآن نہیں بلکہ صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جن کے متعلق حضرت عائشہ صدیقہ رضہ نے فرمایا تھا کہ "کان خلقہ القرآن"

حاضرین کی اکثریت نے اس استدلال سے اختلاف کیا اور واضح طور پر مطالبہ کیا کہ اسلامیات ایک لازمی امتحانی مضمون ہونا چاہیے۔

اسلامیات کے لازمی مضمون قرار دیے جانے سے بعض لوگ دیانت داری کے ساتھ اختلاف رکھتے ہیں۔ لیکن ان میں سے بہتوں نے کبھی اپنے موقف پر تنقیدی نگاہ نہیں ڈالی۔ ہم نے پاکستان کا مطالبہ ہی اسلام کے نام پر کیا تھا، اسلام ہماری ثقافت کا مرکزی نقطہ ہے اگر ہم نصاب تعلیم سے اس مرکزی نقطے کو خارج کر دیتے ہیں تو پھر اور کونسی ثقافت کی بقا اور نشو و نما کا اہتمام کرنا باقی رہ جائے گا؟ پاکستان کے بانی سے لے کر تمام چھوٹے بڑے پاکستانی رہنما بارہا یہ دہرا چکے ہیں کہ ہم نے اپنے لیے ایک الگ ریاست اس لیے حاصل کی ہے کہ ہماری مخصوص ثقافت آزادی سے پنپ سکے۔ ظاہر ہے کہ ثقافت کا تحفظ کرنے والی اور اس کو دوام بخشنے والی چیز صرف تعلیم ہے۔ اگر ہم اسلامی تعلیمات کو اپنی تعلیم کا مرکزی نقطہ نہیں بناتے تو آخر ہماری مخصوص ثقافت کا تحفظ اور کس طرح ہوگا؟ کیا اشتراکیوں کی طرح ہم بھی یہ یقین کر لے جائیں کہ ہر ثقافت کی اصل روح اس کا دین نہیں بلکہ اس کا آرٹ (مصوری، موسیقی رقص وغیرہ) ہوا کرتا ہے؟

اگر اسلامی ثقافت کچھ ایسی چیزوں سے عبارت تھی جو اسلام کی تعلیمات سے الگ تھیں تو یہ ثقافت متحدہ ہندوستان میں بھی نشو و نما پا سکتی تھی۔ بلکہ انگریزی راج بھی اس کی

راستے میں چنداں حائل نہ تھا۔ اگر آج ہم اپنے سرکاری مدرسوں میں اسلامیات کی تعلیم کو لازمی قرار نہیں دے سکتے تھے بھارت کے بے بس مسلمانوں اور پاکستان کے آزاد مسلمانوں میں فرق ہی کس بات کا رہ جاتا ہے۔

اس بارے میں بعض لوگ یہ عذر بھی پیش کرتے ہیں کہ دینی تعلیم دینا والدین کا کام ہے۔ یہ لوگ اتنا نہیں سوچتے کہ جدید ریاست بچے کی مکمل تعلیم کی ذمہ دار ہے، اس کی جزوی تعلیم کی ذمہ دار نہیں۔ اگر آج والدین پر یہ ذمہ داری ڈالی جا سکتی ہے کہ وہ بچوں کی دینی تعلیم کا انتظام خود کریں تو کل ان سے یہ مطالبہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ وہ گھر پر ٹیوشن رکھ کر اپنے بچوں کی تعلیم کا بندوبست کریں۔ اگر دینی تعلیم والدین ہی کے ذمہ تھی تو اس معاملے میں انگریزی عہد موجودہ آزاد زندگی سے کیا برا تھا؟ انگریزوں نے بھی ہمیں اس بات کی اجازت دے رکھی تھی کہ اپنے گھروں یا مسجدوں میں۔ بلکہ اسلامیہ اسکولوں میں دینی تعلیم کا خاطر خواہ بندوبست کر لیں۔

اسلامیات کے لازمی قرار دینے کے ضمن میں سب سے قوی اعتراض یہ ہے کہ مختلف فرقوں کا باہمی اختلاف کوئی متفق علیہ نصاب تیار نہ ہونے دے گا، بے شک مختلف فرقوں کے اعتقادات کا اختلاف اس راستے کی سب سے بڑی دشواری ہے۔ لیکن کوئی ایسی دشواری نہیں جس پر قابو نہ پایا جا سکے۔ مسیحی فرقوں کے باہمی اختلافات مسلمانوں سے کہیں زیادہ شدید ہیں۔ مگر ان کے باوجود انگلستان میں دینی تعلیم لازمی ہے اور اس کے متفق علیہ نصاب تیار کیے گئے ہیں۔ عقائد کے فروعی اختلافات کو چھوڑ کر بھی اسلام میں بہت کچھ باقی رہ جاتا ہے۔ مثلاً قرآن حکیم کے مطالب۔ اس کے اوامر و نواہی، اسلامی تاریخ اسلامی اخلاق۔ اسلامی عبادات کا فلسفہ۔ دوسرے مذاہب کے ساتھ اسلام کا موازنہ وغیرہ یہ ایسے موضوعات ہیں جن کے بارے میں کسی مسلمان فرقے کو دوسرے فرقوں سے کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا۔ اگر اس امر پر بھی کسی کو اعتراض ہو تو ایسے شخص کو تاریخ کے پڑھائے جانے پر بھی اعتراض ہونا چاہیے کیونکہ تاریخ میں بھی لامحالہ ان شخصیتوں سے بحث ہوگی جن کے بارے میں

اختلاف رائے موجود ہے ۔

بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن نے اپنے مجوزہ نصاب میں دینی تعلیم کو ایک بے حد ناقابل رشک جگہ دی ہے۔ اسے لازمی مضمون تو قرار دیا گیا ہے لیکن یہ امتحانی مضمون نہیں ہوگا۔ اس کا یہ مطلب ہوگا کہ یہ مضمون دوسرے مضامین کا ہم پلہ نہیں ہوگا۔ اس طرح اس مضمون کی جو اہانت ہوتی ہے، اس سے برطانوی ماہرین تعلیم بخوبی آگاہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے نہ صرف دینی تعلیم کو لازمی قرار دیا۔ بلکہ اسے مدرسے کے دوسرے مضامین کے بالکل ہم پلہ بنایا۔ دینی تعلیم کو نصاب میں ایک معقول جگہ دینے کی اور کوئی راہ نہیں۔ راقم کو اپنا اسلامیہ کالج کی طالب علمی کا زمانہ یاد ہے۔ دینیات کی تعلیم کالج کی طرف لازمی تھی مگر یونی ورسٹی میں یہ امتحانی مضمون نہ تھا۔ کالج نے اس کی تدریس کا خاصہ انتظام کیا ہوا تھا۔ مولانا محمد عمر مرحوم جو اپنے علم اور تقویٰ کے لیے ممتاز تھے اس کی تدریس پر مامور تھے۔ کالج کے امتحانوں میں جو طلبہ دینیات میں فیل ہوتے تھے انہیں جرمانہ بھی ہوتا تھا۔ ہر اتوار کو کالج کے ہال میں دینیات پر تقریریں بھی ہوتی تھیں۔ مگر ان ساری باتوں کے باوجود جو ادھم دینیات کی جماعت میں مچتا تھا وہ شاید ہی کسی اور جماعت میں مچتا ہو۔ مولانا محمد عمر مرحوم تو پرانی وضع کے بزرگ تھے۔ بعد میں دینیات کی تدریس ایک جدید وضع کے استاد کے حوالے کر دی گئی جو علی گڑھ کے ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی تھے۔ مگر دینیات کی جماعت میں ہنگامہ بازی بدستور جاری رہی۔ اگر بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن کی تجویز کے مطابق اسلامیات کو لازمی مگر غیر امتحانی مضمون قرار دیا گیا تو اس کا نتیجہ اس اہم ترین مضمون کے ساتھ استہزا کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔ اگر اسلامیات کو اس کا جائز مقام نہیں دیا جا سکتا تو کم از کم اس کے ساتھ تمسخر نہ ہونا چاہیے۔ اگر اسے لازمی امتحانی مضمون نہیں بنایا جا سکتا تو اسے سرے سے نصاب میں لانا ہی نہ چاہیے۔ تاکہ کم از کم اس کی اہانت تو نہ ہو۔

جو اصحاب اسلامیات کو ایک غیر اہم مضمون خیال کرتے ہیں وہ بنیادی اقدار کے فہم کے فقدان کا افسوس ناک مظاہرہ کرتے ہیں۔ لاہور کے ابتدائی مدرسوں میں ایک خاصی تعداد

غیر ملکی مدرسوں کی ہے۔ ان مدرسوں میں اچھے کھاتے پیتے مسلمان گھرانوں کے بچے جاتے ہیں اور یہاں مسیحی دین کی تعلیم نصاب کا ایک لازمی جزو ہے۔ اسی طرح مشن اسکولوں اور مشن کالجوں میں بھی مسلمان طلبہ کو مسیحی دین کی تعلیم حاصل کرنا پڑتی ہے۔ حیرت ہے کہ جن لوگوں کو اس بات پر کبھی کچھ اعتراض نہیں ہوا۔ وہ اسلامیات کے لازمی بنائے جانے کو پسند نہیں کرتے۔ یا اسے ممکن العمل خیال نہیں کرتے۔

تعلیمی نقطۂ نگاہ سے اسلامیات کو ہمارے نصاب کا مرکزی نقطہ ہونا چاہیے۔ دنیا میں ہمیشہ نظریاتِ حیات کے درمیان جنگ جاری رہی ہے اور آج یہ جنگ بے حد شدید صورت اختیار کر چکی ہے سائنس اور ٹکنالوجی کا مہیا کردہ سازو سامان ان نظریوں کی خدمت کے لیے ہی وقف کیا جا رہا ہے اسلام اپنا ایک جداگانہ نظریہ حیات رکھتا ہے۔ ایک ایسا نظریہ جو کسی حریف نظریے کے ساتھ مفاہمت نہیں کر سکتا، یہ مخصوص اسلامی نظریہ حیات ہی ہماری قومی روح ہے۔ اگر انگلستان کو یہ بات ضروری نظر آئی تھی کہ اپنی قومی روح کی بقا کے لیے ۱۹۴۴ء کے تعلیمی قانون کی رو سے دینی تعلیم کو لازمی قرار دے تو نوزائیدہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے لیے یہ امر بالکل ناگزیر ہے کہ اسلامیات کو لازمی قرار دے کر صحیح قومی شعور کی آبیاری کرے۔

مرکزی علوم یا مشترک تعلیم | نصاب کے مباحث میں ایک عام سوال یہ بھی پیدا ہو رہا ہے کہ کیا مغربی پاکستان کے تمام مدرسوں کے لیے بعض ایسے مضامین نہ ہونے چاہئیں جو ہر ایک کے لیے لازمی ہوں؟ ترقی یافتہ ملکوں میں اب یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ طلبہ خواہ علم کے کسی شعبے میں خصوصی مہارت حاصل کریں انہیں بعض ایسے مضامین ضرور پڑھنے چاہئیں جو متوازن طور پر انفرادی اور اجتماعی زندگی بسر کرنے کے لیے بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی نے خصوصی مہارت کے جس رجحان کو ترقی دی تھی، اس کا ایک نتیجہ یہ نظر آنے لگا تھا کہ بعض خصوصی ماہرین اپنے فن میں یکتا ضرور رہیں، لیکن وہ لیاقت اس ذوقِ سلیم سے بھی محروم ہیں جو انفرادی زندگی کو لطیف اور پرلذت بناتا ہے اور اس معاشرتی شعور سے بھی جو شہری فرائض کو موثر طور پر انجام

دینے کے لیے ضروری ہے۔ مغربی ملکوں میں قومی زبان اور معاشرتی علوم کو مرکزی علوم قرار دیا گیا ہے نہ صرف یہ کہ ان مضامین کا مطالعہ ہر طالب علم کے لیے لازمی ہوتا ہے بلکہ ان مضامین کو گرد و پیش کی عملی زندگی کے ساتھ اس طرح مربوط کیا جاتا ہے کہ موثر انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے بنیادی معلومات اور مہارتیں عملی رنگ میں اخذ کر لی جاتی ہیں ۔

پاکستان ایک نیا ملک ہے۔ ہمیں ایک صحت مند قومی شعور اور سرگرم ملی جذبے کی تعمیر کے لیے ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ یہ کام بڑی حد تک "مرکزی علوم" کی وساطت سے ہی ہوگا۔ اردو قومی زبان کی حیثیت سے مغربی پاکستان کے تمام مدرسوں میں ایک لازمی مضمون کے طور پر پڑھائی جانی چاہیے۔ یہی مقام ملکی تاریخ، جغرافیہ اور شہریت کو ملنا چاہیے۔ ان تینوں مضامین کو باہم ملا کر معاشرتی علوم کا نام دیا جاتا ہے۔ ایک صنعتی طور پر پسماندہ ملک کے لیے سائنس کی بنیادی معلومات بھی بالکل اسی قدر لازمی ہیں۔ اسلامیات کا مضمون ہماری مخصوص ثقافت کا سنگ بنیاد ہے، غرض یہ چار مضامین ہمارے مخصوص حالات میں مرکزی علوم یا مشترکہ تعلیم کا درجہ رکھتے ہیں۔

اساتذہ کا پنشن بل

(برطانوی پارلیمان میں اساتذہ کے وظیفۂ پیرانہ سالی کا مسودہ)

محمد عبدالعزیز

۱۸۹۵ء میں لارڈ ڈیون شائر نے سر گورسٹ کے مسودۂ تعلیم کی پارلیمانی تنسیخ کے بعد اس کی اطلاع سر گورسٹ کو ان الفاظ میں دی تھی "سر گورسٹ تمہارا نامبارک مسودہ رہ گزارِ عدم ہو گیا" آج کم و بیش ساٹھ برس بعد سر ڈیوڈ ایکلز کے پنشن بل کا انجام بھی کچھ ایسا ہی نظر آتا ہے۔ اساتذہ کے وظیفۂ پیرانہ سالی کا مسودہ (TEACHERS, SUPERANNUATION BILL) سر ڈیوڈ ایکلز نے پچھلی ٹوری حکومت میں پیش کیا تھا۔ دسمبر کی اہم وزارتی تنظیم نو میں سر انتھونی ایڈن نے اگرچہ اپنی پچھلی وزارت کا نقشہ ہی بدل دیا لیکن وزارت تعلیم کے لیے کوئی نیا سربراہ چننے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ چنانچہ سر ڈیوڈ ایڈن کی نئی ٹوری کابینہ میں بدستور وزیر تعلیم کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

جب یہ مسودہ پارلیمان میں پیش ہوا تو اختلاف و تنقید کا ایک سیلاب امنڈ آیا۔ این۔یو۔ٹی (NATIONAL UNION OF TEECHARS) کے جنرل سیکرٹری سر رونلڈ گولڈ نے ایک احتجاجی بیان دیا اور پھر یونین کی مجلس انتظامیہ نے مسودہ واپس لے لینے کا مطالبہ کیا۔ مگر اس وقت صاحب مسودہ بھی اتنے سرگرم صلح نظر آتے تھے کہ انہوں نے اساتذہ کے اس مطالبے کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ بلکہ اپنی ایک جوابی تقریر میں یہاں تک کہہ گئے کہ اس احتجاج سے اساتذہ عوامی اعانت سے بھی محروم ہو جائیں گے۔ لیکن ایک عجیب بات ہے کہ ایک قلیل مدت میں وزیر موصوف نے اگر ہتھیار نہیں ڈالے تو عارضی طور پر دست صلح ضرور بڑھا رہا ہے۔ اور تین چار ماہ کی اس کشاکش کے بعد اساتذہ کے اس طوفانی احتجاج کے پیش نظر پنشن بل کو چھ مہینے کے لیے ملتوی کر دیا۔ حکومت کا اساتذہ کے متفقہ مطالبے پر اس طرح جھک جانا ان کی یک جہتی کی سب سے بڑی جیت ہے۔

پنشن بل | موجودہ قوانین کے مطابق اساتذہ کی تنخواہ کا ۵ فی صد ان کی پنشن کے سلسلے میں وضع کیا جاتا

باقی رقم قومی خزانہ اور مقامی تعلیمی حکومتوں کے تعلیمی محصول سے پوری کی جاتی ہے۔ سرڈیوڈ نے اساتذہ کے حصہ امداد کو ۵ فی صد کی بجائے ۶ فی صد کرنے کی تجویز پیش کی۔ یعنی ان کے موجودہ چندے میں ایک فی صد کا اضافہ کر دیا گیا۔ بات بظاہر بڑی معمولی سی ہے۔ لیکن اس مجوزہ قانون سے جو ہنگامے برپا ہوئے، غالباً مسودہ پیش کرتے وقت سرڈیوڈ کو اس کا وہم و گمان بھی نہ ہوگا۔ ورنہ شاید وہ اسے اس وقت پیش نہ کرتے بلکہ سازگار حالات کا انتظار کرتے۔

اساتذہ کا احتجاج سرڈیوڈ ایکلز اور حکومت کے بعض دوسرے بہی خواہوں کی تقریروں نے اساتذہ کے دبے ہوئے جذبات کو اور بھڑکا دیا۔ بعض ٹوری اخباروں نے بھی اساتذہ کے احتجاج کا منہ چڑھایا۔ لیکن یونین نے ہر مذاق کو برداشت کیا۔ ہر چیلنج کا خیر مقدم کیا اور خود ثابت قدم رہی۔ حکومت کی اس رعونت کا اس سے بڑھ کر اور کیا مقابلہ ہو سکتا تھا۔ اس مسودۂ قانون کے پیش ہونے کے بعد، این۔ یو۔ ٹی کی مجلس انتظامیہ کا لندن میں اجلاس ہوا۔ یہ اجلاس اس لحاظ سے خاصی اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں جو قرار دادیں منظور ہوئیں ان کا ملک کی تعلیمی زندگی پر براہ راست اثر پڑا حتیٰ کہ حکومت کو اپنی تعلیمی حکمت عملی پر نظر ثانی کرنی پڑی۔

سیونگز اس اجلاس کی سب سے اہم قرار داد طلبہ کی "سیونگز" کو جمع کرنے کی مخالفت ہے۔ قومی بچت کی تحریک کے ایک ذمہ دار افسر نے "ٹائمز" کے نمائندے کو بتایا کہ اس وقت سارے ملک میں کم و بیش ۲،۰۰۰ اسکول سیونگز گروپ ہیں۔ ان میں شاید ہی کوئی ایسا گروپ ہو جس کا نگراں اور ناظم کوئی مدرس نہ ہو۔ یہ ایک رضاکارانہ کام ہے جس کا مدرس کو کوئی معاوضہ نہیں ملتا۔ اس امتناع کا ملک کی عمومی اقتصادی حالت پر کیا اثر پڑے گا۔ فی الحال اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے کیوں کہ ابھی تک اس کے مکمل اعداد و شمار منظر عام پر نہیں آئے، اس کا حساب سال میں دو مرتبہ ہوتا ہے۔ ایک مارچ کے آخر میں اور ایک ستمبر کے آخر میں۔ پچھلے ستمبر کے اعداد و شمار کے مطابق طلبہ نے ایک سال میں جو رقوم جمع کرائیں وہ ساڑھے لاکھ پونڈ سے اوپر ہیں۔

این۔ یو۔ ٹی کے صدر دفتر نے اپنی ضمنی انجمنوں کو یہ ہدایت دی کہ ممبر اساتذہ ان رقوم کی

کی نگرانی سے دست کش ہو جائیں ۔ یہ ہدایت کرسمس سے کچھ پہلے دی گئی تھی۔ اس لیے اس وقت صورت حال کا صحیح اندازہ نہ تھا۔ حکومت کے ارباب رائے کا خیال یہ تھا کہ یونین اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہو سکے گی۔ بظاہر حالات بھی کچھ اسی قسم کے تھے۔ لیکن اب اس وقت کہ کرسمس کی تعطیلات کے بعد سارے اسکول کھل گئے ہیں یونین کی طاقت کا صحیح اندازہ ہوا۔ حالیہ اطلاعات کے مطابق مشکل سے کوئی ایسا اسکول ہوگا جہاں یونین کی اس ہدایت کو من وعن قبول نہ کیا گیا ہو۔ مانچسٹر، نیوکیسل، ایسٹ رائڈنگ اور دوسرے شہروں میں ابتدائی اور ثانوی مدارس میں حکم امتناع کی پوری پوری تعمیل کی گئی۔ اسکاٹ لینڈ میں اساتذہ نے یک جہتی کے ساتھ یونین کے احکام کے مطابق سیونگز جمع کرنے سے انکار کر دیا۔ لندن میں اس امتناع کے پیش نظر صرف ایک اسکول کے علاوہ جس کی ہیڈ مسٹرس نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے باقی ہر اسکول میں سیونگز کی رقم جمع نہیں کی جا رہی ہیں۔

لیورپول کے گرامر اسکولوں میں اس امتناع کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان اسکولوں کے اساتذہ عام طور پر این۔ یو۔ ٹی۔ کے ممبر نہیں ہیں بلکہ ان کی اپنی علاحدہ جماعت ہے جو نائب مدرسین کی انجمن مشترک کہلاتی ہے۔ اسی طرح مسز ایڈنا رنیز نامزد صدر، این۔ یو۔ ڈبلیو۔ ٹی۔ نے بھی اپنے اسکول کی تمام استانیوں کو بچوں کی سیونگز کو بدستور جمع کرنے کی ہدایت کی۔ اس سلسلے میں جب مسز ایڈنز سے ایک اخباری نمائندہ نے استفسار کیا تو اس کے جواب میں موصوفہ نے یہ کہا۔

> میرے خیال میں امتناع ایک غیر ذمہ دارانہ اقدام ہے۔ اگر آپ خود ہی بچوں کے سامنے شہریت کا ایک اعلیٰ نمونہ پیش نہیں کریں گے تو آپ ان سے کسی حسن کار کی توقع کیوں کر کر سکتے ہیں۔

مزید براں یہ ایک خالص رضاکارانہ کام ہے اور یونین کسی ممبر کو ایک رضاکارانہ کام سے نہیں روک سکتی۔" (ٹائمز ۱۰ جنوری)

لیکن اس قسم کی مثالیں خال خال ملیں گی، ورنہ عمومی طور پر انگلستان، ویلز اور اسکاٹ لینڈ کے

1- Incorporated Association of Asst. Masters.
2- National Union of women Teachers.

ط

اساتذہ حکومت کے اس بل کے خلاف بالکل متحد و متفق ہیں ۲۷ جنوری ۱۹۵۶ء کو سنٹرل ہال ویسٹ منسٹر میں این۔ یو۔ ٹی کے اجلاس میں جو پوسٹر لگائے گئے ان سے اساتذہ کے شدت جذبات کا کچھ اندازہ ہو جاتا ہے مثلاً :۔

1. Teachers demand less scoles more shekels.
2. A rise Sir David not a cut.
3. we will not accept cut in salary.

یہ تو مشتے نمونہ از خروارے ہیں ورنہ بجا نت بجانت کی تحریریں دیکھنے میں آئیں۔

اخبارات اور اجتماعی تحریک دسمبر میں یہ احتجاجی دور زیادہ شدید تھا۔ اساتذہ کے بیانات میں تلخ بلکہ زہرناکی تھی۔ قومی اخبارات بالخصوص ٹائمز نے ان کا سنجیدہ چرچا کیا۔ لیکن تحریک کی زندگی اور توانائی میں فرق نہ آیا۔ سر رونالڈ گولڈ اور ان کی انجمن اسی طرح مصروف کار رہی۔ ٹائمز کے ایجوکیشنل سپلیمنٹ نے اس تحریک کی سب سے زیادہ مخالفت کی اور اساتذہ کے اس اقدام کو کبھی احمقانہ تحریک سے تعبیر کیا اور کبھی اسے مضحکہ خیز اقدام کا نام دیا۔ ان تحریروں کے . . . .

جواب میں اساتذہ بھی انفرادی اور اجتماعی طور پر بے شمار خطوط لکھتے رہے۔ ۱۶ دسمبر ۱۹۵۵ء کے اداریے کے جواب میں سر گولڈ نے ایجوکیشنل سپلیمنٹ کے مدیر کو ایک خط لکھا جو اگرچہ بہت ہی مختصر ہے لیکن اس سے دونوں کے نقطۂ نگاہ کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ خط کے مندرجات یہ ہیں۔

میں نے ۱۶ دسمبر میں آپ کے ریمارک پڑھے . . . .

یونین نے اس سلسلے میں ایک واضح قدم اٹھالیا ہے جواب کوئی چھپی ہوئی بات نہیں ہے۔ یہ ایک اقدام ہے جس کے متعلق آپ کو اپنی رائے کے اظہار کا پورا حق حاصل ہے لیکن یہ بات کم از کم میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ آپ اپنی راہ سے ہٹ کر یونین کی نکتہ چینی کرتے ہیں۔ اور آپ کی لئے ایم کی توصیف۔ کیا اس لیے کہ مسودے کی دوسری قرأت کے بعد انہوں نے پارلیمان کے ممبروں کے پاس ایک خط ارسال کیا ہے۔ اس خط میں جن نکات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یونین نے بھی بائیں پارلیمان کے ممبروں کے پاس دوسری قرأت

سے پہلے ہی لکھ کر بھیج دی تھیں۔ بلکہ ان سے بالخصوص ان امور پر مشورہ
بھی کر لیا گیا تھا"

حملوں اور جوابی حملوں کا یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ اساتذہ کی تنقید میں اب بھی وہی پرانے نیر و نشتر ہیں اگرچہ روزنامہ ٹائمز اور اس کے دونوں ہفت روزوں کا مزاج کچھ بدلا بدلا سا نظر آرہا ہے۔ اس کی وجہ غالباً ہر حکومت کی مصالحانہ حکمت عملی معلوم ہوتی ہے۔

اقتصادی بحران برطانیہ اس وقت ایک عجیب معاشی بحران میں مبتلا ہے۔ دوسری عالمگیر لڑائی نے اگر ہٹلر اور موسولینی کی نازی اور فسطائی حکومتوں کو ختم کیا ہے تو "سامراج انگلیس" کے نوآبادیاتی طلسم کو بھی پارہ پارہ کر دیا۔ حتیٰ کہ افریقہ کا ایک سیاہ فام حبشی بھی ہائیڈ پارک میں کھڑا ہو کر ان کے تہذیب و تمدن کا مذاق اڑاتا ہے۔ انگریزی مصنوعات کو اب دنیا کے بازار میں دوسروں سے کھلا ہوا مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے۔ آج سے دس پندرہ برس پہلے تو یہ ممکن تھا کہ ہندوستان میں انگریزی مصنوعات بے محصول یا ایک نام نہاد محصول کی ادائیگی کے بعد دوسروں کی تیار کردہ مصنوعات کا مقابلہ کریں۔ مگر اب وہ پرانے وسائل اور ذرائع مسدود ہو چکے ہیں تا ایں کہ اپنی سیاسی حیثیت کو قائم رکھنے کے لیے انہیں امریکہ کی دریوزہ گری کرنی پڑتی ہے۔ ایڈن کے حالیہ دورہ امریکہ کی غایت برطانیہ کی معاشی بدحالی اور اس کے گرتے ہوئے سیاسی وقار کو سنبھالنا تھا۔ امریکہ کے ایک ذمہ دار افسر کا یہ کہنا کہ ہم برطانیہ کو دنیا کی سیاسی بساط پر شکست نہیں کھانے دیں گے اس کے اقتصادی اور سیاسی زوال کی غمازی کرتا ہے۔

اس معاشی اور اقتصادی بحران کو دور کرنے کے لیے حکومت مختلف قسم کے اقدام کر رہی ہے لیکن بظاہر اصلاح حال کے امکانات کم ہیں۔ مسٹر ٹیلر کا ضمنی میزانیہ بھی اس اقتصادی تعطل کو نہ روک سکا۔ حزب اختلاف نے بعض بنیادی نقائص کے پیش نظر اس میزانیے کی سخت مخالفت کی لیکن حکومت نے ان کی پیش کردہ ترمیموں کو قبول نہیں کیا۔ مسٹر ٹیلر کے بعد مسٹر میک می لن وزیر خزانہ مقرر ہوئے۔ ان کے سامنے بھی سب سے اہم مسئلہ اسی اقتصادی بحران کو دور کرنا تھا۔ چنانچہ ۱۷ فروری کو دارالعوام میں مسٹر میک می لن نے حکومت کے بعض اخراجات کم کرنے کی تجویز پیش کی۔ انہوں نے اپنی تقریر ان الفاظ سے شروع کی:-

"حکومت اب اس نتیجے پر پہونچ گئی ہے کہ اس وقت ہمارے توازن ادائے گی پر جو مزید بوجھ پڑ رہا ہے اس کے پیش نظر ہمیں کچھ اور قدم اٹھانا ہوگا"

اس تجویز کے مطابق حکومت خوراک اور صنعتی پروگرام کی امدادی رقوم میں سے ۹ کروڑ ۸۰ لاکھ پونڈ بچالے گی اس سے بعض اشیاء خوردنی اور دودھ کی قیمت میں ایک پنس کا اضافہ ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ مقامی حکومتوں کے منصوبوں کی تکمیل کی رفتار بھی سست کر دی گئی ہے۔ مزید براں حسب ضرورت سرکاری محکموں میں ۱۵ ہزار اسامیوں کی تخفیف کا مسئلہ بھی زیر غور ہے۔

حزب اختلاف نے حسب روایت حکومت کی بعض کوتاہ اندیشیوں کو اس تعطل کا سبب قرار دیا۔ مسٹر ہیرلڈ ولسن نے اس تجویز پر بحث کرتے ہوئے کہا۔

ادھار خریداری پر پابندیاں اور اس سلسلے میں آپ کے پیش رو کی طبقاتی حکمت عملی قومی صنعت میں زبردست کٹوتی۔ مقامی حکومتوں کے منصوبوں (جن میں تعلیمی منصوبے بھی شامل ہیں) کو روک دینا یا کم کر دینا ــــ یہ سب اس لیے ہو رہا ہے کہ حکومت نجی صنعتوں پر اپنی گرفت مضبوط رکھنے میں ناکام رہی۔

آپ کا مقصد اس اعلان کے مطابق بڑھتی ہوئی قیمتوں کو روکنا ہے۔ لیکن دودھ اور روٹی کی قیمت میں اضافہ کر کے آپ اسے کس طرح روکنے کی سوچتے ہیں۔ آخر تنخواہوں کے قیمتوں کے چکر پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔ (ٹائمز ۱۸ فروری)

معاشی بحران کا تعلیم پر اثر میں نے یہاں معاشی تعطل کا یہ مجمل سا خاکہ اس لیے پیش کیا ہے کہ حکومت کے مجوزہ مسودے میں اسے کافی دخل حاصل ہے۔ دراصل اس سیاسی اور اقتصادی پس منظر میں ہی اس کے اسباب مل سکیں گے، روزمرہ کی ضروریات آئے دن مہنگی ہوتی جا رہی ہیں۔ اور اب اس نئی تجویز کے مطابق جس کا نفاذ ۲۶ فروری سے ہونے والا ہے قیمتوں میں اور اضافہ ہو جائے گا۔ اشیائے خوردنی سے قطع نظر خانہ داری کی دوسری ضروریات کا انحصار تمام تر ادھار خریداری پر ہے۔ اس کا اثر بھی براہ راست یہاں کے رہنے والوں پر پڑے گا کیوں کہ یہ لوگ اپنی ضروریات کو اس طرح پوری کرنے کے عادی ہو چکے

ہیں اور یہ عادت ان کے مزاج میں راسخ ہو چکی ہے، اسے ایک دن میں تو بدلا نہیں جا سکتا۔ لارڈ وولشی مسٹر میک ملن کی تجویز کی حمایت میں فرماتے ہیں۔

"مسٹر میک ملن نے ایک نہایت عمدہ تمثیل پیش کی۔ انہوں نے کہا کہ ہم اپنی گھریلو بجلی کی مقررہ مقدار بہت سے پہلے استعمال کرتے ہیں۔ وہ اس سے بھی زیادہ عام فہم اور گھریلو مثال دے سکتے تھے کہ ایک گرہست خاتون ہفتہ رواں یا ماہ رواں کی امور خانہ داری سے متعلق رقم کو احتیاط کے ساتھ مسلسل اپنی گھریلو آمدنی سے زیادہ خرچ نہیں کر سکتی"۔ (سنڈے ٹائمز ۱۹ فروری)

انہوں نے آگے چل کر پھر یہ شکایت بھی کی ہے کہ چیزوں کے خریدنے کا پرانا طریقہ کہ جیب گرہ میں روپیہ ہو تو کوئی چیز خریدی جائے اب متروک اور فرسودہ سمجھا جانے لگا ہے۔ لیکن کوئی ان سے یہ پوچھے کہ خرید و فروخت اور عیش و طرب کا یہ نظام کس کا آوردہ ہے۔ تم تو آزاد تھے اور دنیا کی سیادت تمہارے ہاتھوں میں تھی۔ تم اسے اس طرح پیدا کرتے کہ یہ لا بدی اور آفاق گیر ہوتا۔ ان کی موجودہ کش مکش کو دیکھتے ہوئے یہ خیال ہوتا ہے کہ اقبال کی یہ پیشین گوئی کہ فرنگ رہ گذر سیل بے پناہ میں ہے کس قدر حقیقت آخر میں ثابت ہو رہی ہے۔

برطانوی مدارس کے اساتذہ بھی اس معاشرے کا ایک جزو ہیں۔ انہیں اس سے علاحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ بھی وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ ہی چلیں گے۔ ان کی ضروریات بھی وہی ہوں گی جو اس وقت کے معاشرے میں دوسروں کی ضروریات ہیں۔ اس لیے حکومت اگر وقت کے بدلتے ہوئے تیور نہیں سمجھ سکی یا جان بوجھ کر اس سے اغماض کر رہی ہے تو اس میں اساتذہ کا قصور کم، حکومت کی پالیسی وضع کرنے والوں کا زیادہ ہے۔

گروہی اقتصادی مفاد اس وقت یہاں ضروریات زندگی اس قدر گراں ہو چکی ہیں کہ نو یا دس پونڈ فی ہفتہ کمانے والا خاندان اپنے معیار زندگی کو قائم نہیں رکھ سکتا۔ اسے قائم رکھنے کے لیے انہیں مجبوراً دوسرے وسائل کی طرف نگاہیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ چنانچہ ادھار خریداری یہاں کی زندگی کے لیے لہٰذا ایسی ہی ضروری معلوم ہوتی ہے جیسے کھانا پانی۔

.... موجودہ معیار زندگی اور ضروری اشیاء کی گرانی کے پیش نظر اپنے گروہی اقتصادی مفاد کی خاطر بعض انجمنوں نے ہفت اندازہ تنخواہوں میں اضافے کا مطالبہ کیا۔ برٹش ٹرانسپورٹ کے ملازمین نے اس زمانے میں جب کہ سر ڈیوڈ اپنے نیشن بل کی کامیابی کے لیے مجاہدہ کر رہے تھے۔ ہڑتال کا اعلان کر دیا لیکن اس سیاسی اور معاشی زوال کی حالت میں بھی اس قوم میں ابھی وقت کی نبض ٹٹولنے کی صلاحیت باقی ہے۔ چنانچہ برٹش ٹرانسپورٹ ایمپلائز یونین کے نمائندوں سے ارباب اختیار نے بات چیت شروع کی اور تھوڑی سی رد و کد کے بعد یونین کے بیشتر مطالبات تسلیم کر لیے اور اس امر کو پورا کرنے کے لیے کرائے میں اضافہ کر دیا۔ اگرچہ اس کا اثر براہ راست سب پر پڑا۔ لیکن حکومت نے ایک بہت بڑے طبقے کو خوش رکھنے کی خاطر یہ اقدام کیا۔ برٹش ٹرانسپورٹ ایمپلائز کے نقش قدم پر چل کر بعض دوسری انجمنوں نے بھی اصلاح حال کے لیے ہڑتال کی دھمکی دی اور بعض حالات میں اس پر عمل بھی شروع کر دیا۔ یہاں بھی حکومت کو ان کے مطالبات تسلیم کرنے پڑے۔

اب اس فضا میں جب کہ دوسری انجمنوں کے مطالبات اس طرح تسلیم کیے جا رہے ہوں یونیورسٹی کے سلسلے میں اساتذہ کے حصہ امداد میں ایک فی صد کا اضافہ کرنا نفسیاتی لحاظ سے غلط تھا جس کا لازمی نتیجہ ایک ہنگامہ ہو سکتا تھا اور ہوا بھی یہی۔ دارالعوام میں اس سودے پر بحث کرتے ہوئے مسٹر بلیک برن (لیبر) نے جو کچھ کہا وہ حقیقت سے زیادہ قریب معلوم ہوتا ہے۔

نفسیاتی اثر مادی اثر سے کہیں زیادہ ہمہ گیر ہے۔ ان حالات میں کہ ضروریات زندگی روز بروز گراں ہوتی جاتی ہیں اور اس کے پیش نظر مزدوری اور تنخواہوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اساتذہ کے حصہ امداد میں یہ اضافہ تنخواہ میں کمی کرنے کے مترادف ہے۔ تنخواہ میں کمی خواہ کتنی ہی قلیل کیوں نہ ہو غیر معقول، غیر منصفانہ اور امتیازی معلوم ہوگی (ٹائمز، یکم فروری ۱۹۵۶ء)

اس سودا بازی میں صرف کارخانوں کے ملازم ہی پیش پیش نہیں ہیں بلکہ اس میں بعض پڑھے لکھے پیشے بھی شریک ہیں۔ جنوری میں یہاں کے طبیبوں نے بھی تنخواہ میں اضافے کا مطالبہ کیا۔ طبیبوں کو اگرچہ نجی کاروبار کی اجازت ہے لیکن وہ اجازت نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہاں ہر شخص اپنے حلقے کے ڈاکٹر کے

پاس رجسٹرڈ ہوتا ہے۔ بیماری کی صورت میں وہ اپنے ڈاکٹر سے رجوع کر سکتا ہے یا اسے اپنے گھر بلا سکتا ہے۔ اگر بیماری شدید ہوئی تو وہ فوراً آپ کو شفاخانے بھجوا دے گا۔ یہ ضروری نہیں کہ کسی مخصوص شفاخانے میں لے جایا جائے۔ بلکہ جہاں جگہ خالی ہوگی وہاں آپ کو بھیج دیا جائے گا۔ اس لیے ہمارے یہاں کے ڈاکٹروں کی طرح انہیں بیمار انسان کی جیب تراشی کا موقع نہیں ملتا۔ اس کے علاوہ اخلاقی لحاظ سے یہ اتنے اونچے ہیں کہ اس قسم کی آمدنی کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اس سلسلے میں ایک واقعے کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن کے ایک پرانے پاکستانی طالب علم کے یہاں جو اس سال اپنا THESIS پیش کر رہے ہیں کچھ احباب مدعو تھے۔ اس مجلس میں چند پاکستانی اور چند انگریز بھی شریک تھے۔ پاکستانی احباب میں ایک ڈاکٹر[1] صاحب بھی تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی آواز کترنی کی طرح چل رہی تھی معلوم نہیں وہ اپنے مصنوعی لہجے اور بے سروپا باتوں سے ہم سب کو مرعوب کرنا چاہتے تھے یا اس میں کچھ واقعیت بھی تھی۔ گفتگو کس موضوع پر شروع ہوئی اور اس کا اختتام کس موضوع پر ہوا۔ یہ بات بھی محض سننے سے تعلق رکھتی ہے۔ بہرصورت انہوں نے ہزاروں پلٹے کھائے اور سیاست، صحافت اور اخلاق اور معاشرہ کون سا ایسا میدان ہے جہاں انہوں اپنی جولانی کے جوہر نہ دکھلائے ہوں۔ دوران گفتگو میں انہوں نے یہ فرمایا کہ یہاں کے ڈاکٹر تو بھوکوں مر ہیں ان کا جملہ تھا (وہ فاقوں سے مر رہے ہیں) اس کے جواب میں مسٹر لیبنر نے کہا "یہ ممکن کہ ان کے پاس عمدہ کاریں یا بہت ہی اچھے مکانات نہ ہوں لیکن انگلستان موجودہ اقتصادی بحران کے باوجود ابھی اس حال کو نہیں پہونچا کہ اپنے ایک شہری کو روٹی مہیا نہ کر سکے۔" جواب معقول تھا۔ اس سے زیادہ وضاحت کیا ہو سکتی تھی لیکن ڈاکٹر صاحب کو اپنی بات پر اصرار رہا میں اس تمام گفتگو میں زیادہ تر خاموش ہی ان کی لن ترانی چلتی ہی رہی۔ ہر شخص علی گڑھ کی اصطلاح میں "بور" ہو رہا تھا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے ارد کہا۔ ڈاکٹر صاحب بجا ارشاد جب تک ایک نسخے کی قیمت ایک ہزار روپیہ نہ ہو، ڈاکٹر کی حیثیت نہیں اپنے ہم پیشوں کی اس زبوں حالی پر آپ کا ماتم بجا۔ لوگ ہنس پڑے۔ انگریز منہ دیکھتے رہے۔ ڈاکٹر صاحب جھینپ سے گئے لیکن ان کی گفتگو کا سیلاب بند نہ ہوا۔

۱؎ میں نے دونوں حضرات کے اسمائے گرامی عمداً نہیں لکھے۔

یہ واقعہ میں نے اس لیے بیان کیا کہ موجودہ اقتصادی بحران سے برطانیہ کا ایک ایک فرد متاثر نظر آرہا ہے۔ ان میں اونچے، نیچے، بڑے یا چھوٹے کی تمیز نہیں۔ اس لیے پناہ میں ہر شخص بہتا ہوا نظر آرہا ہے اور ہر انجمن اپنی اپنی ضروریات کے مطابق حکومت کے حضور اپنے اپنے مطالبات پیش کر رہی ہے کیوں کہ اس معاشرے میں "دہری آمدنی" کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے یہاں اساتذہ کے علاوہ دوسروں کو اس کے بیش از بیش مواقع حاصل ہیں۔

التوائے نفاذ کا پس منظر | اس معاشی کش مکش اور طوفان میں جو اگرچہ حکومت کا اپنا آوردہ ہے بظاہر کوئی راہ نجات نظر نہیں حکومت کو اس کے نفاذ پر اصرار اور اساتذہ کا اسے تسلیم کرنے سے انکار۔ ایسی نازک صورت میں آخر کیا کیا جائے۔ اپنے داخلی معاملات میں انگریز سمجھوتے کا بہت بڑا داعی ہے۔ اسے یہ اندیشہ نہیں ہوتا کہ اگر میں اپنی اس بات سے ایک قدم ہٹا تو میری سبکی ہو جائے گی یا اس سے میرے وقار کو ٹھیس لگے گی۔ اس لیے اکثر مصالحت بھی ہو جاتی ہے اور اس سے بعض اوقات متعلقہ گروہوں کو من حیث المجموع فائدہ بھی پہونچ جاتا ہے۔ اس مسودے کے سلسلے میں اس کے بعد حکومت نے جو قدم اٹھایا اسے انگریزوں کے اس ذہنی پس منظر کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔

موجودہ گرانی کے پیش نظر برن ہم کمیٹی اور این یو ٹی کے مابین ایک عارضی اضافے کے متعلق بات چیت ہو رہی تھی اور غالباً برن ہم کمیٹی ۳۰ پونڈ کے اضافے کے لیے تیار بھی تھی لیکن ۲۰ دسمبر ۵۵ء کو کمیٹی کے ارکان مدرسین نے عارضی اضافے کی درخواست کو واپس لینے کا فیصلہ کیا اور اس کی بجائے برن ہم کمیٹی سے تنخواہوں کے اسکیل پر نظر ثانی کرنے کی درخواست کی۔ حکومت نے اساتذہ کے زخموں کو مندمل کرنے کی نیت سے ایک قرطاس ابیض شائع کیا۔

جہاں تک حکومت کا تعلق ہے وہ اساتذہ کی تنخواہوں میں اپریل ۵۶ء سے ایک معقول عارضی اضافے کے لیے تیار ہے لیکن اسے اس سے بھی اتفاق ہے کہ اساتذہ کی تنخواہوں کے متعلق ایک مکمل رویہ کی ضرورت ہے۔ حکومت اس مقصد کے لیے فوری مذاکرات کا خیر مقدم کرے گی۔

لیکن اگر ایسا ہوا بھی تو کسی نئے برن ہم عطیے کا نفاذ پندرہ ماہ سے قبل نہیں ہو سکتا اور وزیر کو اس قسم کے کسی عطیے کے نافذ کرنے کا کوئی اختیار نہیں۔ لیکن اگر فوری مذاکرات کی بدولت دونوں یا تینوں میں کوئی فیصلہ ہو جاتا ہے کہ اسے یکم اپریل سے قبل نافذ کر دیا جائے تو حکومت کسی ایسی تاریخ سے اس کے نفاذ کے متعلق ہمدردی سے غور کرے گی۔ لیکن پھر بھی یہ زیادہ اہم ہے کہ اساتذہ کے مشاہیروں کا یہ عظیم ریویو نہایت احتیاط اور باقاعدگی سے عمل میں آئے اور اگر برن کمیٹی عارضی اضافے پر والیس جائے تو حکومت اس پر بھی غور و خوض کرنے کے لیے تیار ہے۔" (ٹائمز ۶ جنوری)

اگر حکومت کی پچھلی حکمت عملی کا اس بیان کی روشنی میں جائزہ لیا جائے تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ حکومت کا انداز بدلا ہوا ہے۔ مسٹر پیوڈ ایکواب اسے "بز و رقانون" اساتذہ کے سر پر تھوپنا نہیں چاہتے۔ بلکہ اس کے لیے ایسے مواقع کی تلاش میں ہیں کہ ان کا یہ اقدام ساتذہ کو گراں نہ گذرے۔ ظاہر ہے کہ تنخواہ میں معقول اضافے کے بعد اگر حکومت اس مسودہ قانون کے نفاذ پر اصرار کرتی تو شاید اساتذہ کو اعتراض نہ ہوتا۔ لیبر پارٹی کے ایک رکن نے مسودے کی پہلی قراءت میں یہ کہا تھا کہ "یہ مسودہ غلط وقت پر پیش ہوا ہے۔ اور یہ کہ اس کے نتائج اچھے نہ ہوں گے" اور فی الواقع وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ حکومت کو اپنی اس غلطی کا احساس ہوا تو اس نے اپنی حکمت عملی کو بالکل بدل دیا۔ بلکہ اب ایک ماہر نفسیات کی طرح ان کی ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہے اور کیوں نہ ہو حاکم سب سے بڑا ماہر نفسیات ہوتا ہے، اس نزاع سے چند روز قبل وزیر موصوف نے یہ فرمایا تھا کہ اس نزاع میں حکومت، اساتذہ اور مقامی حکومت کے ملازم ہیں۔ اس لیے حکومت ایک کے مفاد کو دوسرے کے مفاد پر ترجیح نہیں دے سکتی۔ بلکہ دونوں کے بین بین کوئی ایسی راہ تجویز کرنا چاہتی ہے جس میں دونوں کا بھلا ہو۔ اور یہ صورت کیا تھی یہی ایک فی صد کا اضافہ۔ لیکن آج اس لہجے میں کتنی نرمی اور کتنی ہمدردی پیدا ہو گئی ہے، جیسے ان الفاظ کا وزیر موصوف سے کوئی تعلق نہ ہو۔ لیکن حق یہ ہے کہ یہ اسی تندخو کے کلمات ہیں جو اساتذہ کے مطالبات سننے کے لیے تیار بھی نہ تھے۔

حکومت کے اس اعلان پر این۔یو۔ٹی کے سیکرٹری سر رونالڈ گولڈ نے ان الفاظ میں تبصرہ کیا۔

حکومت کے بیان میں جن امکانات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ان کے متعلق میں یہ کہوں گا کہ جس وقت برن ہم کمیٹی کے ارکان مدرسین نے ۲۰ دسمبر ۵۵ء کو عارضی جلسے کی درخوا[ست] کے واپس لینے اور شاہروں کے مکمل ریویو کی درخواست کا فیصلہ کیا تھا تو ان کے سامنے اس اس قسم کے سارے امکانات تھے تعلیم کا پیشہ حکومت کی اس توقع میں اس کا شریک ہے کہ جو نیا سمجھوتا ہوگا اسے یکم اپریل ۵۶ء سے پہلے ہی نافذ کر دیا جائے گا۔

ہماری یہ آرزو کہ اساتذہ کی تنخواہوں میں بہت جلد ایک معقول اضافہ ہو جائے کمیٹی کے ارکان مدرسین کے اس اقدام سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ برن ہم کمیٹی کے جلد از جلد اجلاس کی درخواست پہلے ہی کر چکے ہیں۔ (ٹائمز ۲ جنوری)

سر گولڈ کے اس بیان سے ان کی بے نیازی کے علاوہ یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ وہ حکومت کے ان [نئے] سیدھے مردوں کا مقصد خوب سمجھتے ہیں۔ ان کے بعد کے بیانات سے اس کی مزید وضاحت ہو جاتی ہے [حکو]مت کے انداز میں تغیر آ چکا تھا لیکن اساتذہ کی انجمن اپنے فیصلے پر بدستور قائم رہی۔ ۹ جنوری سے تیو گمو[د] ع کرنے کا جو تمنا حی حکم جاری ہوا تھا یونین نے اسے واپس نہیں لیا۔ بلکہ اسے باقاعدہ ایک تحریک [کی] صورت میں چلاتی رہی۔

ہماری چند معاشرتی بیماریاں

ڈاکٹر عبدالرؤف

کسی قوم کی ترقی کا انحصار اس قوم کی معاشرتی صحت پر مبنی ہے۔ اگر افراد کا فکر و عمل صحت مند ہو تو قوم میں ذلت اور بدی کے پھیلنے کے امکان گھٹ جاتے ہیں۔ اس کے برعکس کسی قوم کے فکر و عمل مریض ہوں تو اس کے لیے ترقی کے تمام راستے مسدود ہو جاتے ہیں۔ فکر و عمل کے یہی مریض عناصر اخلاقی اور معاشرتی ابتری کا باعث ہی نہیں بنتے بلکہ صنعتی ترقی اور اقتصادی خوشحالی کے کام میں بھی رکاوٹ ڈالتے ہیں

آج وطن کو بے شمار مشکلات درپیش ہیں ہماری زندگی کے بیشتر شعبے ایسے ہیں جن میں ہم نے ابھی تک کوئی قابل قدر ترقی نہیں کی جن جن شعبوں میں ہم نے تھوڑی بہت ترقی کی بھی ہے ان میں اس سے کئی گنا زیادہ ترقی کے امکان تھے اور اب بھی موجود ہیں بشرطیکہ ہم صحت مند افراد اور صالح معاشرے کی حیثیت سے ان امکانات سے پورا پورا استفادہ کرنے کی کوشش کریں۔

میں اس مختصر سے وقت میں اپنے بدنصیب معاشرے کی چند ایک بیماریاں آپ کے زیر توجہ لانا چاہتا ہوں جو ہماری ترقی کا راستہ روکے ہوئے ہیں۔ بظاہر یہ معاشرتی بیماریاں قابل نظر انداز نمایاں دکھائی دیتی ہیں لیکن اگر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو ہماری بیشتر برائیوں کی بنیادی وجہ بھی معاشرتی بیماریاں ہیں۔ انہی معاشرتی بیماریوں کو دیکھ کر یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ہم ایک بیمار معاشرہ میں ہیں جسے اپنی ماضی کی تاریخ، موجودہ زندگی کے تقاضے اور مستقبل کی تعمیر ——— غرض کہ کوئی خیال بھی اصلاح و ترقی کے لیے متحرک نہیں کرتا۔

سڑکوں پر بداخلاقی کے مظاہرے ہماری ایک عام معاشرتی بیماری ہماری بداخلاقی ہے۔ اگر آپ نے بداخلاقی کو چلتے پھرتے دیکھنا ہو تو اپنے گلی کوچوں اور سڑکوں پر گھومیے۔ روزمرہ جھگڑوں میں گالی گلوچ کے عام استعمال کے علاوہ ہمارے ہاں ایسے افراد کی بھی کمی نہیں جو گالی کو تزئین گفتگو کے طور پر استعمال

کرتے ہیں۔ بہت کم لوگ یہ احتیاط برتتے ہیں کہ اگر پاس سے عورتیں گزر رہی ہیں تو گفتگو میں گالی کے الفاظ سے اجتناب کیا جائے۔ پچھلے مہینے یوم جمہوریہ کی تقریب پر میں نے دیکھا کہ سڑک پر چند خواتین جا رہی تھیں جن کے پیچھے چند نوعمر لڑکے تھے جو آپس میں بڑی بے تکلفی سے محض مذاقاً گالیوں کا تبادلہ کرتے چلے جا رہے تھے۔ میں نے ان لڑکوں کی توجہ اس بات کی طرف دلائی کہ ان کے آگے آگے خواتین جا رہی ہیں اور انہیں چاہیے کہ کم از کم خواتین کے احترام کی خاطر ہی گالیوں کا سلسلہ بند کر دیں، مگر میری یہ درخواست رائیگاں گئی۔ لڑکے ہنس دیے اور بدستور گالیاں بکتے ہوئے چل دیے۔ ان لڑکوں کے پیچھے نوجوانوں کا ایک اور گروہ آ رہا تھا انہوں نے خود ہی مجھ سے پوچھا کہ آپ نے اُن لڑکوں سے کیا کہا؟ میں نے جواب دیا کہ میں نے انہیں عورتوں کی موجودگی میں گالیاں بکنے سے روکا، مگر وہ نہ رکے۔ اس پر اس گروہ کے ایک جوشیلے نوجوان بول اٹھے۔ "یہ سب حرام کی اولاد ہیں" اور ساتھ ہی گالیاں بکنے والے گروہ کی مذمت کے طور پر خود ہی نہایت بلیغ گالیاں بکنے لگے۔

عورتوں سے چھیڑ چھاڑ | عورتوں کی موجودگی میں مناسب طرز عمل اختیار کرنے کا شعور ہی ہمارے ہاں نایاب ہوتا جا رہا ہے۔ راہ چلتی ہوئی عورتوں سے مذاق ان کی طرف گھور گھور کر دیکھنے اور ان پر طرح طرح کے فقرے چست کرنے کا رواج بھی ہمارے ہاں کافی ترقی پکڑ گیا ہے۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ بعض لوگ سڑک پر چلتی ہوئی عورتوں کی طرف ٹکٹکی باندھ کر اور یوں مُڑ مُڑ کر دیکھتے ہیں جیسے انہیں اپنی زندگی میں پہلے کبھی اس صنف کو دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا ہو۔

نوجوانوں میں عورتوں کے لباس، بناؤ سنگار اور ان کی شکل و صورت پر فقرے کسنے کا مرض تو اب وبائی صورت اختیار کر گیا ہے۔ جو عورتیں سودا سلف خریدنے گھریلو کاموں یا سیر و تفریح کے لیے مردوں یا محافظوں کی معیت میں گھر سے باہر نکلتی ہیں وہ تو غنڈہ ازم کے ان مختلف حملوں کی زد سے کافی حد تک محفوظ رہتی ہیں مگر وہ عورتیں جنہیں بدقسمتی سے تنہا باہر نکلنا پڑتا ہے شاذ ہی سڑکوں کی بد اخلاق فضا سے بچتی ہوں۔ آج ہماری سڑکوں پر آوارہ زنا طبقوں کا دبدبہ ہے۔ شاذ ہی کوئی سڑک ایسی ہوگی جس پر سے کوئی عورت آزادی کے ساتھ اور طرح طرح کی باتیں سنے بغیر گزر سکتی ہو۔ اس صورت حال کا ایک

افسوسناک نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان بد اخلاق عناصر کے ڈر کی وجہ سے اکثر عورتیں اپنے روز مرہ کام اور سیر و تفریح کے لیے باہر نکلنا ہی ترک کر دیتی ہیں جس سے ان کی اپنی صحت اور ان کے بچوں کی صحت پر بہت ناگوار اثر پڑتا ہے۔ یہ بات کہ ہماری عورتیں، ہماری سڑکوں اور سیرگاہوں میں آزادی کے ساتھ چل پھر نہیں سکتیں اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اخلاقی اعتبار سے ہمارا معاشرہ بیمار معاشرہ ہے۔

گندی گلیاں گلیوں اور بازاروں میں صفائی کا خیال رکھنے کے بارے میں بھی ہم لوگ بہت مجرمانہ غفلت کا اظہار کرتے ہیں۔ ہم اپنی گلیوں میں کوڑے کرکٹ کے ڈھیر کس قدر بے تکلفی سے پھینک دیتے ہیں۔ ہمارے بچے گلی کی نالیوں پر جا بجا رفع حاجت کے لیے بیٹھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ ہم کس قدر بے تکلفی سے اپنی بھینس مکان کے باہر گلی میں باندھ دیتے ہیں۔ اور گوبر کے اُپلے گلی کی دیواروں پر جہاں جی چاہے لگا دیتے ہیں۔ اپنے مکانوں اور گلیوں کو اس طرح گندا رکھ کر ہم کبھی بھی یہ بات محسوس نہیں کرتے کہ اس سے نہ صرف ہماری اپنی صحت خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ بلکہ ہمسایوں کی صحت پر بھی ناگوار اثر پڑتا ہے۔ ایک اور پہلو سے دیکھا جائے تو بھی ہمیں اپنی گلیوں کی صفائی کا اہتمام زیادہ خصوصی توجہ سے کرنا چاہیے۔ ہمارے ہاں بچوں کے لیے کھیل کے مناسب میدان اور پارکیں نایاب ہیں کھیل کے لیے مناسب جگہیں میسر نہ آنے کی وجہ سے ہمارے بچے عموماً اپنی گلیوں میں کھیلنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ جہاں ہم ہر قسم کی غلاظت اور گندگی کے بڑے بڑے ڈھیر لگائے رکھتے ہیں اگر ہماری گلیاں صاف ستھری ہوں تو ہمارے بچے گندگی میں کھیلنے کے خطروں سے بچ سکتے ہیں۔

بچوں کی عادتیں بگاڑنے کی رسومات بچوں کی عادتیں بگاڑنے کے لیے بھی ہم کافی کوشاں رہتے ہیں۔ ہمارے گلی کوچوں میں یہ آواز عام سنی جا سکتی ہے "بالو۔ کڑیو۔ کھیر ونڈدی لے کے جاؤ"۔ بچے اس آواز کے سنتے ہی اس مکان کی طرف یلغار کر دیتے ہیں جہاں سے یہ آواز آرہی ہوتی ہے۔ آن واحد میں اس مکان کے دروازے پر للچائے ہوئے بچوں کے غول کے غول کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جنہاں چند دم پڑھی ہوئی کھیر، چنے، پیسے اور کیا کچھ بچوں میں اس طرح بانٹا جاتا ہے جس طرح فقیروں کے مشغول ہجوم میں خیرات بانٹی جاتی ہے۔ اس طرح کی رسومات سے ہم ننھی عمر ہی میں بچوں کو گداگری، دھینگا مشتی

اور ہر ٹونا ٹوٹکا سکھانے کی ابتدائی تربیت دینے کے مرتکب ہوتے ہیں۔

یتیم بچوں سے ہمارا رویہ بے حد ناقص ہے۔ بعض لوگ یتیم بچوں کو قطار در قطار گھر پر کھانے کے لیے بلوا بھیجتے ہیں۔ ایسے منیر لوگوں کی نیت پوری اور نیک نیتی پر قطعی شک نہیں ہو سکتا۔ مگر مجھے اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ یہ لوگ کبھی یہ نہیں سوچتے کہ یتیم بچوں کو اس طرح سڑکوں پر پھرانا قرین مصلحت نہیں۔ یتیم بچے ٹولیاں بنا کر سڑکوں پر نکلنے، دوسروں کے ہاں تباہی اور مساکین کی حیثیت سے بیٹھ کر کھانا کھانے اور پھر قطار باندھ کر واپس لوٹنے۔ چندہ اکٹھا کرنے کے لیے جلسے جلوسوں میں گھومنے وغیرہ ایسے مشاغل میں شمولیت کو بہت بری طرح محسوس کرتے ہیں۔ مخیر حضرات عمدہ عمدہ کھانے پکوا کر یتیم بچوں کی رہائش گاہ پر بھی بھیج سکتے ہیں۔ یتیم بچوں کی فلاح و بہبود پر روپیہ صرف کرنے کے اور بھی بے شمار طریقے ایسے ہیں جن سے انہیں مستقل فائدہ بھی پہونچتا ہے اور ان کی بھونڈی تشہیر بھی نہیں ہوتی۔

ملّی موقعوں پر اہانتِ قانون ہم میں اپنے ملّی موقعوں پر مناسب کردار کا شعور بھی بہت کم ہے میں نے اکثر دیکھا ہے کہ ملّی اور مذہبی تہواروں کے موقعوں پر ہم قانون اور صحیح عمل کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔ قومی جشنوں، میلوں، عید، کرکٹ میچوں وغیرہ کے موقع پر تانگوں پر چھپے چھپے سواریاں اور سائیکلوں پر دو دو تین تین افراد عام بیٹھے نظر آتے ہیں۔ ہم بہت جلد بھول جاتے ہیں کہ ہمارا یہ کردار ہمارے وطن کے ضابطۂ قانون کی اہانت ہے۔ اور وطن کے عام اور مسلّمہ قوانین کی اہانت کرنا اپنے ملّی شعور کی اہانت کے مترادف ہے۔ ایک خوشی کے دن اس توہین آمیز اور خلافِ معاشرت فعل کے مرتکب ہو کر ہم اپنی ذہنی بیماری کا ثبوت بہم پہونچاتے ہیں۔

ہمدردی کے غلط جذبے ہماری بعض معاشرتی بیماریاں ایسی ہیں جن کا تعلق جذبۂ ہمدردی کے بے محل استعمال سے ہے۔ پولیس کا سپاہی کسی تانگے والے کا چالان کر رہا ہو تو ہم اسی جذبہ کے تحت موقع پر جمع ہو جاتے ہیں اور طرح طرح کی منطق، وکالت اور سفارش سے اس کوشش میں لگ جاتے ہیں کہ کسی طرح تانگے والا چالان سے بچ جائے۔ کارپوریشن کا عملہ آوارہ کتوں کو مارنے کے کام کے لیے نکلتا ہے تو اسے بھی کئی جگہوں پر اسی مریض جذبہ ہمدردی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ حالانکہ کتوں کو ختم

کرنے والی گولیاں کھلاتا ہے۔ مگر ایک خدا ترس صاحب کھٹ سے پیالے میں کوئی دوائی نکال لائے ہیں جو زہریلی گولی کا اثر زائل کردے اور بے چارے گنتے کو کارپوریشن کے "بے دم" حملے سے نجات دلا کر نئے سرے سے لوگوں کی ٹانگیں کاٹنے پھرنے کا اہل بنا دے۔

ریڈیو کا بدذوق استعمال | ریڈیو کے استعمال میں تو ہم بیشتر بدذوقی کا اظہار کرتے ہیں، ہمارے ہوٹلوں اور قہوہ خانوں میں ریڈیو اس قدر بلند آواز سے لگائے جاتے ہیں جیسے دس ہزار کے مجمع کو خطاب کرنا ہو۔ لاہور میں شام کے وقت ریلوے اسٹیشن، گوال منڈی، میکلوڈ روڈ وغیرہ کے ہوٹل زدہ خطوں میں مختلف سمتوں سے گرجتے ہوئے ریڈیو روز محشر کا سماں پیدا کیے رکھتے ہیں۔ ان بدقسمت خطوں سے گذرنے والا فرد یوں محسوس کرتا ہے جیسے کسی ایسے علاقے سے گذر رہا ہے جس پر تیز رفتار، کرخت آواز بمبار طیاروں نے حملہ کر دیا ہو۔ مگر مجھے زیادہ حیرانی ان بھلے مانس شہریوں پر ہوتی ہے جو اپنے اچھے بھلے گھروں میں بھی بلاوجہ یہی سماں پیدا کر دیتے ہیں۔ ہم جب اپنے گھر میں ریڈیو لگاتے ہیں تو گانا سننے کی خوشی میں کئی اہم باتیں بھول جاتے ہیں۔ مثلاً ہم بھول جاتے ہیں کہ شاید ہماری طرح ہمارے ہمسائے کے گھر میں بھی ریڈیو سیٹ موجود ہو۔ یا یہ کہ ہمارے ہمسائے شاید اس وقت ریڈیو سننے کے موڈ میں نہ ہوں یا یہ کہ ہمارے اپنے گھر میں یا اردگرد کے گھروں میں کوئی مریض، طلبہ، یا سنجیدہ کام کرنے والے دیگر لوگ ہمارے ریڈیو کے فلمی نغموں کی گرج کو برداشت نہ کر سکتے ہوں۔

خوشی اور غمی پر بے شعوری کا اظہار | خوشی اور غمی کے موقعوں پر بھی ہم لوگ بے شمار عجیب و غریب حرکتوں کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں۔ گھوڑے کی سواری، کرخت آواز باجے، جہیز کے تمام سامان کا نمائشی جلوس، پرتکلف دعوتیں اور اسراف بیجا کے دیگر مظاہرے ــــ ہمارے ہاں شادی کے چند قابل غور سبق ہیں۔ اسی طرح مرگ پر بھی ہم لوگ لمبی لمبی کارروائیوں اور پیشہ ور مولوی صاحبان کی فرمائشوں کو نہایت التزام کے ساتھ پورا کرنے میں دریغ نہیں کرتے۔

اسلاف سے عقیدت میں بے شعوری | ہماری ایک اور اہم معاشرتی بیماری مرحوم آبا و اجداد سے

ی مریدانہ عقیدت ہے۔ ہمارے دینی بزرگ وفات پاتے ہیں تو ہم ان کے عالیشان مقبرے شکوہ درگاہیں اور دربار تعمیر کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ جہاں لوگ جوق در جوق جمع ہو کر رونیاز کا سلسلہ شروع کر دیتے ہیں۔ ان جگہوں پر عرس، تقریبوں، قوالیوں اور مجروں پہ لاکھوں روپے رف ہوتے ہیں۔ نذروں، چڑھاووں، اور آمدنی کے دیگر سلسلوں کا فائدہ صرف چند ایک ایسے افراد اٹھاتے ں جو مجاور یا منتظمین کی صورت اس عمارت سے چمٹ جاتے ہیں۔ لوگوں کو مرحوم بزرگ دین کی اصلی علیمات سے روشناس کرانے اور ان کی دینی خدمات کی یاد تازہ رکھنے کے لیے کوئی منظم کوشش ہیں کی جاتی۔ کاش کہ اپنے اسلاف کے مقابر پر قوالیاں اور میلے لگانے کی بجائے ہم یہی روپیہ ان کی یاد میں تعلیمی، صنعتی اور ثقافتی ادارے کھولنے میں صرف کرتے تاکہ اپنے اس بہتر عمل سے ہم یہ بات ثابت کر سکتے کہ ہمیں اپنے اکابر علم و دین سے صحیح عقیدت ہے اور ہم مفید معاشرتی طریقے سے ان کی تعلیمات کی نشر و اشاعت کرنا چاہتے ہیں۔

ہماری معاشرتی بے شعوری کی یہ فقط چند مثالیں ہیں۔ بے شعوری کے ان مختلف مظاہروں سے معاشرے کو جو نقصان پہنچتا ہے وہ محتاجِ وضاحت نہیں۔ ایک آزاد اسلامی جمہوریہ کے ذمہ دار شہری ہونے کی حیثیت سے ہم سب پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اپنے اپنے حلقۂ اثر میں یہ کوشش کریں کہ ان معاشرتی خامیوں کا خاطر خواہ علاج ہو تاکہ ہم بھی ایک صحت مند معاشرے کی حیثیت سے ترقی کی مختلف شاہراہوں پر تیز تیز چل سکیں۔

اردو اور معلمین اردو

شیخ اصغر علی

آج کل پورے نظامِ تعلیم میں معیار کی گراوٹ کا ایک عام احساس پایا جاتا ہے۔ انگریزی سے خصوصی دلچسپی رکھنے والے حضرات کو گلہ ہے کہ انگریزی کا معیار اور رفتار دونوں تدریج گر رہے ہیں۔ فدایانِ اردو روتے ہیں کہ قیامِ پاکستان کے بعد بجائے اس کے کہ مضمون اردو کا معیار بلند ہوتا پست ہوتا جا رہا ہے۔ اور یہی شکوہ دوسرے مضامین کے اساتذہ کی زبانوں پر جاری ہے۔ اس پستی کی وجوہ کا کھوج لگانے بیٹھیں تو ہمیں بیک وقت کئی ایک چیزیں اس تنزل کی ذمہ دار نظر آتی ہیں مثلاً استاد، نصاب، طریقِ تعلیم، تعدادِ طلبہ وغیرہ۔ یہاں ہم اس کے صرف ایک پہلو پر تبصرہ کریں گے اور یہ جائزہ لیں گے کہ ہمارے معلمینِ اردو اس معیار کو گرانے میں کہاں تک ذمہ دار ہیں۔

ابتدائی اور وسطانی جماعتوں میں اردو ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے اور فوقانی جماعتوں میں اسے انتخابی مضمون کی حیثیت حاصل ہے۔ ابتدائی مدارس کا اہتمام و انتظام ڈسٹرکٹ بورڈوں اور میونسپل کمیٹیوں کے سپرد ہے اور یہاں تدریس اردو کا کام جے وی مدرسین کے سپرد کیا جاتا ہے، لیکن اکثر مدارس میں ان جے وی مدرسین کے ساتھ ساتھ غیر تربیت یافتہ مڈل پاس ملازم بھی ملتے ہیں جو طریقۂ تعلیم سے بالکل بے بہرہ ہوتے ہیں۔ اور عام طور پر پہلی جماعت کے بچوں کو انہیں مڈل پاس اساتذہ کی تحویل میں دے دیا جاتا ہے اور اس طرح قصرِ اردو کی تعمیر خام بنیادوں پر شروع ہو جاتی ہے، جہاں تک تربیت یافتہ اساتذہ کا تعلق ہے ان میں سے بہت کم لوگ قابل اور عمدہ معلم ثابت ہوتے ہیں۔ اردو زبان میں روانی سے گفتگو کرنا ان کے لیے محال۔ لب و لہجہ ان کا ناقص تلفظ اصلاح طلب اور بعض اوقات چند ایک اساتذہ چوتھی اور پانچویں جماعت کی درسی کتابوں کو سمجھنے کے بھی اہل نہیں ہوتے۔

ثانوی مدارس میں ہمیں دو قسم کے اردو کے اساتذہ نظر آتے ہیں۔ ایک تو ایس۔ وی اور دوسرے منشی فاضل اساتذہ۔ ایس وی حضرات تو صرف وسطانی جماعتوں میں ہی اردو کی تدریس کے فرائض ادائے سر انجام دیتے ہیں۔ لیکن منشی فاضل او ٹی حضرات کو وسطانی جماعتوں میں بالعموم اور فوقانی جماعتوں میں بالخصوص تدریس اردو کا کام تفویض کر دیا جاتا ہے۔ ایس وی اساتذہ عموماً مڈل پاس ہوتے ہیں۔ ان سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ پورے معیار کو قائم رکھتے ہوئے ساتویں اور آٹھویں جماعت کے طلبہ کو اردو پڑھائیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دوران تربیت وہ اردو کی مزید تعلیم بھی حاصل کرتے ہیں۔ اور اس طرح ان کی قابلیت میں قدرے اضافہ بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن ہماری تربیت گاہوں میں جو لوگ انہیں زبان اردو اور تدریس اردو کی تعلیم دینے پر مامور ہوتے ہیں وہ خود بالعموم منشی فاضل او ٹی۔ یا مڈل ایس۔ وی ہوتے ہیں اور اس طرح وہ بنیادی کمزوری جس کو ہم اجاگر کرنا چاہتے ہیں۔ مدرسین میں بدستور باقی رہتی ہے۔ اردو بول چال کو قطعی طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اور اردو کے اسباق کی تدریس کے دوران پنجابی بول چال روا رکھی جاتی ہے۔ ان کا لب و لہجہ نادرست اور تلفظ ناقص ہوتا ہے نصاب کی کتابوں کے بہت سے حصص ان کی سمجھ سے بالاتر ہوتے ہیں۔ چنانچہ بعض اشعار کی تشریح میں وہ وہ نکات بیان کیے جاتے ہیں اور الفاظ و محاورات کے وہ وہ معانی بتائے جاتے ہیں کہ ان کے پڑھائے ہوئے ہر سبق سے کئی کئی لطیفے جمع کیے جا سکتے ہیں۔ ان میں سے اکثریت شوقِ مطالعہ سے محروم ہوتی ہے۔ چنانچہ انشا پردازی ان کے لیے کٹھن اور استعمالِ سلیس امر محال ہوتا ہے۔ اسباق اردو نہایت فرسودہ طریق سے پڑھائے جاتے ہیں۔ الفاظ و محاورات کے استعمال اور قواعد کے اطلاقات کو وہ اکثر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ تحریری انشا کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جاتی، اور ان پہلوؤں سے غفلت کی تہ میں ان کی اپنی علمی کمزوری اور تعلیمی پسماندگی کا راز مضمر ہوتا ہے۔

منشی فاضل او ٹی اساتذہ کو معلمین اردو کی صف اول میں جگہ دی جاتی ہے اور ثانوی مدارس کی آخری جماعتوں کی اردو انہیں خاص طور پر تفویض کی جاتی ہے۔ وسطانی جماعتوں میں بھی انہیں ایس ا حضرات پر فوقیت دی جاتی ہے۔ ان اساتذہ نے او ٹی کی تربیت کہاں سے پائی؟ اس سوال کا

صرف وہی دے سکیں گے جو عنقریب پچپن سال کی عمر کو پہونچ کر ملازمت سے سبکدوش ہونے والے
ہیں، اس لیے کہ او ٹی کی تربیتی جماعت کو بند ہوئے ایک عرصہ ہو چکا ہے۔ اور اب نئے منشی فاضل
حضرات کو دو سال کے تدریسی تجربہ کے بعد محکمہ او۔ ٹی کی سند خاص عنایت فرما دیتا ہے۔ گویا جہاں تک
طریقۂ تعلیم اور اصول تعلیم سے بہرہ ور ہونے کا تعلق ہے۔ یہ لوگ محض کورے ہیں۔ اور اس لحاظ سے یہ
ایس وی اساتذہ سے بھی کم رتبہ ہیں ـــــ دوسرا سوال یہ کہ انہوں نے اردو کہاں تک پڑھی
اس کا جواب بھی وہی حضرات دے سکیں گے جو حسنِ اتفاق سے میٹرک یا مڈل پاس ہیں۔ ورنہ بہت سے
منشی فاضل اساتذہ ایسے نظر آئیں گے جنہوں نے اردو کی باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی اور اردو ادب
سے قطعًا ناواقف ہیں ـــ امتحان منشی فاضل کے کل آٹھ پرچے ہوتے ہیں۔ پہلے چھے پرچے فارسی کے
ہوتے ہیں اور انہی میں سے پاس ہونا لازمی ہوتا ہے۔ باقی دونوں غیر اہم پرچے اردو پر مشتمل ہوتے
ہیں۔ اور ان میں پرچوں کہ پاس ہونا لازمی نہیں ہوتا۔ اس لیے اکثر منشی فاضل اساتذہ ان پرچوں کا امتحان
دیے بغیر یا ان میں ناکام ہو کر منشی فاضل کی سند حاصل کر لیتے ہیں۔ منشی فاضل اساتذہ میں سے
جنہوں نے مڈل یا میٹرک تک اردو پڑھی ہوئی ہو۔ یا جو حسنِ اتفاق سے ادیب عالم وغیرہ پاس
ہوں، وہ تو خیر کسی طور تدریس اُردو کا کام چلا لیتے ہیں۔ لیکن ان منشی فاضل اساتذہ کو جو اردو زبان
اور اردو ادب سے بالکل نابلد ہوتے ہیں محض اس خیال سے کہ یہ فارسی کے عالم ہیں تدریس اردو کا کام
سونپنا اور وہ بھی فوقانی جماعتوں میں، اردو زبان پر ظلم اور مضمون اردو کے ساتھ انتہائی ناانصافی
ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ طریقِ تعلیم سے واقف ہونے کی شرط کے بعد تدریس زبان کے معاملے میں
ذوق سلیم اور شستہ مذاق کو امتحانی قابلیتوں اور سندوں سے زیادہ دخل ہے۔ لیکن جب تک
ایسا پیمانہ یا کسوٹی ہاتھ نہ آ جائے جس سے کسی کا ذوق سلیم ناپا یا پرکھا جا سکے۔ اس وقت تک
امتحانی قابلیتوں اور اسناد ہی پر فیصلہ کرنا پڑے گا۔ اور پھر ایسے آدمیوں کی تعداد بھی تو بہت کم ہوتی ہے
جو ادب پاروں کی تفہیم اور استحسان میں ذوق سلیم کے مالک ہوں سو ہمارے مدارس میں اکثریت
ایسے او ٹی حضرات کی ہے جو نہ تو صحیح معنوں میں تربیت یافتہ ہیں۔ ورنہ ہی ان کے پاس اردو کے

امتحانات پاس کرنے کی سندیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ اساتذہ جو تاریخ ادب اردو سے نابلد ہوں جو زبان اردو کی لسانی اور ادبی ترتیبوں سے ناواقف ہوں جو شعر فہمی اور سخن شناسی کا صحیح مذاق نہ رکھتے ہوں، وسطانی اور فوقانی جماعتوں میں تدریس اردو کے فرائض کو بطریق احسن سرانجام نہیں دے سکتے۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آخر وہ کونسی تدریسی قابلیت اور کونسی تعلیمی اسناد ہیں جن کی بنا پر انہیں تدریس اردو پر مامور کر دیا جاتا ہے۔ منشی فاضل، مضمون فارسی کا امتحان ہے اور اس کی سند کسی طور بھی اس بات پر دلالت نہیں کرتی کہ منشی فاضل حضرات کو اردو کا کام تفویض کر دیا جائے۔ پھر جب ہر مضمون کے لیے تربیت یافتہ اساتذہ کی تلاش ہوتی ہے۔ اردو کے معاملہ میں اعزازی یا سپیشل اسناد کس طرح کافی سمجھی جا سکتی ہیں، کیا دو سال کے تدریسی تجربہ کے بعد استاد بغیر تربیت کے کلیات تدریس زبان سے ہو جاتا ہے۔ کیا وہ تحصیل زبان کے سلسلے میں بچوں کے فطری اور اکتسابی قوی اور ان کے فرائض سے باخبر ہو جاتا ہے۔ کیا اسے اس بات کے جاننے کی حاجت نہیں رہتی کہ زبان کے نصاب اور اس کی تدریس میں ترتیب و تناسب اور دل چسپی ایسے اصولوں کی کیا اہمیت ہے۔ کیا وہ تیاری اسباق کے تمام طریقوں سے بغیر تربیت حاصل کیے شناسا ہو جاتا ہے۔

ایسے منشی فاضل او ٹی حضرات سے اردو کا کام لینا ایسا ہی ہے جیسے کسی مولوی فاضل کو تدریس فارسی کا کام سپرد کر دیا جائے۔ آج سے قبل تو انہیں اردو کے استاد ہونے کی وجہ سے اردو کا مستحق مقرر کر دیا جاتا تھا لیکن معلوم ہوا ہے کہ امسال بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن پنجاب نے اس سلسلے میں ایک مستحسن اقدام کیا ہے اور یہ خیال رکھا ہے کہ منشی فاضل حضرات کو صرف فارسی کے پرچے دیے جائیں اور اردو کے لیے ادیب فاضل منتخب کیے یا نہیں۔ یا وہ جنہوں نے بی۔اے یا ایم۔اے تک اردو پڑھی ہو۔ جب ایک ادیب فاضل سے فارسی پڑھانے کی توقع نہیں کی جاتی تو منشی فاضل حضرات سے اردو پڑھانے کی توقع محض اس لیے کی جاتی ہے کہ وہ اردو کے چند جملے بول یا لکھ سکتے ہیں۔ حالاں کہ زبان کے استاد کے لیے یہ ضروری شرط ہے کہ وہ زبان پر عبور رکھنے کے علاوہ اس کے ادب اور اس کی صرف و نحو سے کما حقہٗ واقف ہو۔ منشی فاضلوں کی صف میں بھی ہر شعبہ اور ہر زمرہ

کی طرح ایسے قابل لوگ موجود ہیں جو عام آدمیوں کی سطح سے بہت بلند اور ان سے مستثنیٰ ہیں۔
لیکن فیصد اکثریت کی حالت کے پیش نظر ہوگا۔

انہی او۔ ٹی مدرسین میں ہمیں ادیب فاضل اسنی حضرات بھی نظر آتے ہیں لیکن یہ خال خال
ہیں۔ بلاشبہ تدریس اردو کے لیے ان کا وجود منشی فاضل او۔ ٹی معلمین سے زیادہ بہتر اور موزوں ہے
اور جہاں تک اشاد اور زبان و ادب سے عدم واقفیت کا اعتراض ہے وہ ان پر وارد نہیں ہوتا لیکن
غیر تربیت یافتہ ہونے کی وجہ سے یہ لوگ بھی اصول تعلیم اور طریقہ تدریس زبان سے ناواقف ہوتے
ہیں۔ فوقانی جماعتوں میں اردو پڑھانے کے لیے بہترین اساتذہ وہ ہیں جو ایف اے یا بی۔ اے تک
اردو کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بی۔ ٹی میں تدریس اردو کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اور اسی طرح
وسطانی جماعتوں میں اردو پڑھانے کے لیے الف۔ اے۔ سی۔ ٹی، اساتذہ ایس وی مدرسین
بہت بہتر ثابت ہو سکتے ہیں۔ بشرطیکہ انہوں نے کم سے کم میٹرک تک اردو پڑھی ہو۔ لیکن
دقت یہ ہے کہ یہ استاد جب سی۔ ٹی اور بی۔ ٹی کی تربیت حاصل کرنے کے بعد مختلف مدارس
تعینات ہوتے ہیں تو انہیں شاذونادر اردو پڑھانے کا کام سپرد کیا جاتا ہے۔

افسران معائنہ کا تذکرہ ویسے تو ہمارے موضوع کی حدود سے خارج ہے لیکن چونکہ مرحلہ
کا کام کا جائزہ بھی بہت حد تک تعلیم کے معیار کو بڑھانے میں ممد و معاون ہوتا ہے۔ اس لیے
اس طبقہ کا سرسری سا تذکرہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ تدریس اردو کی جانچ پڑتال کا کام خواہ وہ
مدارس سے متعلق ہو یا ابتدائی مدارس سے۔ بالعموم اے۔ ڈی۔ آئی حضرات کے حصے آتا ہے۔ خاص
ابتدائی مدارس کے کام کا معائنہ تو کلی طور پر انہیں کے ذمے ہوتا ہے۔ بلکہ یہاں تک کہ بچوں کی سالانہ
انہی کے لیے ہوئے امتحانات کے نتیجے کے طور پر عمل میں آتی ہیں۔ اس لیے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے
اے۔ ڈی۔ آئی صاحبان تمام مضامین سے نہ صرف کما حقہ واقف ہوں بلکہ ان کی عملی تربیت
کر چکے ہیں جو ابتدائی مدارس میں نافذ اور رائج ہیں اور بلاشبہ اردو اور حساب دو ایسے
ہیں جنہیں اگر پوری ابتدائی تعلیم کا ماحصل قرار دے دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ پس انھ

تقاضا یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو اے۔ڈی۔آئی مقرر کیا جائے جو نہ صرف اردو کے اعلیٰ امتحانات پاس ہوں بلکہ ایام تربیت میں بھی انہوں نے اردو کو ایک اختیاری مضمون کی حیثیت سے لیا ہو اور اس طرح وہ حساب میں بھی تربیت یافتہ ہوں اور ان دونوں مضامین کی تدریس کا عملی تجربہ بھی رکھتے ہوں۔ تاکہ وہ یہ جائزہ لے سکیں کہ آیا مضمون اردو صحیح خطوط پر پڑھایا جا رہا ہے یا نہیں۔ لیکن اگر حقائق پر نظر ہو تو یہ معلوم ہوگا کہ اے۔ڈی۔آئی لگانے وقت ایسی کوئی بات اور ایسا کوئی معیار پیش نظر نہیں رکھا جاتا۔

ان حالات میں ہم مضمون اردو کی وقعت اور قدر و منزلت کو بڑھانے کے لیے کس قدر بلند بانگ دعاوی کریں۔ کتنا عمدہ نصاب وضع کریں کیسی عمدہ درسی کتب لکھوائیں اور چھپوائیں۔ نظام اوقات میں اردو کی گھنٹیوں کو بھی کھول کر بڑھا دیں۔ اردو کو بلند معیار پر لانا اور اس کی حقیقی اہمیت کو قائم کرنا اس وقت تک ممکن نہیں ہوگا جب تک کہ ہم تدریس اردو کا فرض ایسے اساتذہ کو تفویض نہ کر دیں جو اس کے اہل ہیں، اس لیے کہ نظام تعلیم میں استاد کو ایک بنیادی اور مرکزی حیثیت حاصل ہے اس کی عدم موجودگی سے بچوں کے لیے تعلیم کی ہر چیز بے کار۔ نصاب بے جان اور کتاب بے روح ہو جاتی ہے اور اس کی شخصیت اور موجودگی سے پورے عمل تعلیم میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ نصاب جاندار ہو جاتا ہے کتابوں میں روح پھونک جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ خام بنیاد کی صورت میں پختہ اور مضبوط عمارت کی توقع رکھنا حماقت کے مترادف ہے۔

پس تدریس اردو کی جملہ خامیوں کا علاج اور زبان اردو کے معیار کی بلندی کا راز اس بات میں مضمر ہے کہ بہتر سے بہتر اردو کے اساتذہ فراہم کیے جائیں۔ یہ یقیناً ایک عظیم اور کٹھن کام ہے اور یہ ممکن نہیں کہ سال دو سال میں تدریس اردو میں ایک انقلاب برپا کر دیں لیکن اگر ہم چاہیں تو اس تعمیری انقلاب اور اس اصلاحی پروگرام کی طرف ایک قدم بڑھا سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں ذیل میں چند ایک تجاویز پیش کرنے کی جسارت کی جاتی ہے۔

(۱) تمام تربیتی اداروں (نارمل اسکولز) میں تدریس اردو کے لیے ایسے اساتذہ مقرر کیے جائیں جو ایم۔اے (اردو) یا کم سے کم بی۔اے (اردو) یا بی اے ادیب فاضل (بی ٹی) ہوں

(۲) فوقانی جماعتوں میں اردو کی تدریس کا کام ان تربیت یافتہ گریجوایٹ اساتذہ کے سپرد کیا جائے جنہوں نے میٹرک، ایف۔ اے، یا بی۔ اے تک اردو پڑھی ہوئی ہو، یا بی اے (ادیب فاضل ہوں اور بی ٹی میں انہوں نے تدریس اردو بطور ایک انتخابی مضمون کے لے رکھا ہو (سنٹرل ماڈل اسکول میں انگلش سکیشن کے چند ایسے اساتذہ تدریس اردو کے فرائض انجام دے رہے ہیں)

(۳) وسطانی جماعتوں میں ایف۔ اے سی۔ ٹی حضرات سے بھی انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو کا کام لیا جائے۔

(۴) ابتدائی جماعتوں میں اردو کی تدریس کا کام غیر تربیت یافتہ اساتذہ کے سپرد نہ کیا جائے۔

(۵) جے وی میں ایسے اول درجہ میٹرک طلبہ داخل کیے جائیں جنہوں نے دسویں جماعت تک اردو پڑھی ہوئی ہو۔

(۶) ادیب فاضل حضرات کی حوصلہ افزائی کی جائے اور ادیب فاضل کی تیاری کرانے کے لیے بعض ثانوی مدارس کے ساتھ یک سالہ کورس کی جماعتیں کھولی جائیں اور اس میں ایسے طلبہ داخل ہوں جنہوں نے میٹرک کا امتحان اردو کے ساتھ پاس کیا ہو، یا میٹرک ادیب عالم ہوں۔

(۷) کسی تربیتی ادارے میں او ٹی کی تربیتی جماعت حسب سابق کھولی جائے اور اردو کی جماعت کے لیے میٹرک ادیب فاضل حضرات داخل کیے جائیں۔

(۸) اے ڈی آئی حضرات کے تقرر کے وقت ان لوگوں کو ترجیح دی جائے جو تدریس اردو کا عملی اور نظری تجربہ رکھتے ہوں۔ اور زبان اردو پر بھی انہیں عبور حاصل ہو۔

یہ ایک ایسا موضوع ہے کہ اس پر غور کرنے کے لیے چند عالی دماغ ماہرین تعلیم سر جوڑ کر بیٹھیں اور یہ سوچیں کہ آخر وہ کون سی تدابیر ہیں جن کے ذریعے ہم جلد سے جلد تدریس اردو کا کام زیادہ سے زیادہ قابل اور اہل اساتذہ کو تفویض کر کے اردو کے وقار اور معیار کو بلند کر سکتے ہیں۔

باٹا کا کارخانہ جلّو

احسان الحق

سیاحتوں کی تعلیمی افادیت مسلمہ ہے۔ بڑے شہروں میں واقع تعلیمی اداروں کو خصوصیت سے یہ سہولت حاصل ہے کہ جدید کارخانوں اور صنعتی مرکزوں کی سیر کر کے جدید صنعتی تکنیکوں کے متعلق واقفیت حاصل کریں۔ اس غرض کے لیے دسمبر کے پہلے ہفتے میں سنٹرل ٹریننگ کالج کے قریباً پچاس طلبہ کا ایک گروہ باٹا شو کمپنی جلّو کو دیکھنے گیا۔ اس سیر کی مختصر روداد نیچے دی جاتی ہے۔

چمڑا فیکٹری

اس فیکٹری میں تقریباً پانچ سو آدمی کام کرتے ہیں۔ اس فیکٹری کا عملہ مندرجہ ذیل آفیسروں پر مشتمل ہے:۔ (۱) ورک منیجر جو ان تمام پر نگرانی رکھتا ہے (۲) اسسٹنٹ منیجر (۳) گروپ فورمین (۴) اسسٹنٹ فورمین۔ ایک فورمین کے ماتحت تقریباً ۷۰ آدمی کام کرتے ہیں ان ۷۰ آدمیوں کے ایک گروپ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتے ہیں، ان میں سے آدھے سینے والے کاریگر — STI CHING MAN اور دوسرے آدھے بوٹ کے تلے بنانے والے (CONFECTION MAN) کہلاتے ہیں۔ سینے والے جو کہ سلائی میں صرف بوٹ کا اوپر والا حصہ (UPPER) تیار کرتے ہیں۔ اور بوٹ کے تلے تیار کرنے والے اپنے سیکشن میں بوٹ کا نچلا حصہ (BATTON) تیار کرتے ہیں۔ بوٹ کا اپر تیار کرنے کے لیے صرف سنگر مشین کام دیتی ہے۔ جو کہ عام گھریلو مشینوں سے دس ہزار گنا زیادہ طاقت رکھتی ہے۔ اپر سینے والے سیکشن میں ایک گھنٹے میں بوٹوں کے ایک سو جوڑے بوٹوں کے اپر تیار ہوتے ہیں۔ یہ سیکشن اپر تیار کر کے بیٹن سیکشن کے حوالے کر دیتا ہے۔ سب سے پہلے بوٹوں کا تلا ایک مشین کے ذریعے فرموں کے ناپ کے مطابق تیار کیا جاتا ہے، دوسری طرف بوٹ کا اوپر والا حصہ سائز کے مطابق تیار کیا جاتا ہے۔ پہلے (STEPLING) مشینی والا آدمی فرمے پر بوٹ کی اندرونی

کپڑے والی تہ لگاکر ایک مشین کے ذریعے جوکہ خود بخود چلتی رہتی ہے LASTING والے آدمی کے پاس پہونچا دیتا ہے۔ جوکہ اس کپڑے والی تہ کو فرمے پر اچھی طرح چسپاں کر دیتا ہے، وہاں سے پھر یہ جوتا PULL INGOUER مشین والے آدمی کے پاس چلا جاتا ہے (یہ ایک ایسی مشین ہے جو فرمے کے مطابق بوٹ کو پوری شکل دیتی ہے) اس کے بعد یہ بوٹ TOE LASTING مشین پر چلا جاتا ہے۔ اس مشین کا صرف یہ کام ہے کہ بوٹ کی ٹو کو اپنی اصلی شکل میں لاکر اس میں کچھ میخیں لگا دیتی ہے۔ اس کے بعد بوٹ SIALE LASTING مشین میں چلا جاتا ہے، یہ مشین بوٹ کے دائیں اور بائیں طرف دھاگے سے سلائی کر دیتی ہے پھر یہ بوٹ HEEL LASTING مشین پر چلا جاتا ہے یہ مشین بھی ٹو لاسٹنگ مشین کی طرح ایڑی کا سارا حصہ میخوں سے درست کر کے آگے DOWN COMVEYAR میں بھیج دیتا ہے۔ جہاں پر پورے ۲۴ گھنٹے یہ بوٹ بھاپ میں پڑا رہتا ہے۔ بھاپ اس کو بالکل خشک کر دیتی ہے۔ وہاں سے یہ جوتا دوہری سلائی والی مشین پر چلا جاتا ہے۔ وہ بوٹ کو تلا لگا کر سی دیتی ہے وہاں سے جوتا نکل کر ایڑی جوڑنے والی مشین پر چلا جاتا ہے۔ وہ مشین بوٹ کو ایڑی لگا دیتی ہے جو کہ پہلے علیحدہ تیار ہوئی ہوتی ہے۔ وہاں سے یہ جوتا TSIMING مشینوں اور POLISHING مشینوں پر سے گھومتا ہوا CONTROLLING کمپارٹمنٹ میں چلا جاتا ہے اور وہاں پر کنٹرولر مخصوص کوالٹی کے مطابق بوٹ پاس کر کے پیکنگ سیکشن میں بھیج دیتا ہے۔ اب بوٹ کو ڈبوں میں بند کر کے گودام میں بھیج دیا جاتا ہے۔ یہ ہے بوٹ کی مختصر سی سرگزشت۔

ربڑ فیکٹری

اس فیکٹری میں بھی بوٹ بالکل چمڑا فیکٹری ہی کی طرح تیار کیا جاتا ہے۔ یعنی بوٹ کا ہر حصہ علیحدہ علیحدہ تیار کیا جاتا ہے اور یہ حصے فرمے میں رکھ کر ربڑ کی لئی سے آپس میں جوڑ دیے جاتے ہیں۔ چمڑا فیکٹری اور ربڑ فیکٹری میں فرق صرف اتنا ہے کہ چمڑا فیکٹری میں بوٹ کو دھاگے سے سی دیا جاتا ہے اور بوٹ کو کم از کم ۲۴ گھنٹے بوائلر میں رکھا جاتا ہے۔ لیکن ربڑ فیکٹری میں بوٹ کو ربڑ کی لئی سے جوڑ دیا جاتا ہے اور بوائلر میں صرف ۸ گھنٹے رکھا جاتا ہے۔ باقی طریقہ تقریباً ایک جیسا ہی ہے

ٹائر اور ٹیوب فیکٹری

اب ہم آپ کو ٹائر اور ٹیوب فیکٹری میں لے چلتے ہیں۔ اس فیکٹری میں سب سے پہلے ربڑ مشین میں سے گذار کر پتلا کیا جاتا ہے، جب ربڑ کافی پتلا ہو جاتا ہے تو اس کو ٹیوب کے محیط کے برابر پرزے کی شکل دی جاتی ہے، اس کپڑے کو پھر جستی نالیوں کے گرد لپیٹ دیا جاتا ہے اور اس کے جوڑ کو ربڑ کی لئی سے مشین کے اندر ہی مرمت کیا جاتا ہے۔ پھر اس ربڑ ٹیوب کو سائیکل ٹیوب کے برابر کاٹ کر دوبارہ جستی نالیوں پر چڑھا دیا جاتا ہے، اور ان نالیوں کو ۴ گھنٹے کے لیے بوائلر میں رکھا جاتا ہے جہاں یہ ٹیوبیں پک جاتی ہیں۔ ان ٹیوبوں کو ہوا کے ذریعے جستی نالیوں سے اتارا جاتا ہے اور ٹیوب کے دونوں سروں کو لئی کے ساتھ جوڑا جاتا ہے۔ اس کے بعد ٹیوب میں والو ٹیوب لگا دی جاتی ہے اور ٹیوب میں ہوا بھر کر اس کو پانی میں دیکھا جاتا ہے کہ کہیں سے ہوا تو نہیں خارج ہو رہی۔ اس امتحان کے بعد ٹیوب کو خشک کر کے پیک کر دیا جاتا ہے۔

یہ تو تھا ٹیوب کا حال۔ ٹائر بنانے کے لیے پہلے سخت ربڑ کو مشینوں میں گذار کر نرم کیا جاتا پھر اور اس کو کالا رنگ بھی دیا جاتا ہے۔ پھر اس ربڑ کو ٹائر کے عرض کے مطابق موٹے کپڑے کی شکل دی جاتی ہے اس کے بعد ایک اور پتلا کپڑا لے کر اس پر پتلا پتلا ربڑ چڑھایا جاتا ہے اس کپڑے کو بھی ٹائر کے عرض کے مطابق کاٹا جاتا ہے۔ پھر اس کپڑے کو مشین کے ایک طرف رکھا جاتا ہے اور ربڑ کو دوسری طرف۔ اس مشین میں پہلے دو عدد گول لوہے کی تاریں جو کہ غیر ممالک سے منگوائی جاتی ہیں چڑھا دی جاتی ہیں۔ اس کے بعد مشین کو چلنے دیا جاتا ہے۔ پہلے چکر میں ان دونوں تاروں پر پتلا کپڑا جس پر ہلکا ہلکا ربڑ بھی چڑھا ہوا ہوتا ہے چڑھ جاتا ہے۔ اس کے بعد دوسرے چکر میں موٹے کپڑے کی شکل کا ربڑ اس پتلے کپڑے پر چسپاں کیا جاتا ہے۔ اب اس نامکمل ٹائر کو ایک مشین میں ۲½ منٹ کے لیے رکھا جاتا ہے جس میں اس ٹائر پر نقش و نگار بن جاتے ہیں جو کہ مشین میں POTTEU کی شکل میں لگے ہوتے ہیں اور اسی اثنا میں ٹائر پک بھی جاتا ہے۔ اب ٹائر بالکل تیار ہے۔

سرکاری جریدہ کے اعلانات

صیغہ اجمال ——————— شعبہ مدارس

۶۱۹۹ م۔ محمد لطیف منشی فاضل جے۔ اوی (۶۰ — ۱۴۰) معلم اردو گورنمنٹ ہائی اسکول

۱۹ فروری ۱۹۵۶ء کیمبل پور (آزمائشی) کو تاریخ حاضری سے م۔ عبدالمنان، مولوی فاضل او۔ ٹی معلم عربی

کی جگہ جو مستعفی ہو چکے ہیں معلم اردو گورنمنٹ ہائی اسکول خوشاب مقرر کیا گیا (آزمائشی)

// عبدالحی مولوی فاضل او۔ ٹی کو م۔ محمد لطیف کی جگہ جو تبدیل ہو چکے ہیں تاریخ حاضری سے

بطور قائم مقام معلم اردو گورنمنٹ ہائی اسکول کیمبل پور میں (۶۰ — ۱۴۰) کے پیمانہ

میں ۷۲ روپے ماہوار پر مقرر کیا گیا۔

۵۳۳۶ م۔ بدرالدین ایس۔ وی (۶۰ — ۱۴۰) معلم اردو گورنمنٹ ہائی اسکول کیمبل پور کو

۱۳ فروری ۱۹۵۶ء تاریخ حاضری سے م۔ مہرالدین ایس۔ وی کی جگہ جو کہ یکم جنوری سے مستعفی ہو چکے ہیں

معلم اردو گورنمنٹ ہائی اسکول شیخوپورہ میں اپنی تنخواہ پر مقرر کیا گیا۔

// غلام حسین ایس۔ وی امیدوار کو قائم مقام معلم اردو گورنمنٹ ہائی اسکول کیمبل پور (۶۰

— ۱۴۰) کے پیمانہ تنخواہ میں ۶۰ روپے ماہوار پر تاریخ حاضری سے م۔ بدرالدین

کی جگہ جو تبدیل ہو چکے ہیں مقرر کیا گیا۔

۵۱۴۵ م۔ محمد عبداللہ قریشی ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ — ۲۵۰) انگلش ماسٹر گورنمنٹ نارمل

۱۱ فروری ۱۹۵۶ء اسکول شاہ پور کو تاریخ حاضری سے م لطیف احمد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی

تنخواہ پر انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول منٹگمری مقرر کیا گیا۔

// م۔ لطیف احمد بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ — ۲۵۰) انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول

منٹگمری کو تاریخ حاضری سے م۔ محمد عبداللہ کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ

انگلش ماسٹر گورنمنٹ نارمل اسکول شاہ پور مقرر کیا گیا۔

۳۹۹۰ م۔ بشیر احمد باجوہ مولوی فاضل (۶۰ — ۱۴۰) عربی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول چکوال کو
۰ فروری ۵۷ء تاریخ حاضری سے م۔ محمد عبداللہ عربی ٹیچر کی جگہ جو ریٹائر ہو چکے ہیں اپنی تنخواہ پر عربی
مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول پسرور مقرر کیا گیا۔

" م۔ بشیر احمد ذوالنورین بی۔ اے مولوی فاضل ایک امیدوار کو تاریخ حاضری سے م۔ بشیر احمد
باجوہ کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے (۶۰ — ۱۴۰) کے عام پیمانہ تنخواہ میں ۸۰ روپے
ماہوار پر ۱۵ فروری ۱۹۵۷ء یا مابعد کی تاریخ حاضری سے قائم مقام عربی مدرس گورنمنٹ
ہائی اسکول چکوال مقرر کیا گیا۔

۴۸۷۲ محمد انور نثار (۹۰ — ۱۹۰) ڈرائنگ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول ننکانہ کو جن کی تبدیلی کے
۹ فروری ۵۷ء احکام برائے چونیاں جاری ہو چکے تھے تاریخ حاضری سے م۔ محمد طفیل کی جگہ جن کا تبادلہ
ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر ڈرائنگ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول شیخوپورہ مقرر کیا گیا۔

" م۔ محمد طفیل ڈرائنگ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول شیخوپورہ (۱۵۰ — ۲۵۰) کو
م۔ عبدالواحد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر ڈرائنگ ماسٹر گورنمنٹ ہائی
اسکول چونیاں (رخصتی) مقرر کیا گیا۔

۶۱۰ م۔ دلدار علی دلاوری (۲۵۰ — ۳۵۵) ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول پنڈ دادن خان
۲ جنوری ۵۸ء کو یکم اپریل ۵۸ء سے ایک نئی اسامی پر پی ای ایس کے دوم درجہ میں (۲۵۰ — [illegible])
میں ترقی دی گئی۔

" م۔ علی احمد ارشد (۲۵۰ — ۳۵۵) ڈسٹرکٹ انسپکٹر میانوالی کو یکم اپریل ۵۸ء
سے م۔ محمد ابراہیم شمیم کی جگہ پی۔ ای ایس (۲۵۰ — ۷۵۰) درجہ دوم میں (قائم مقام)
ترقی دی گئی۔

" س۔ الہ دین علی شاہ (۲۵۰ — ۳۵۵) ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ نارمل اسکول تعصور کو

یکم اپریل ۱۹۵۸ء سے ایک منظور شدہ خالی جگہ پر پی۔ای۔ایس درجہ دوم (۲۵۰ — ۷۵۰)
قائم مقام میں ترقی دی گئی۔

۶۱۰ م۔ لالہ چند (۲۵۰ — ۳۵۵) ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول باغبانپورہ کو ۳ جولائی
۱۹۵۸ء تک م۔ آئی شیمہ کی جگہ پی ای ایس درجہ دوم (۲۵۰ — ۳۵۵) قائم مقام (۲ جنوری ۱۹۵۸ء)
میں ترقی دی گئی اور ۳ جولائی ۱۹۵۸ء سے م۔ محمد شفیع کی جگہ پی ای ایس درجہ دوم میں
ایک سال کے لیے آزمائشی ترقی دی گئی۔

〃 م۔ غلام حسین ڈسٹرکٹ انسپکٹر راولپنڈی کو ۱۳ ستمبر ۱۹۵۸ء سے غلام یاسین نیازی کی
جگہ پی ای ایس درجہ دوم میں (۲۵۰ — ۷۵۰) ایک سال کے لیے آزمائشی ترقی دی گئی

〃 م۔ اللہ بخش ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول تونسہ کو (جو ۲۵ جنوری ۱۹۵۸ء سے سبکدوش
ہو چکے ہیں) کو ۲۷ جنوری ۱۹۵۸ء سے ایک عارضی آسامی پر پی ای ایس درجہ
دوم میں (۲۵۰ — ۷۵۰) ترقی دی گئی۔

〃 م۔ غفور اللہ ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ نارمل اسکول کمالیہ کو ۳ جولائی ۱۹۵۸ء سے م۔ آئی
شیمہ کی جگہ پی۔ای ایس درجہ دوم (۲۵۰ — ۷۵۰) میں قائم مقام طور پر ترقی
دی گئی۔

〃 م۔ ظہور الحق فاروقی ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ نارمل اسکول قصور کو ۱۲ مارچ ۱۹۵۸ء
سے م۔ شبیر حسین کی جگہ پی۔ای۔ایس درجہ دوم (۲۵۰ — ۷۵۰) میں ایک سال
کے لیے آزمائشی ترقی دی گئی۔

〃 بہادر علی شاہ ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول سانگلہ کو م عبدالغنی شیدا پی۔ای۔ایس
درجہ دوم ریٹائرڈ کی جگہ ایک سال کے لیے آزمائشی ترقی دی گئی۔

〃 م۔ سعید علی ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ٹیکنیکل ہائی اسکول لائلپور کو اللہ بخش پی ای ایس
درجہ دوم آزمائشی ریٹائرڈ کی جگہ ایک سال کے آزمائشی ترقی دی گئی۔

؍؍ م۔ اصغر علی ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ نارمل اسکول شاہ پور صدر کو م۔ عبدالرشید پی۔ ای ایس درجہ دوم کی جگہ جو سبکدوش ہو چکے ہیں ایک سال کے لیے آزمائشی ترقی دی گئی۔

؍؍ م۔ نتھ خیر خاں ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول جانیوالا کو (جو کہ یکم جنوری ۵۸ء کو سبکدوش ہو چکے ہیں) کرم انور علی شاہ (متوفی ۲۷ فروری ۵۸ء) پی۔ ای۔ ایس درجہ دوم ۲۵۰ ــ ۷۵۰) کی جگہ ایک سال کے لیے آزمائشی مقرر کیا گیا۔

۳۶۲۳ منصور احمد (۲۵۰ ــ ۳۵۵) ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول علی پور کو تاریخ حاضری سے
۱۰ دسمبر ۵۸ء م۔ محمد امیر عالم کی جگہ جو سبکدوش ہو چکے ہیں اپنی تنخواہ پر ہیڈ ماسٹر ہائی اسکول چونیاں مقرر کیا گیا۔

؍؍ چ۔ عبدالعزیز (۲۵۰ ــ ۳۵۵) اے۔ ڈی۔ آئی مدارس لائل پور کو تاریخ حاضری سے م۔ منظور احمد کی جگہ جو تبدیل ہو چکے ہیں اپنی تنخواہ پر ہیڈ ماسٹر ہائی اسکول علی پور مقرر کیا گیا۔

؍؍ م۔ انور علی قریشی (۲۵۰ ــ ۳۵۵) سیکنڈ ماسٹر گورنمنٹ سنٹرل ماڈل ہائی اسکول لاہور کو تاریخ حاضری سے بشیر احمد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول ساہی وال مقرر کیا گیا۔

؍؍ م۔ رشید احمد (۲۵۰ ــ ۳۵۵) ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول ساہی وال کو تاریخ حاضری سے م۔ محمد اسحاق کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول مظفر آباد مقرر کیا گیا۔

؍؍ ش۔ طالع مند (۲۵۰ ــ ۳۵۵) ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول قصور کو تاریخ حاضری سے م۔ انعام علی کی جگہ جو سبکدوش ہو چکے ہیں اپنی تنخواہ پر ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی باغبان پورہ مقرر کیا گیا۔

؍؍ م۔ نعمت علی خاں (۲۵۰ ــ ۳۵۵) سیکنڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول شاہ پور صدر کو

تاریخ حاضری سے م شیر محمد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول لیہ مقرر کیا گیا۔

۳۶۷۳۸ — ج بسلطان احمد (۲۵۰ — ۳۵۵) اے ڈی آئی راولپنڈی کو تاریخ حاضری سے

۱۵ دسمبر ۵۶ء — م شیر بہادر کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول عیسے خیل مقرر کیا گیا۔

" م فضل کریم (۲۵۰ — ۳۵۵) ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول کروڑ پکا کو یکم جنوری ۵۶ء یا مابعد کی تاریخ حاضری سے م فتح شیر خاں کی جگہ جو ۱ جنوری ۵۶ء سے سبکدوش ہونے والے ہیں اپنی تنخواہ پر ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول خانیوال مقرر کیا گیا۔

" م بشیر عالم (۲۵۰ — ۳۵۵) اے۔ڈی۔آئی کیمبل پور کو تاریخ حاضری سے م امیر الدین کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول حضرو مقرر کیا گیا۔

صیغہ نسوانہ ——— شعبہ مدارس

۱۵۰۸۴ مسز اختری خانم ایف۔اے۔ جے۔ اے۔وی ایک امیدوار کو ۲۶ مارچ ۵۶ء

۲۳ اپریل ۵۶ء — قبل دوپہر سے ایک خالی آسامی پر (۷۵ — ۱۵۰) کے عام پیمانہ تنخواہ میں قائم مقام نائب معلمہ گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول ڈسکہ مقرر کیا گیا۔

۱۴۸۶۷ مس شوکت شاد ملک ایف۔سی۔ٹی ایک امیدوار کو ۲۵ فروری ۵۶ء قبل دوپہر

۱۹ اپریل ۵۶ء — سے تین آسامیوں میں سے ایک خالی شدہ آسامی پر (۷۵ — ۱۵۰) کے پیمانہ تنخواہ میں بھتہ ہو۔ ۹ روپے ماہوار پر قائم مقام نائب معلمہ گورنمنٹ گرلز نارمل اسکول جوہر آباد مقرر کیا گیا۔

" مس انور ریحانہ منتی جے۔ اے۔وی ایک امیدوار کو ۱۷ مارچ ۵۶ء قبل دوپہر سے بجائے مس معراج بیگم کے جن کا تبادلہ ہو چکا ہے (۷۵ — ۱۵۰) کے عام پیمانہ تنخواہ میں قائم مقام نائب معلمہ گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول پنڈی گھیب مقرر کیا گیا۔

۸۰۸ ،۱۳۰۱ مس نسیم بیگم میٹرک ایس۔ وی (۶۰ ۔ ۱۴۰) معلمہ اردو گورنمنٹ گرلز ہائی سیکنڈری
۱۸ اپریل ۵۶ء نارمل اسکول منٹگمری کو تاریخ حاضری سے ایک زائد آسامی پر اپنی تنخواہ پر معلمہ
اردو ولیڈی میکلیگن گرلز ہائی اسکول لاہور مقرر کیا گیا۔

مس الیاس اختر میٹرک ۔ ایس۔ وی۔ ایک امیدوار کو ۱۱ جنوری ۵۶ء سے ۔
مس کے ۔ اے مرزا بیے ۔ اے ۔ وی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے (۶۰ ۔ ۱۴۰) کے
عام پیمانہ تنخواہ میں تین زائد ترقیاں دے کر معلمہ اردو گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول گوجرہ
ضلع لائل پور مقرر کیا گیا۔

،، مس نسیم اقبال میٹرک ایس۔ وی ایک امیدوار کو ۱۷ اکتوبر ۵۵ء سے ایک ایس وی
آسامی پر (۶۰ ۔ ۱۴۰) کے عام پیمانہ تنخواہ میں ۷۲ روپے ماہوار پر اردو معلمہ گورنمنٹ
گرلز مڈل اسکول شورکوٹ مقرر کیا گیا۔

،، مس امینہ بیگم مڈل ایس۔ وی ایک امیدوار کو ۲۴ اکتوبر سے ایک خالی آسامی پر
۶۰ ۔ ۱۴۰ کے عام پیمانہ تنخواہ میں قائم مقام اردو معلمہ گورنمنٹ گرلز مڈل اسکول
شورکوٹ مقرر کیا گیا۔

،، مس الماس پروین اختر میٹرک ایس۔ وی۔ ایک امیدوار کو ۲۲ دسمبر ۵۵ء سے
ایک زائد منظور شدہ آسامی پر (۶۰ ۔ ۱۴۰) کے عام پیمانہ تنخواہ میں ۷۲ روپے
ماہوار پر قائم مقام اردو معلمہ گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول ملتان مقرر کیا گیا۔

،، مس سعیدہ خانم میٹرک ایس۔ وی ایک امیدوار کو ۲ جنوری ۵۶ء سے ایک زائد
منظور شدہ آسامی پر (۶۰ ۔ ۱۴۰) کے عام پیمانہ تنخواہ میں ۷۲ روپے ماہوار پر
قائم مقام اردو معلمہ گورنمنٹ گرلز ہائی اور نارمل اسکول مظفر گڑھ مقرر کیا گیا۔

،، مسماۃ عزیزہ عصمت میٹرک ایس۔ وی ایک امیدوار کو ۴ جنوری ۵۶ء سے استانی
امت السلمیٰ کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے (۶۰ ۔ ۱۴۰) کے عام پیمانہ تنخواہ میں

۲۰۰ روپے ماہوار پر قائم مقام اردو معلمہ گورنمنٹ گرلز نارمل اسکول لاہور سے مقرر کیا گیا

۱۱۰۸۹ مس خورشید چوہدری ایف۔ اے۔ سی۔ ٹی ایک امیدوار کو مسز ایچ ایچ بھاٹی کی جگہ
۲۹ مارچ ۱۹۵۶ء جو مستعفی ہو چکی ہیں ۲۱ مارچ ۱۹۵۶ء سے (۵۰ ــ ۵ ــ ۱۵۰) کے عام پیمانہ تنخواہ میں
۹۰ روپے ماہوار پر قائم مقام نائب معلمہ گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول میاں چنوں مقرر کیا گیا۔

۱۱۱۳۷ مس رشیدہ بیگم بی۔ اے (بی۔ اے۔ بی۔ ٹی) (۱۳۰ ــ ۲۵۰) نائب معلمہ گورنمنٹ
۲۹ مارچ ۱۹۵۶ء گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول شکرگڑھ کو تاریخ حاضری سے مس ممتاز ملک کی جگہ جو ڈسکہ میں
صدر معلمہ مقرر کی جا چکی ہیں اپنی تنخواہ پر نائب معلمہ لیڈی اینڈرسن گورنمنٹ ہائی اسکول
سیالکوٹ مقرر کیا گیا۔

۱۰۴۵۷ مسز ناصری۔ اے۔ بی۔ ٹی صدر معلمہ گورنمنٹ گرلز ہائی اور نارمل اسکول ملاول منڈی کو
۲۷ مارچ ۱۹۵۶ء ایک موجودہ آسامی پر (۲۵۰ ــ ۳۵۵) کے پیمانہ تنخواہ سے پی۔ ای۔ ایس
درجہ دوم (۲۵۰ ــ ۷۵۰) میں ۳۱ مارچ ۱۹۵۵ء سے ترقی دی گئی۔

٫ مسز ایم۔ آر۔ چوہدری بی۔ اے۔ بی۔ ٹی صدر معلمہ گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول لائل پور کو ۲۵۰ ــ
۳۵۵ کے گریڈ سے ایک خالی شدہ آسامی پر یکم اپریل ۱۹۵۵ء سے ۱۷ جون ۱۹۵۵ء تک
پی۔ ای۔ ایس درجہ دوم (۲۵۰ ــ ۷۵۰) میں ترقی دی گئی۔

۱۰۶۳۰ مس زہرہ حسین بٹ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ ــ ۲۵۰) نائب معلمہ گورنمنٹ گرلز ہائی
۲۷ مارچ ۱۹۵۶ء اور نارمل اسکول کو ایک نئی منظور شدہ آسامی پر یکم فروری ۱۹۵۶ء قبل دوپہر سے اپنی تنخواہ پر
صدر معلمہ گورنمنٹ گرلز مڈل اسکول کھلوال مقرر کیا گیا۔

۹۵۱۸ مسز عنایت اللہ جے۔ اے۔ وی (۵۰ ــ ۵ ــ ۱۵۰) کو یکم اپریل ۱۹۵۵ء سے ایک موجودہ
۱۷ فروری ۱۹۵۶ء آسامی پر اپنے حالیہ گریڈ سے (۱۲۰ ــ ۲۵۰) کے گریڈ میں ترقی دی گئی۔

مسز عنایت علی جے۔ اے۔ وی (۵۰ ــ ۵ ــ ۱۵۰) نائب معلمہ گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول
اور نارمل اسکول جہلم کو ۹ مارچ ۱۹۵۶ء سے ایک موجودہ آسامی پر (۱۲۰ ــ ۲۵۰) کے

آموزش

گریڈ میں ترقی دی گئی -

۹۸۲۵ مس حمیدہ بیگم (۷۵ — ۱۵۰) نائب معلمہ گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول گوجرانوالہ کو
۱۵ فروری ۱۹۶۶ء ۱۹ مارچ ۱۹۶۶ء سے ایک موجودہ آسامی پر (۱۷۰ — ۲۵۰) کے گریڈ میں ترقی
دی گئی -

〃 مسز ممتاز شوکت بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ — ۲۵۰) صدر معلمہ گورنمنٹ گرلز ہائی
اسکول پنڈدادن خاں کو تاریخ حاضری سے مسز ایس۔ ایم کی خالی جگہ پر اور
اپنی تنخواہ پر صدر معلمہ گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول سیال چنیوٹ مقرر کیا گیا -

〃 مسز سعیدہ صغریٰ بخاری بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۳۰ — ۲۵۰) نائب معلمہ گورنمنٹ گرلز
ہائی اسکول پنڈدادن خاں کو مسز ایم شوکت کے سبکدوش ہونے کی تاریخ سے (اپنی
تنخواہ + ۵۰ روپے خاص الاؤنس پر) قائم مقام صدر معلمہ گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول
پنڈدادن خاں مقرر کیا گیا -

Regd. No. L. 5327

پنجاب ایجو کیشنل جرنل

اور

آموزش (اردو)

۱ - پاکستا بھر میں یہ دو ہی تعلیمی رسالے ھیں - جنکو سرکاری سرپرستی اور امداد حاصل ہے -

۲ - پاکستان بھر میں یہی دو تعلیمی رسالے ھیں - جو مرکزی اور صوبائی درسگاھوں اور تعلیمی حلقوں میں مقبول ھیں -

۳ - ان رسالوں کے متعلق ادارتی خطوط اور چھپنے والے مضامین ایڈیٹر (پرنسپل) سنٹرل ٹریننگ کالج لاھور کو بھیجے جائیں - ان رسالوں میں چھپے ہوئے مضامین کیلئے معاوضہ دیا جاتا ہے -

۴ - یہ رسالے ھر مہینے کے دوسرے ھفتہ میں چھپتے ھیں اور ان کا چندہ آٹھ روپیہ (انگریزی) اور چھ روپیہ (اردو) ہے - جو کہ منیجر کو بھیجنا چاھئے -

۵ - ان رسالوں میں اشتہار دینے سے آپکی اشیاء مقبول ہونگی - تجارتی معاملات کیلئے خط و کتابت منیجر سے کریں -

منیجر
پنجاب ایجو کیشنل جرنل
اموزش
۲ کچہری روڈ - لاھور (پاکستان)

آموزش

جلد ۹ شمارہ ۲] لاہور [

اس شمارہ میں

تعلیمی ماہنامہ

آموزش

لاہور

مئی سنہ ۱۹۵۶ء

جلد ——— ۹

شمارہ ——— ۲

سالانہ چندہ

پاکستان کے لیے ۶ روپے

غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشر

یونی ورسٹی بک ایجنسی لاہور

آر۔ ایچ۔ ڈی ہ، خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کے
یونی ورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

اداریہ

تعلیمی معیار

ایم۔ اے مخدومی

تعلیمی معیاروں کے دن بدن پست ہونے کی شکایت بہت عام ہے، اس کی وجہ صرف یہی نہیں کہ ہمارے فارغ التحصیل نوجوان عموماً ان توقعات کو پورا نہیں کرتے جو بجا طور پر ان سے وابستہ ہوتی ہیں۔ بلکہ اس شکایت کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے عام امتحانوں میں کامیاب ہونے والے امیدواروں کی فیصد تناسب گرتا جارہا ہے۔

اس سال میٹرک کے امتحان میں پچیس ہزار سے کچھ اوپر امیدوار شامل ہوئے تھے، ان میں سے تقریباً آدھے کامیاب ہوئے ہیں۔ کامیاب طلبہ کا فی صد تناسب پچھلے سال سے بھی کم ہو گیا ہے۔ یہ امر بہت تشویشناک ہے۔ خالص تعلیمی نقطۂ نگاہ سے امتحانی نتائج کو پہلا درجہ حاصل نہیں مگر اس بات سے انکار محال ہے کہ موجودہ حالات میں یہ نتائج اساتذہ اور طلبہ کی کارکردگی کا واحد آئینہ ہیں۔ یہ بات یقیناً ناپسندیدہ ہے کہ سستے خلاصوں اور دوسرے قابل اعتراض طریقوں کو ذریعہ بناکر اچھے نتائج دکھائے جائیں، لیکن اسی قدر ناپسندیدہ یہ بات بھی ہے کہ جو ادارے دس سال تک طلبہ اور طالبات کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری سنبھالے رہیں وہ اس دس سالہ کارکردگی کے آخری جائزے کے بارے میں غافل ہو جائیں۔

یہ امر صحیح ہے کہ تعداد طلبہ کے یکدم بڑھ جانے سے اکثر مدرسوں کے لیے کافی ٹیڑھے مسائل پیدا ہو گئے ہیں، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایسے مدرسے بھی موجود ہیں جو ان ٹیڑھے مسائل کے باوجود اچھے نتائج دکھاتے ہیں۔ تدریس میں اہم ترین شے استاد اور شاگرد کا ذاتی رشتہ ہے۔ ہجوم طلبہ نے اس ذاتی رشتہ کی صحت مند نشوونما کے راستے میں مشکلات پیدا کر دی ہیں لیکن اسے ناممکن نہیں بنایا۔ طلبہ کی بھیڑ کے علاوہ آج اور بھی بہت سے ایسے عناصر پیدا ہو گئے ہیں جو استاد اور شاگرد کے ذاتی مراسم کا گلا گھونٹ رہے ہیں، نجی معلمی اور دوسرے کاروباری حربے

انہی عناصر میں شامل ہیں۔

اس میں کلام نہیں کہ آج سے چند دہائیاں پہلے مدرسوں میں طلبہ کی تعداد نسبتاً کم تھی۔ مگر اس کے ساتھ ہی ان دنوں کے عام استاد کا طرۂ امتیاز یہ تھا کہ وہ ہر طالب علم کی ترقی اور بالیدگی کے لیے ایسا ہی حریص نظر آتا تھا جیسے خود اپنی بہبود کے لیے۔ ہمارے نوجوان استادوں کو یہ بھولا ہوا بھینہ ورانہ سبق پھر سے یاد کرنا چاہیے۔ یہ سبق اسلامی تعلیمی روایات کی ہمیشہ جان رہا ہے، آج بھی اس پر عمل پیرا ہو کر بہت سی مشکلات پر قابو پایا جا سکتا ہے، اور تعلیمی معیاروں میں نمایاں بلندی پیدا کی جا سکتی ہے۔ بے شک ہر استاد اس دن کے لیے چشم براہ ہے جب کہ مکانیت اور ساز و سامان کی سہولتیں ہر جماعت میں طلبہ کی ایک معقول تعداد کو ممکن بنا دیں گی۔ مگر جب تک ایسا نہیں ہو سکتا اس وقت تک استادوں کو اس کمی کی تلافی اپنے خلوص اور جذبۂ عمل سے ہی کرنی چاہیے ❖

جماعت کے کمرے میں

فضل احمد

انگریزی میں ایک مشہور ضرب المثل ہے کہ جس کام کا آغاز اچھا ہو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ کام آدھا ختم ہو گیا۔ اس ضرب المثل کی اہمیت استاد کے لیے اور بالخصوص نو آموز استاد کے لیے بہت بڑی ہے۔ بہت سے نوجوان استاد کالجوں سے نیا علم، نئی نگاہ اور نیا جوش عمل لے کر نکلتے ہیں۔ وہ اس بات کے لیے بے تاب ہوتے ہیں کہ جو کچھ انھیں معلوم ہے وہ ان کے شاگردوں کو بھی معلوم ہو جائے۔ اس دھن میں وہ اکثر یہ بھول جاتے ہیں کہ ان کے اور طلبہ کے درمیان ذہنی پس منظر کی ایک چوڑی خلیج حائل ہے اور جب تک وہ طلبہ کی ذہنی سطح پر اتر کر کام کرنا نہیں سیکھتے اس وقت تک طلبہ ان کی بات کو نہیں سمجھ سکیں گے۔ بہت سے استاد اس اہم نکتہ کو فراموش کر دیتے ہیں جس سے عجیب و غریب لطائف پیدا ہو جاتے ہیں۔ ذیل میں چند ایسے لطائف کا ذکر کیا جا رہا ہے جو ۱۹۵۷ء کی طویل تدریسی مشق کے دوران میں دیکھنے میں آئے۔

(۱) جماعت دہم مضمون ریاضی (مشق کا حصہ)

استاد:۔ اچھا تو یہ سوال سب کی سمجھ میں آ گیا؟

چند آوازیں:۔ جی ہاں۔

استاد:۔ تو اب اسی قسم کا ایک اور سوال حل کرو (تختہ تحریر پر سے حل شدہ سوال مٹا دیا جاتا ہے)

ایک رقم پر جو ۳ سال بعد واجب الادا تھی ۴ فی صد سالانہ شرح سے ۱۲۷ پونڈ ۸ شلنگ کٹوتی دینا پڑی، بتاؤ رقم کس قدر تھی؟

چند آوازیں:۔ ماسٹر صاحب! یہ سوال تختہ تحریر پر لکھ دیجیے ہم رقم اچھی طرح سمجھ نہیں سکے۔

(استاد تختہ تحریر پر سوال کی رقم لکھ دیتا ہے)

نگران :- بھئی تم میں سے جو اس سوال کو حل نہیں کر سکتے وہ کھڑے ہو جائیں۔

چند لڑکے پس و پیش کے عالم میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ باقی لڑکے بے معنی طور پر ادھر ادھر تکنے لگتے ہیں۔

نگران :- معلوم ہوتا ہے تم میں سے بہتوں کو اس سوال کے حل کرنے کا طریقہ نہیں ... اچھا ماسٹر جی نے جو سوال ابھی تختہ سیاہ پر سمجھایا تھا اسے کتنے لڑکے دوبارہ حل کر سکتے ہیں۔

(صرف چند ہاتھ کھڑے ہوتے ہیں)

ہاں ہاں جو لڑکے پچھلے سوال کا حل نہیں سمجھ سکے وہ کھڑے ہو جائیں۔

(تقریباً دو تہائی جماعت کھڑی ہو جاتی ہے)

دیکھو بھئی یہ بات تو بہت افسوسناک ہے۔ اگر تمہیں حل کے کسی حصہ کی سمجھ نہیں آئی تھی۔ تو تم نے اسی وقت ماسٹر جی سے کیوں نہ کہہ دیا کہ صاحب یہ عمل کس طرح کیا گیا ہے؟ یا اس کا مقصد کیا ہے؟

(طلبہ چپ چاپ کھڑے رہتے ہیں)

خوب! اب آپ سب بیٹھیں۔ تو اب موجودہ سوال کی عبارت پر غور کرو۔

(طلبہ منٹ بھر کے لیے تختہ تحریر کی عبارت کو توجہ سے دیکھتے ہیں)

اب بتاؤ اس عبارت سے تم کیا سمجھتے ہو؟

(درجن بھر کے قریب لڑکے ہاتھ اٹھاتے ہیں)

اچھا تم بتاؤ (ایک لڑکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے)

لڑکا :- ایک رقم اگر چار سال کے لیے قرض دے دی جائے اور شرح سود ½ ۲ فی صد ہو تو بتاؤ کہ اس رقم میں سے کس قدر کاٹ لیا جائے گا۔

نگران :- یہ جواب تو بالکل بے معنی ہے۔ رقم قرض پر دیے جانے سے بڑھا کرتی ہے، اس میں سے کچھ کٹتا نہیں۔

دوسرا لڑکا :۔ نہیں جناب بالکل زر دیا ہوا ہے اور ہمیں اصل زر معلوم کرنا ہے۔

نگران :۔ تو کیا یہ سود کا سوال ہے ؟

تیسرا لڑکا :۔ اس میں سود کا قاعدہ استعمال ہوتا ہے مگر یہ سود کا سوال نہیں ہے۔

چوتھا لڑکا :۔ جو رقم واجب الادا ہے وہ دراصل چار سال کے بعد ادا کی جائے گی۔ اگر اسے اب ادا کیا جائے تو اس سے تھوڑی رقم ہی ملے گی۔

نگران :۔ ہاں یہ ٹھیک ہے۔ مگر اس قسم کا لین دین کبھی زندگی میں ہوتا بھی دیکھا ہے ؟

پانچواں لڑکا :۔ جی ہاں۔ اگر ہم بازار سے کوئی چیز نقد خریدیں تو وہ سستی ملے گی۔ لیکن اگر ادھار خریدیں تو زیادہ قیمت ادا کرنا پڑے گی۔

نگران :۔ یہ بات پوری طرح درست نہیں ہے۔ پرچون خریداری میں اگر کبھی کبھار کوئی چیز ادھار بھی خرید لی جائے تو عام طور پر زیادہ قیمت ادا کرنا نہیں پڑتی۔ ہم حساب کے جس قاعدے سے بحث کر رہے ہیں اس کا تعلق پرچون خریداری سے نہیں ہے۔

چھٹا لڑکا :۔ تو اس کا تعلق اور کس قسم کی خریداری سے ہے۔

نگران :۔ اس کا تعلق بڑے بڑے بیوپاریوں کے لین دین سے ہے۔ فرض کرو کہ لاہور کا ایک بیوپاری کراچی کے ایک سوداگر سے دو لاکھ روپے کا لوہے کا مال منگانا چاہتا ہے۔ اگرچہ وہ اچھا بڑا کاروباری آدمی ہے۔ پھر بھی بیوپاریوں کے پاس نقد روپیہ کم ہوتا ہے ان کا سرمایہ زیادہ تر کاروبار میں لگا رہتا ہے۔ لہٰذا لاہور کا بیوپاری دو لاکھ کے مال کی نقد ادائیگی نہیں کرے گا۔ بلکہ وہ کراچی کے سوداگر سے پہلے ہی طے کرلے گا کہ مال کی قیمت ایک سال بعد ادا کی جائے گی۔ وقت کی یہ مہلت عموماً اتنی لمبی ہوتی ہے جس میں بیوپاری مال بیچ کر نقد روپیہ فراہم کر لیتا ہے۔

ایک لڑکا :۔ خریدار کے لیے تو یہ صورت حال بہت اچھی ہے۔ مگر مال بیچنے والے کا روپیہ ایک لمبے عرصے کے لیے پھنس جاتا ہے۔

ران - تم بالکل درست کہتے ہو۔ مثلاً اس مثال میں کراچی کے سوداگر کا دو لاکھ روپیہ پورے
ایک سال کے لیے پھنس کر رہ گیا ہے۔ مگر کاروبار کے لیے اسے ابھی نقد روپے کی ضرورت
ہے۔ یہ نقد روپیہ کہاں سے آئے؟

(لڑکے حیرانی میں ایک دوسرے کا منہ تکتے ہیں)

اس میں حیرانی کی کوئی خاص بات نہیں۔ کراچی کا سوداگر لاہور کے بیوپاری کے نام ۲ لاکھ روپے کا بل بھیجتا ہے جس پر لکھا ہوتا ہے۔ "ایک سال بعد واجب الادا" (لاہور کا بیوپاری اس ادائیگی کو تسلیم کرکے یہ بل کراچی کے سوداگر کو لوٹا دیتا ہے) یہ بل "ہنڈی" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اب اگر کراچی کے سوداگر کو روپے کی فوری ضرورت محسوس ہو تو وہ دو لاکھ کی یہ ہنڈی کسی بینک کار کے پاس لے جائے گا کہ وہ اسے خرید لے۔ تمہارے خیال میں؟ بینک کار یہ ہنڈی کس غرض سے خریدے گا؟

ایک لڑکا:- نفع کی غرض سے۔

نگران - ہاں نفع کی غرض سے۔ بھلا وہ دو لاکھ کی اس ہنڈی کے لیے کس قدر ادا کرے گا؟

ایک لڑکا:- بہرصورت دو لاکھ روپے سے کم ہی ادا کرے گا۔

نگران:- بالکل درست وہ دو لاکھ روپے میں سے کچھ رقم کاٹ کر باقی رقم ادا کرے گا۔ یہ کٹوتی ہے جو اس ہنڈی میں سے وضع کی جائے گی۔

ایک لڑکا:- یہ کٹوتی ہوگی کس قدر؟

نگران:- اس بات کا انحصار ہنڈی کی کل رقم، اس کی میعاد اور شرح سود پر ہوگا۔

ایک لڑکا:- اب تو یہ سوال بالکل صاف ہوگیا۔ بینکار یہ دیکھے گا کہ اگر وہ کچھ رقم مقررہ میعاد کے لیے موجودہ شرح سود پر قرض دے دے تو اسے کتنا سود حاصل ہوگا۔ اسی حساب سے وہ ہنڈی میں سے کٹوتی وضع کرے گا۔

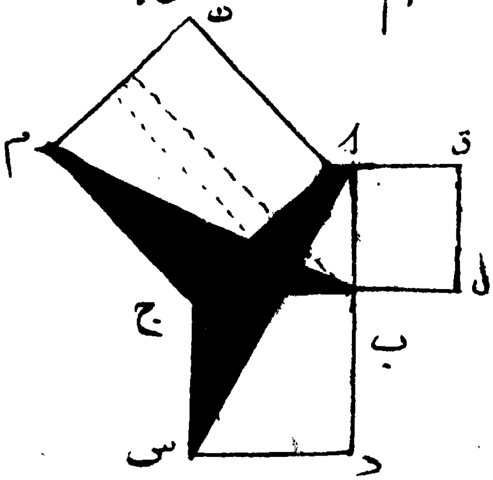
بہت سے لڑکے:- بالکل ٹھیک ہے۔ اب یہ بات بالکل واضح ہے۔

نگران :- یہی وجہ ہے کہ ہم اصل رقم ۱۰۰ فرض کر لیتے ہیں اور مقررہ میعاد اور دی ہوئی شرح سود پر اس کا کل زر معلوم کر لیتے ہیں۔

ایک لڑکا :- اس کے بعد تو یہ سوال اکائی کا سوال بن جاتا ہے۔ اس قدر کل رقم کے لیے اصل رقم اتنی ہے تو دی ہوئی کل رقم کے لیے اصل رقم کیا ہوگی۔

نگران :- اب تو یہ قاعدہ پوری طرح ذہن نشین ہو گیا معلوم ہوتا ہے۔ اچھا اس سوال کو خود کاپیوں پر حل کرو (لڑکے سوال حل کرنے لگتے ہیں)

(۲) جماعت دہم مضمون ہندسہ مسئلہ فیثاغورث



استاد نے تختہ سیاہ پر مندرجہ بالا شکل بنا رکھی ہے اور △ ا ج س اور △ ب ج م کے دو دو اضلاع برابر ثابت کرنے کے بعد ان کے درمیانی زاویوں کو برابر ثابت کر رہا ہے۔ چند طلبہ شکل کو بغور دیکھ رہے ہیں۔ باقی تمام خالی الذہن بیٹھے دکھائی دیتے ہیں۔

نگران :- ماسٹر صاحب کیا ثابت کر رہے ہیں؟

ایک لڑکا :- ا ج م کو ب ج س کے برابر ثابت کر رہے ہیں۔

نگران :- انہیں برابر ثابت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ دونوں قائمے زاویے ہیں۔

دوسرا لڑکا :- وہ خط م ج کو خط ا ج کے برابر ثابت کر رہے ہیں (اسی طور پر کوئی پندرہ

ہیں لڑکے غلط جواب دیتے ہیں۔ آخر ایک لڑکا درست جواب دیتا ہے۔ نگران متعدد طلبہ سے یہ جواب دہرانے اور دونوں زاویوں کو شکل میں دکھانے کے لیے کہتا ہے)

نگران :- اچھا اب تم سب کو معلوم ہو گیا کہ ماسٹر جی کون سے دو زاویوں کو برابر ثابت کر رہے تھے۔ بھلا بتاؤ تو کہ انہیں برابر ثابت کرنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی !

(لڑکے خاموشی سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے ہیں۔ بہت سے غلط سلط جواب دیتے ہیں۔ آخر ایک طالب علم جواب دیتا ہے کہ Δ ب ج م اور Δ د ج س کو منطبق ثابت کرنا مقصود ہے۔ نگران متعدد طلبہ کو یہ جواب دہرانے اور مثلثیں شکل میں دکھانے کو کہتا ہے)

مثلثیں کن صورتوں میں منطبق ہوا کرتی ہیں ؟

(طلبہ انطباق کی مشہور صورتیں بتاتے ہیں)

نگران۔ کیا اب یہ بات سمجھ میں آگئی کہ ان دو زاویوں کو کیوں ثابت کیا جا رہا ہے ؟

طلبہ :- جی ہاں۔ چوں کہ ان دو مثلثوں کے دو دو اضلاع برابر ثابت ہو چکے ہیں، اس لیے درمیانی زاویے کو برابر ثابت کر کے مثلثوں کو منطبق ثابت کر سکتے ہیں۔

(۳) جماعت دہم مضمون جغرافیہ (سورج اور چاند گرہن)

چند روز پہلے چاند گرہن لگ چکا ہے جس کی وجہ سے طلبہ کو موضوع میں بڑی دل چسپی ہے۔ استاد سبق تقریباً ختم کر چکا ہے اور اب اعادہ ہو رہا ہے۔

نگران :- چاند گرہن قمری مہینے کی کونسی تاریخ کو لگتا ہے ؟

(بہت سے لڑکے لاعلمی میں ایک دوسرے کا منہ تکتے ہیں۔ چند لڑکے ہاتھ اٹھاتے ہیں۔ نگران ایک لڑکے سے پوچھتا ہے)

لڑکا :- پانچ تاریخ کو۔

نگران :- ابھی چند روز ہوئے ایک رات چاند تقریباً تمام کا تمام سیاہ ہو گیا تھا۔ بتاؤ وہ

چاند کی کونسی تاریخ تھی؟

دوسرا لڑکا :- وہ چودھویں رات تھی یعنی بدر کی رات۔ چاند اس رات بالکل پورا تھا۔

نگران :- چودھویں رات کو چاند۔ زمین اور سورج کی باہمی پوزیشن کیا ہوتی ہے؟

(صرف دو تین ہاتھ اوپر اٹھتے ہیں۔ باقی لڑکے لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں)

ایک لڑکا :- اس رات سورج زمین اور چاند ایک سیدھ میں ہوتے ہیں اور زمین ان دونوں کے بیچ میں واقع ہوتی ہے۔

نگران :- ہاں۔ بالکل درست ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں اس رات چاند کا پورا چہرہ روشن نظر آتا ہے۔ اگر چاند زمین کی سیدھ میں ہونے کی بجائے اس سے تھوڑا سا دائیں یا بائیں طرف ہٹا ہوا ہو تو پھر کیا ہو؟

ایک لڑکا :- ہمیں اس کا پورا چہرہ روشن نظر نہ آئے گا۔ کیوں کہ اس صورت میں اس کے چہرے کا کچھ حصہ روشنی سے محروم رہے گا۔

دوسرا لڑکا :- اگر چودھویں رات کو زمین سورج اور چاند کے درمیان ہوتی ہے اور یہ تینوں ایک سیدھ میں ہوتے ہیں تو ہر چودھویں رات کو زمین کا سایہ چاند پر کیوں نہیں پڑتا؟

نگران :- دیکھو بھئی۔ تمہارے ایک ساتھی نے بہت اچھا سوال پوچھا ہے۔ بتاؤ اس کی کیا وجہ ہے کہ ہر بدر کی رات کو چاند گرہن نہیں لگتا؟

(لڑکے چپ چاپ بیٹھے رہتے ہیں اور کوئی بھی جواب نہیں دیتا)

استاد :- بھئی اس سوال کا جواب بڑا آسان ہے۔ تم جانتے ہو کہ زمین ایک مخصوص راستے پر چلتی ہوئی اپنی سالانہ گردش پوری کرتی ہے۔ اس راستے کو بھلا کیا کہتے ہیں؟

ایک لڑکا :- مدار ارضی۔

استاد :- ٹھیک ہے۔ اسی طور پر چاند بھی اپنا الگ مدار رکھتا ہے۔ اگر زمین اور چاند کی گردش

کے یہ راستے ہمیشہ بالکل ایک سی بلندی پر واقع رہتے تو ہر چودھویں رات کو زمین سورج کی شعاعوں کو چاند پر پڑنے سے روک دیا کرتی اور اس کا سایہ اس کے روشن چہرے کو سیاہ کر کے چاند گرہن پیدا کر دیا کرتا۔ لیکن قدرت نے ایسا نہیں کیا۔ عام طور پر چودھویں رات کو زمین ایسے مقام پر واقع ہوتی ہے کہ وہ سورج کی شعاعوں کا راستہ نہیں روک سکتی۔ لیکن کبھی کبھار چکر کاٹتے کاٹتے چاند اور زمین بالکل اس طرح ایک دوسرے کی سیدھ میں آجاتے ہیں کہ زمین سورج کی شعاعوں کا راستہ روک لیتی ہے اور اس کا سایہ چاند کے نورانی چہرے کو سیاہ کر کے رکھ دیتا ہے۔

نگران :- چاند گرہن کے متعلق اب تم کافی حد تک سمجھ گئے ہو گے۔ اچھا اب سورج گرہن کے متعلق کچھ بتاؤ۔ سورج گرہن قمری مہینے کی کونسی تاریخ کو لگتا ہے؟

(چند ہاتھ اٹھائے جاتے ہیں۔ نگران ایک سے پوچھتا ہے)

لڑکا :- سورج گرہن چاند کی اکیس بائیس تاریخ کو لگتا ہے۔

دوسرا لڑکا :- نہیں جناب سورج گرہن قمری مہینے کی انتیس تیس تاریخ کو لگتا ہے۔

نگران :- دوسرا جواب درست ہے۔ مگر یہ بات ہمارے پہلے دوست اور اس کے دوسرے ساتھیوں کی سمجھ میں اس وقت تک نہیں آئے گی، جب تک تختہ سیاہ پر اشکال نہ کھینچ کر وضاحت نہیں کی جاتی۔ (اس پر استاد چاک لے کر تختہ تحریر پر اشکال کھینچتا ہے)

"ان اشکال کو دیکھ کر بتاؤ کہ ماہ نو کے وقت سورج۔ زمین اور چاند کی باہمی پوزیشن کیا ہے؟

ایک لڑکا :- چاند سورج اور زمین کے درمیان واقع ہے۔

دوسرا لڑکا :- اس کا یہ مطلب ہے کہ اس تاریخ کو چاند سورج کی کرنوں کا راستہ روکے گا۔

نگران :- اگر ان دونوں کی گردش کے راستے یکساں بلندی پر ہوتے تو ہر ماہ نو کے وقت چاند سورج کی کرنوں کا راستہ روک کر سورج گرہن پیدا کر دیا کرتا۔ مگر جیسا ہم چاند گرہن کے ضمن میں

دیکھ چکے ہیں، قدرت نے ایسا نہیں کیا۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ ان دونوں کی گردش کے راستے بالکل ایک بلندی پر ایک دوسرے کے مقابل آجائیں اور اس طرح سورج پر چاند کا سایہ پڑے۔

استاد:۔ اب تم یہ بھی بتا سکو گے کہ کیوں ہر ماہ نو کے موقع پر سورج گرہن واقع نہیں ہوتا۔

ایک لڑکا:۔ جی ہاں۔ اس کی وجہ بھی بالکل وہی ہے جو ہر بدر کی رات کو چاند گرہن کے واقع نہ ہونے کی ہے۔ ماہ نو کے وقت بھی بہت شاذ ایسا ہوتا ہے کہ چاند اور زمین کے راستے ایک ہی بلندی پر ایک دوسرے کے مقابل ہوں۔

(۴) جماعت ہشتم مضمون تاریخ (پلاسی کی لڑائی)

استاد میر جعفر کی غداری اور کلایو کی عیاری کی کہانی سنا چکا ہے اور یہ بھی بتا چکا ہے کہ کس طرح ان دونوں باتوں کے باعث سراج الدولہ کی ہمت جواب دے گئی اور انگریزوں کو ایسی فیصلہ کن فتح حاصل ہوگئی جس نے قلمرو ہندوستان کے دروازے ان کے لیے چوپٹ کھول دیے۔

نگران:۔ اچھا بھئی۔ ہم بھی سنیں تم کس چیز کا حال پڑھ رہے ہو؟

ایک لڑکا:۔ پلاسی کی لڑائی کا۔

نگران:۔ پلاسی کس چیز کا نام ہے؟

(چند ہاتھ اوپر اٹھتے ہیں)

ایک لڑکا:۔ ایک دریا کا نام ہے۔

دوسرا لڑکا:۔ ایک پہاڑی کا نام ہے۔

تیسرا لڑکا:۔ نہیں جناب یہ ایک جگہ کا نام ہے۔ یہ لڑائی پلاسی کے مقام پر لڑی گئی تھی جس دریا کے کنارے یہ لڑائی لڑی گئی اس کا نام کچھ اور ہے۔

نگران:۔ یہ درست ہے۔ کیا کوئی لڑکا اس دریا کا نام بتائے گا۔

(ایک بھی ہاتھ کھڑا نہیں ہوتا)

استاد :- ارے ابھی تھوڑی دیر ہوئی میں نے بتایا تھا کہ یہ لڑائی دریائے بھاگیرتی کے کنارے لڑی گئی تھی -

ایک لڑکا :- جی ہاں یاد آگیا -

دوسرا لڑکا :- ماسٹر صاحب یہ نام بہت عجیب و غریب ہے - ہمیں پھر بھول جائے گا - اسے تختۂ سیاہ پر لکھ دیجیے -

(استاد یہ نام تختۂ سیاہ پر لکھ دیتا ہے)

نگران :- اچھا نقشہ پر پلاسی کا مقام دکھاؤ -

(سب لڑکے سراسیمگی میں ایک دوسرے کا منہ تکتے ہیں)

ایک لڑکا :- ماسٹر صاحب نے ہمیں نقشے پر یہ مقام دکھایا نہیں -

نگران :- خوب - تو پھر اتنا ہی بتا دو کہ یہ مقام برصغیر پاک و ہند کے کس حصے میں ہے ؟

ایک لڑکا :- دکن میں -

دوسرا لڑکا :- صوبہ یو پی میں -

تیسرا لڑکا :- بنگال میں -

نگران :- سراج الدولہ کہاں کا نواب تھا ؟

پہلا لڑکا :- بنگال کا -

نگران :- پھر تم نے کس طرح کہہ دیا کہ پلاسی دکن میں واقع ہے ؟

(استاد نقشے پر پلاسی کا مقام دکھاتا ہے)

نگران :- بھلا یہ بتاؤ کہ پلاسی کی فتح سے انگریزوں کے پاؤں اس قدر مضبوط کیوں ہو گئے ؟

ایک لڑکا :- بنگال بڑا زرخیز علاقہ ہے ، اس سے انگریزوں کی آمدنی بہت بڑھ گئی -

نگران :- اس سے پہلے جنوبی ہند میں انگریزوں کے پاؤں دیر سے جمے ہوئے تھے - مدراس بھی بہت زرخیز صوبہ ہے - پھر بنگال کی فتح کو اتنی اہمیت کیوں ؟

(لڑکے چپ چاپ ایک دوسرے کا منہ تکتے ہیں)

استاد:- سامنے ہندوستان کے نقشے پر غور سے دیکھو۔ وندھیاچل کا پہاڑ جنوبی ہند کو باقی ملک سے جدا کیے ہوئے ہے۔ صرف جنوبی ہند پر قبضہ جما کر انگریز گنگا اور سندھ کی زرخیز وادیوں تک نہ پہنچ سکتے تھے۔ بنگال کی فتح نے انگریزوں کے لیے شمالی ہند کا راستہ کھول دیا۔ جہاں سے وہ رفتہ رفتہ سارے ملک پر چھا گئے۔

خاتمۂ کلام | یہ چند مثالیں اس بات کی وضاحت کے لیے کافی ہیں کہ مبادیات کی طرف توجہ دیے بغیر تدریس کو جاری رکھنا کس قدر عبث کام ہے۔ یوں تو اچھے تجربہ کار استادوں میں بھی ایسے بزرگوار موجود ہیں جنہیں ابھی یہ سبق سیکھنا باقی ہے۔ مگر نوآموز استادوں کو یہ اصول ہر وقت پیش نگاہ رکھنے کی اشد ضرورت ہے۔ استاد کے لیے اس سے زیادہ اہم کوئی شے نہیں کہ وہ طلبہ کی ذہنی سطح پر اتر کر کام کا آغاز کرے۔ اس سطح کو نظر انداز کر دینا بہت بڑی خود فریبی ہے ؎

اساتذہ کا پنشن بل

محمد عبدالعزیز
مسلسل ۲۵

حکومت کے اس اعلان کے بعد ڈاکٹر الگزنڈر نے جو ارکان حکومت (مقامی حکومت) کے سیکرٹری ہیں ایک توضیحی بیان دیا جس کے بعد حکومت کے اس بیان کی رہی سہی حیثیت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ یہاں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ مرکزی حکومت اگرچہ تعلیم کے بیشتر اخراجات برداشت کرتی ہے لیکن تعلیم کی براہِ راست ذمہ دار نہیں اس کا انتظام مقامی حکومتوں کے سپرد ہے۔ برن ہم کمیٹی کے ارکان میں اساتذہ اور مقامی حکومتوں کے نمائندے شامل ہیں۔ وزیر ان کے فیصلے کو محض منظور کر سکتا ہے، رد نہیں کر سکتا۔ ڈاکٹر الگزنڈر نے فرمایا۔

مجھے برن ہم کمیٹی کے ارکان حکومت کے لیڈر سر ایبرلڈ جیکسن نے حسب ذیل بیان دینے کا اختیار دیا۔

ہم نے برن ہم کمیٹی کے حالیہ مذاکرات کے متعلق حکومت کا اعلان پڑھا۔ اب تک جو کچھ ہو چکا ہے اس بیان سے اس میں مزید اضافہ نہیں ہوا۔ اگرچہ یہ ضروری ہے کہ اس نے اس امر کا اعلان کر دیا کہ برن ہم کمیٹی نے ارکان مدرسین کے سامنے دو صورتیں پیش کی تھیں جس میں انہوں نے دوسری صورت (یعنی تنخواہوں کا مکمل ریویو) کو اختیار کیا۔ اس کے مطابق تنخواہوں کے مکمل ریویو کے سلسلے میں گفت و شنید شروع ہو جائے گی۔ ان مذاکرات پر یقیناً خاصہ وقت صرف ہوگا کیونکہ اس میں بعض اہم بنیادی مسائل شامل ہیں۔

کمیٹی کے ارکان حکومت نے ارکان مدرسین کو اس سے پہلے ہی مطلع کر دیا تھا کہ وہ لوگ جس وقت اور جب موزوں سمجھیں موجودہ رپورٹ پر گفت و شنید کے مجاز ہیں۔

وزیر موصوف کے اعلان سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ حکومت کو بھی اس طریق کار سے اتفاق ہے جسے برن ہم کمیٹی پہلے ہی اختیار کر چکی ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ برن ہم کمیٹی نے اب تک کسی اسٹیج پر پنشن بل پر کوئی بحث نہیں کی (ٹائمز ۷ جنوری ۵۶ء)

ڈاکٹر الگزنڈر کے اس بیان پر حکومت نے کوئی بیان نہیں دیا اور اساتذہ کو بظاہر بیان دینے کی ضرورت ہی نہ تھی لیکن یونین اور حکومت کا دو تنازعہ ہنوز قائم رہا اور حالات کچھ ایسے تھے کہ حکومت اپنے فیصلے پر قائم رہے گی۔ قطع نظر اس کے کہ یونین کو اس سے اتفاق نہیں ۲ جنوری ۵۶ء کو ویڈ لسی ٹیچرز ایسوسی ایشن کے سالانہ جلسہ میں سرگولڈسٹی نے حکومت کے حالیہ غیر معمولی بیان کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔

میں نہیں سمجھتا کہ ہمارے پچھلے فیصلے کے بعد صورت حال میں کوئی نمایاں تبدیلی پیدا ہوئی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ حکومت اساتذہ کے تنخواہ کے مکمل اور فوری ریویو سے متفق ہے اور ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں مگر اس کا صحیح اندازہ اس طور سے ہوگا کہ اس کا اثر اساتذہ کی تنخواہ کے چیک پر کیا پڑتا ہے۔ بعض اخباروں نے تنخواہ کے متعلق حکومت کی پیش کش کا ذکر کیا ہے، در اصل اس قسم کی کوئی پیش کش نہیں کی گئی اور جو لوگ برن ہم کمیٹی کے کاروبار سے واقف ہیں انہیں علم ہے کہ حکومت کوئی پیش کش کرنے کی اہل نہیں۔

اس کا تمام تر انحصار فی الواقع اساتذہ کے آجر یعنی مقامی حکومتوں پر ہے حکومت کا عندیہ خواہ کتنا ہی خلوص پر مبنی کیوں نہ ہو لیکن وہ اساتذہ کے تنخواہوں کے اضافے کی ضمانت نہیں لے سکتی۔

اگر وزیر موصوف یونین کی پیش کردہ تجاویز قبول کرنے کے لیے رضامند ہیں تو کم سے کم وہ روڈ بیونیا سنٹ تجویز کی یہی تجویز قبول کر لیں کہ اس مسودے کو اس وقت تک

کے لیے ملتوی کر دیا جائے جب تک اساتذہ کو نئے پیمانے سے تنخواہیں نہ مل جائیں
یہ ایک موقع ہے یہاں حکومت اپنے اخلاص کا واضح ثبوت دے سکتی ہے، اس کے
علاوہ یتیموں اور بیواؤں کے لیے ضروری سہولتیں مہیا کرنا اس کی مزید توثیق ہوگی
لیکن اس کے باوجود جس طرح پنشن بل پارلیمان میں پیش کیا گیا اور اس پر بحثیں ہوئیں
اساتذہ اس بے انصافی کو کبھی فراموش نہیں کر سکیں گے۔ (ٹائمز۔ ۱۰ جنوری ۱۹۲۵ء)

اس بیان میں سر گولڈ نے اگرچہ اپنے وقار کو قائم رکھنے کی کوشش کی ہے لیکن التوائے
رفاہ کی درخواست سے قدرے شکست کی جو توقع ہے، اگرچہ یہ بھی درست ہے کہ سر گولڈ یا نوئین
نے اب تک ہتھیار نہیں ڈالے بلکہ اپنے مطالبات پر اسی طرح ثابت قدم ہیں معلوم نہیں تحریک
کا انجام کیا ہوگا آیا اساتذہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہو جائیں گے یا حکومت کوئی وجہ جواز پیدا
کر کے اسے نافذ کر دے گی۔ اس کے متعلق ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کیوں کہ برطانیہ کی پارلیمانی جمہوریت
میں برطانیہ والوں کو فی الواقع آزادی حاصل ہے۔ ہر گروہ اپنے اپنے نقطۂ نگاہ سے ایک مسئلے
پر تنقید کر سکتا ہے اور یہ نہیں کہ لوگ اپنے خیالات کا اظہار نہیں کرتے بلکہ اپنے رویے کی تائید میں
بعض اوقات بعید از قیاس دلیلیں پیش کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔

میں نے یہ طویل اقتباسات اس لیے پیش کیے ہیں کہ اس سے برطانوی تعلیمی نظام کی ایک
واضح تصویر ہمارے سامنے آ جائے، کیوں کہ یہاں کی تعلیمی آزادی کا ہم صحیح طور پر تصور نہیں کر سکتے
ہمارا سارا نظام تعلیم حکومت کے تابع ہے۔ خواہ صحیح ہو یا غلط ہمیں اس کے فیصلوں کی متابعت
کرنی پڑتی ہے۔ ان حالات میں کیا ہم کبھی یہ توقع کر سکتے ہیں کہ ہم میں آزادی رائے اور آزادی فکر کے
جوہر پیدا ہو سکتے ہیں۔ یہاں مطالبات کی اس جنگ میں جس طرح ہر شخص مسلح ہو کر آتا ہے۔ اس اسپرٹ
کا ہماری قومی زندگی میں پیدا ہونا بلا ہر مشکل ہے۔ جہاں ایک مدرس اپنے ہیڈ ماسٹر سے ڈرتا ہے
اور جہاں ہیڈ ماسٹر انسپکٹر کی خوشنودی کی خاطر اپنے ضمیر کی متاع گراں بہا بھی قربان کر دیتا ہو
بہ خود کیوں کر عالی حوصلہ اور بلند نگاہ ہو سکتا ہے۔ اور بچوں میں شاہین کا تجسس اور چیتے کا جگر کیسے

پیدا کر سکتے ہیں۔ سر جان سارجنٹ نے ۱۶ فروری سنہ ۵۰ء کو ہندوستان اور پاکستان کے طلبہ کو خطاب[۱] کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ جس وقت تک ان دونوں ملکوں میں اچھے اساتذہ پیدا نہیں ہوں گے اس وقت تک نہ صرف یہ کہ کوئی تعلیمی سدھار نہیں ہو سکے گا بلکہ دونوں ملک کبھی ترقی نہیں کر سکیں گے۔ اس کے بعد انہوں نے برطانیہ اور ان دونوں ملکوں کے تعلیمی ورثے کا مقابلہ کیا اور کہا کہ ان دونوں قوموں میں احترام اساتذہ کی پرانی روایات ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اس دور میں اساتذہ اس احترام سے محروم ہو جائیں۔ اپنی تقریر کے شروع میں انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ ہندوستانی مرکزی مشاورتی بورڈ حسب معمول سال بھر کی تعلیمی ترقی کا جائزہ لے کر ایک رپورٹ شائع کر دیتا ہے۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ پاکستان کے متعلق میری معلومات آٹھ سال پرانی ہیں۔

التوائے نفاذ

سرگودھا کی اس تقریر کے بعد دونوں طرف سے مکمل خاموشی رہی۔ ممکن ہے خاموشی کے ساتھ مذاکرات کا سلسلہ جاری ہو لیکن کسی نے کوئی عام بیان نہیں دیا۔ کبھی کبھی اکا دکا بعض اساتذہ کے انفرادی خطوط چھپتے رہتے ہیں جن میں بالعموم کوئی نئی دلیل نہیں ہوتی بلکہ اگر انہیں اس تحریک اور یونین کے اقدام کی تائیدی تحریروں سے تعبیر کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ البتہ اس زمانے میں ایک اور تحریک رفتہ رفتہ عالمگیر ہو رہی تھی۔ اساتذہ کی بعض مقامی یونین نے یہ تجویز پیش کی کہ اساتذہ دوپہر کے کھانے کی نگرانی سے بھی دستبردار ہو جائیں کیونکہ اس کا انہیں کوئی معاوضہ نہیں ملتا جن مدارس میں اساتذہ بچوں کی فیسیں جمع کرتے ہیں اسے تو انہوں نے بند کر دیا ہے۔ لیکن کھانے کی نگرانی اسی طرح جاری ہے۔

اساتذہ کے ایک نمائندے نے موجودہ کشمکش پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ہماری سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ ہم طبعاً اور مزاجاً طلبہ سے تادیر اس قسم کا کھنچاؤ تو قائم نہیں رکھ سکتے جو ہڑتال یا اسٹرائک کی روح ہوتی ہے، اور جب ساری قوم کا اور قوم کے بچوں کا

---

[۱] سر جان سارجنٹ ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم پر تین لیکچر دیں گے۔ جن میں سے پہلا ۱۴ فروری کو ہو چکا۔ دوسرا ۲۳ فروری اور تیسرا یکم مارچ کو ہوگا۔ انشاءاللہ تینوں لیکچروں کے بعد ان کی تفصیل پیش کر سکوں گا۔

واسطہ دے دے کر وا دیا جاتی ہے تو سادہ رو استاد کی طبیعت نرم ہو جاتی ہے اور اس کی اٹھائی ختم ہو جاتی ہے اور وہ پھر اپنے مطالبات کو بھول کر تبسم کناں بچوں کی فلاح و بہبود کے کام شروع کر دیتا ہے۔ وہ ایک کارخانے کے ملازموں کی یونین کی طرح ہڑتال نہیں کر سکتا وہ ریلوے ملازمین کی طرح سڑکوں پر پریڈ نہیں کر سکتا کہ اسے علم و حکمت کا امین سمجھا جاتا ہے ۔۔۔۔۔ اس کا انجام خسارہ اور نقصان ہی ہوتا ہے۔ اس کے اس بیان میں بڑی واقعیت ہے صنعتی لحاظ سے ترقی یافتہ ملکوں میں مزدوروں کی ٹریڈ یونین کسی نہ کسی طرح اپنے حقوق تسلیم کرا ہی لیتی ہے کام بند کر دینے کی دھمکی دے کر یا اسی قسم کی کوئی اور شرط پیش کر کے، لیکن اساتذہ کے پاس اس قسم کا کوئی حربہ نہیں، وہ کس سے مقابلہ کریں؟ ان ننھے بھولے بھالے بچوں سے۔ ان کی خلقی حس انہیں اس قسم کے اقدام سے ہمیشہ روکتی رہتی ہے، اس لیے وہ ان طریقوں سے اپنے آجروں کو مجبور نہیں کر سکتے۔ انہیں کوئی ایسی راہ تلاش کرنی ہوگی جس میں نہ ان کے وقار کو ٹھیس لگے اور نہ طلبہ کا نقصان ہو۔ لیکن موجودہ معاشرے میں ابھی کوئی راہ نظر نہیں آتی۔ یہ زیادہ سے زیادہ بر ہیم کمیٹی میں وہ اپنے مطالبات کو شد و مد سے پیش کر کے انہیں منوانے کی کوشش کر سکتے ہیں اور بس۔

۳۱ جنوری ۵۶ء کو حکومت نے مسودے کے التوائے نفاذ کا فیصلہ کیا اور یکم فروری ۵۶ء کو اس کا باقاعدہ اعلان کیا۔ اس بیان سے بعض حلقوں میں بڑی حیرت ہوئی۔ جو لوگ یہ سمجھتے تھے کہ حکومت اپنے فیصلے پر قائم رہے گی اور وہ حکومت کے اس اقدام کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان تھے کہ انہیں اب حالات کے تابع اپنی رائے کے بدلنے میں خاصی دقت محسوس ہوئی۔ حکومت کا اعلان یہ تھا۔

حکومت کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ پنشن کے حصہ داد کے مجوزہ اضافے کی وجہ سے استادوں کے مشاہروں میں تخفیف نہ ہونے پائے۔

جس وقت یہ مسودہ تیار کیا گیا تو حکومت کو یہ علم تھا کہ اساتذہ برن ہیم کمیٹی سے یکم اپریل ۵۶ء سے ایک عارضی اضافے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اس عارضی

اضافے پر عمل درآمد نہ ہو سکا۔ اگرچہ حکومت نے جنوری کے آغاز میں اس امر کی طرف اشارہ بھی کیا تھا کہ اگر اس قسم کی کوئی تجویز حکومت کے سامنے پیش کی گئی تو اسے یکم اپریل ۱۹۵۶ء سے منظور کرنے میں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ برن ہم کمیٹی اب اساتذہ کی تنخواہ کا مکمل ریویو چھ ماہ قبل یکم اکتوبر ۱۹۵۵ء سے کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ حکومت کا ان تجویزوں کو کتاب قانون میں درج کرنے کا عزم اس سے کم زور نہیں ہوا۔ بلکہ حکومت توقع کرتی ہے کہ پنشن کے حصۂ امداد میں ایک نئی تعداد زیادہ ادائیگی کے مسئلے کو اکتوبر ۱۹۵۶ء تک ملتوی کردینے سے برن ہم کمیٹی کے مذاکرات ایک اچھے ماحول میں تکمیل پا سکیں گے۔ اس کا التوا حکومت کے پارلیمانی پروگرام کے دباؤ کو بھی کم کردے گا اور اس طرح مسودے کو مختلف ادوار سے گذرنے کا مزید وقت مل جائے گا' (ٹائمز۔ یکم فروری ۱۹۵۶ء)

معلوم نہیں حکومت نے یہ فیصلہ سر گولڈ کی ریڈنسی کی تقریر کے پیش نظر کیا یا از خود اساتذہ کی فلاح کی خاطر۔ برطانوی حکومت اور اس معاشرے کی ہیئت ترکیبی کچھ ایسی ہے کہ یہ تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ حکومت کے اس فیصلے میں دونوں کا دخل ہے۔ یونین کے مطالبات کا بھی اور اساتذہ کی فلاح کا بھی اس التوا سے یونین کو موقع مل گیا کہ اب برن ہم کمیٹی میں اپنے مطالبات کی پیروی میں تمام توجہ صرف کردے گی۔ کیونکہ اب تک اس کی توجہات حکومت کے اس مسودے کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ لیکن حکومت کے اس فیصلے کے باوجود کم از کم چھ ماہ تک انہیں اس محاذ سے کوئی اندیشہ نہیں۔ اس لیے قوی امکان ہے کہ برن ہم کمیٹی کے محاذ پر بھی انہیں نمایاں کامیابی حاصل ہوگی اور حق یہ ہے کہ ایک نئی تعداد اضافہ اس وقت اساتذہ کی نگاہوں میں اتنا اہم نہ ہوگا جب برن ہم کمیٹی میں تنخواہ کے مسئلے کا کوئی معقول حل تلاش کرلیا جائے۔ حکومت کے اس اعلان پر سر گولڈ نے جو تبصرہ کیا درج ذیل ہے۔

حکومت کا یہ فیصلہ اس امر کی توثیق ہے کہ اساتذہ کی موجودہ تنخواہیں ایک نئی تعد

کشونتی بھی برداشت نہ کرسکیں گی۔

اساتذہ کے پنشن کے حصہ ادا میں ایک فی صد کا اضافہ جس وقت بھی نافذ کیا جائے حکومت کا یہ چارج بدستور قائم رہنا کہ اساتذہ کے علاوہ پبلک ملازموں میں سے کسی سے مزید ادائیگی کا مطالبہ نہیں کیا گیا؟"

برن ہم کمیٹی | اس وقت تک کے حالات سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اس کش مکش میں اساتذہ ثابت قدم رہے۔ اگر برن ہم کمیٹی میں بھی ان کے مطالبات کو تسلیم کرلیا گیا تو یہ اساتذہ اور ان کی یونین کی بہت بڑی جیت ہوگی۔ موجودہ اسکیل کے مطابق ابتدائی ثانوی اور ٹکنیکل مدارس میں اساتذہ کی بنیادی تنخواہ ساڑھے چار سو پونڈ[1] سالانہ ہے تعلیمی یا بعض اہم کاموں کا الاؤنس اس کے علاوہ ہے۔ اس اسکیل کی آخری مدسانت سو پونڈ ہے جو اب بالکل ناکافی سمجھی جاتی ہے۔

اساتذہ کی بعض انجمنوں نے پان سو پونڈ سالانہ سے ایک ہزار پچاس پونڈ سالانہ کا نیا اسکیل تجویز کیا ہے جس میں الاؤنس وغیرہ شامل نہیں۔ این۔ یو۔ ٹی نے ابھی تک اس کے متعلق اپنا عندیہ ظاہر نہیں کیا۔ اس سے پہلے ہوا کے رخ کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ارکان مدرسین اس مرتبہ سودا بازی میں اپنی ساری توانیں صرف کردیں گے۔

ایجوکیشنل سپلی منٹ نے حکومت کی اس فیاضی کا قصیدہ پڑھتے ہوئے اساتذہ کے غور و خوض کے لیے چند معقول تجویزیں پیش کی ہیں۔ مختلف پبلک ملازموں کی تنخواہوں کا ذکر کرتے ہوئے اخبار نے یہ تجویز پیش کی ہے۔

> فرق صرف یہ ہے اور یہی مقام عبرت ہے کہ ایک اوسط پیشہ ور کی تنخواہ ایک اوسط مدرس کی تنخواہ سے زیادہ ہوتی ہے۔ یہ ایک بہت بڑا سوال ہے جس پر این۔ یو۔ ٹی کو اپنی توجہات مرکوز کرنے کی ضرورت ہے۔ (ایجوکیشنل سپلی منٹ۔ افروری)

اگر اس طبقے کے پیش نظر یونین نے برن ہم کمیٹی سے مطالبہ کیا اور اس میں انہیں کامیابی حاصل

---

[1] ایک پونڈ تیرہ روپے سوا پانچ آنے کے برابر ہے

ہو گئی تو اساتذہ کی عمومی زندگی پر اس کا بڑا خوش گوار اثر پڑے گا اور وہ اپنے ملک و قوم کی زیادہ تن دہی سے خدمت کر سکیں گے۔ انگریز اپنے بچوں کو نذر حوادث کرنے کے قائل نہیں وہ انہیں اچھے اور معقول اساتذہ کی نگرانی میں دینا زیادہ پسند کریں گے، اس سلسلے میں خواہ انہیں زیادہ ہی مصارف کیوں نہ برداشت کرنے پڑیں۔ اس کے پانچ سالہ پروگرام اور اس کے صنعتی فروغ کی وجہ سے ساری قوم اور زیادہ اندیشہ ناک ہو گئی ہے بعض ارباب رائے کے نزدیک اگر ہم نے اس اس مقام پر اپنی تعلیمی زندگی کا صحیح جائزہ نہ لیا تو ہماری یہ غفلت قومی خودکشی کے مترادف ہو گی ایشیا کے نئے آزاد اسکولوں کو اپنی صنعتی اور زراعتی ترقی کے لیے اچھے صنعت کاروں اور اپنے اچھے کسانوں کی ضرورت ہے جو جدید آلات کو استعمال کرنا جانتے ہوں۔ روس بہت جلد آپ اپنا کفیل ہو کر اپنے صنعت کار اور اپنے انجینئر دوسرے ملکوں میں بھیجے گا۔ اس سے مغربی دنیا اور بالخصوص برطانیہ کو یہ نقصان ہوگا کہ اس کی اپنی مصنوعات کی مانگ کم ہو جائے گی اور ایشیا میں روس کی سیاسی سیادت قائم ہو جائے گی۔ اس خطرے سے بچنے کے لیے ہمیں اپنی تعلیم میں ایک انقلاب لانے کی ضرورت ہے، ایسا انقلاب جو وقت کی ضروریات کو بطریق احسن پورا کر سکے۔

اثرات مابعد حکومت کے اعلان التوا کے بعد جنگ و جدال کی وہ کشاکش ختم ہو گئی ہے۔ لیکن دونوں کے تیور سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دونوں گروہ اپنے آپ کو حق بجانب تصور کرتے ہیں۔ وزیر تعلیم اس خیال سے کہ ملک اقتصادی بحران کی گرفت میں ہے اس لیے اساتذہ کو اس ایک فی صد اضافہ کے تسلیم کرنے میں حجت نہیں کرنی چاہیے اور اساتذہ اس نقطۂ نگاہ سے کہ ہماری تنخواہیں یوں ہی اتنی کم ہیں۔ ہم اس میں مزید ایک فی صد کی کمی برداشت نہیں کر سکتے۔

حکومت کے اعلان التوا اور برنہم کمیٹی کے مذاکرات نے اساتذہ کو ایک حد تک مطمئن کر دیا تھا لیکن پچھلے ہفتے میں ڈیوڈ ایکلز نے وقفہ سوالات میں تنظیموں اور بیواؤں کی اسکیم کے متعلق یہ فرمایا کہ مقامی حکومتوں نے اس ضمن میں اپنے نظریات کی پہلے ہی توضیح کر دی ہے اس لیے

ان سے اس سلسلے میں مزید گفت و شنید کرنا مناسب نہیں۔ حالاں کہ دسمبر ۵۵ء میں وزیر موصوف نے خود اس امر کا اعلان کیا تھا کہ میں مقامی حکومتوں سے ایک مناسب اسکیم کے متعلق بات چیت کروں گا۔ سر ڈیوڈ کے اس اعلان سے اساتذہ ایک مرتبہ پھر برہم ہو گئے، چناں چہ ۸ فروری کو این۔یو۔ٹی کی مجلس عاملہ نے حسب ذیل بیان دیا۔

اس ہفتے سر ڈیوڈ ایکلز نے ایک اسٹینڈنگ کمیٹی میں ایک عجیب حیران کن بیان دیا کہ جس وقت یہ بل دارالعلوم میں پیش ہوا، اس وقت میں نے جو کچھ کہا اپنی نجی حیثیت میں کہا۔ اس سے حکومت کو کوئی سروکار نہیں۔ وہ اپنے ان ریمارکوں کی جس طرح تشریح کرنا چاہیں، انہیں اس کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ لیکن مدرسین اور اراکین پارلیمان اسے حکومت کا ایک وعدہ سمجھتے ہیں جو اس نے مقامی حکومتوں سے مذاکرات کے سلسلے میں کیا تھا۔ این۔یو۔ٹی کی مجلس عاملہ حکومت سے اس وعدے پر قائم رہنے کی درخواست کرتی ہے۔

سر ڈیوڈ ایکلز نے تبصرات کو صرف یہی نہیں کہا کہ مقامی حکومتوں سے بات چیت ایک ذاتی اور نجی معاملہ ہے بلکہ یہ بھی کہا کہ اب میں محسوس کرتا ہوں کہ جب مقامی حکومتوں نے اپنے نقطۂ نگاہ کی توضیح کر دی ہے تو آخر ان سے کس مسئلے پر بات چیت کی جائے؟

اس طرح وزیر موصوف کی وعدہ شکنی کی یہ دوسری مثال ہے۔

وزیر موصوف نے پارلیمان میں یہ بھی فرمایا کہ مجھے اساتذہ کی کسی انجمن سے اب تک یتیموں اور بیواؤں کے متعلق کوئی اسکیم موصول نہیں ہوئی۔ سر ڈیوڈ ایکلز کو بخوبی معلوم ہے کہ این۔یو۔ٹی۔ ان کے لیے اس قسم کی سہولتیں چاہتی ہے جو اس وقت دوسرے سول ملازموں کو حاصل ہیں۔ (ٹائمز ۲۰ فروری)

سر ڈیوڈ کے اس اعلان سے بظاہر ان کا رہا سہا وقار بھی ختم ہوتا نظر آتا ہے۔ جس کا وزیر موصوف کو خود احساس ہے۔ پچھلے دنوں کیمبرج میں اساتذہ کے پنشن بل اور برنہم کمیٹی کے مذاکرات

کا ذکر کرتے ہوئے سر ڈیوڈ نے کہا:۔

یہ جانتے ہوئے کہ (تنخواہوں میں) یہ اضافہ ہو جائے گا، مجھے اس بات کی پرواہ نہیں کہ عام فہم طور پر میں مقبول عام نہیں رہا۔ میرا انتخاب اس لیے عمل میں نہیں آیا کہ میں مقبولیت حاصل کروں۔ میں تو اس لیے منتخب ہوا ہوں کہ وہ کام کروں جسے میں صحیح سمجھتا ہوں۔"

اس قسم کی تقریروں سے ٹوری حکومت کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہے۔ اقتصادی بحران کے نام پر تعلیمی پروگرام میں جو کمی کی جا رہی ہے اس کا اثر عمومی طور پر بہت برا پڑ رہا ہے اور اپنی موجودہ حکمت عملی کی وجہ سے اس کی تمام تر ذمہ داری سر ڈیوڈ پر عائد کی جاتی ہے۔ مین چیسٹر کے تعلیمی پروگرام میں دس لاکھ پونڈ کی کمی کر دی گئی ہے۔ اسی طرح ایکسن اور برمنگھم کی تعلیمی اسکیموں کی تکمیل کے لیے مرکزی خزانے سے جو رقم منظور ہوئی تھی اس میں سے ۴۲ لاکھ پونڈ اور ۴ لاکھ پونڈ کم کر دیے گئے ہیں۔ ذیل کے خاکے سے اس کی وضاحت ہو جائے گی۔

تعلیمی پروگرام

نام شہر	منظور شدہ رقم	تخفیف شدہ رقم	موجودہ منظور شدہ رقم
مین چیسٹر	۲۰۰۰۰۰۰ پونڈ	۱۰۰۰۰۰۰ پونڈ	۱۰۰۰۰۰۰ پونڈ
ایسکو	۳۰۰۰۰۰۰ پونڈ	۴۲۰۰۰۰۰ پونڈ	۱۷۰۰۰۰۰ پونڈ
برمنگھم	۱۶۰۰۰۰۰ پونڈ	۴۰۰۰۰۰ پونڈ	۱۲۰۰۰۰۰ پونڈ

تعلیم کے سلسلے میں اس قسم کی جو تخفیف ہو رہی ہیں خواہ اس سے وزیر تعلیم کا براہ راست تعلق نہ ہو بلکہ اقتصادی بحران کی وجہ سے تخفیف کی جا رہی ہو لیکن اندریں حالات سر ڈیوڈ ہی کو اس کا ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے۔ ہیمپسٹڈ سٹی زن (HAMPSTEAD CITIZEN) نے اپنے فروری کے شمارے میں اس قسم کی تخفیف کو تعلیمی اسکینڈل قرار دیا ہے۔ سر ڈیوڈ کی کارگذاریوں کا جائزہ لیتے ہوئے یہی اخبار لکھتا ہے۔

ایک مرتبہ پھر اقتصادی بحران کے نام پر ٹوری حکومت تعلیم پر رکیک اور نا روا حملے کر رہی ہے۔ ڈی۔ این۔ پارس برگ کی برطرفی کے بعد سر ڈیوڈ ایکلز وزیر تعلیم مقرر ہوئے۔ لیکن وہ اپنے پیش رو کی سیاہ روایات کے مطابق ہی چل رہے ہیں۔

ان واقعات کی روشنی میں اگرچہ مستقبل کا کچھ اندازہ ضرور ہو جاتا ہے لیکن ان کی سیاسی اور سماجی روایات کے پیش نظر حکم لگا کر اس وقت کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اپنے گھریلو معاملات میں یہ لڑ جھگڑ کر کوئی ایسی راہ تلاش کر لیتے ہیں جس سے دونوں منزل تک پہونچ جائیں۔ اس لیے زیادہ امکان اس کا ہے کہ دونوں گروہوں میں مصالحت ہو جائے گی۔

اپنے آئینے میں | برطانیہ میں ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک اگرچہ ایک قومی نظام کے تابع ہے۔ لیکن یہ مقامی تعلیمی حکومت بلکہ ہر اسکول اور ہر یونیورسٹی حکومت کی گرفت سے باہر ہے۔ حکومت براہ راست تعلیمی امور میں مداخلت نہیں کر سکتی۔ مثلاً یونیورسٹی گرانٹ کمیٹی جو رقم متعلقہ یونیورسٹیوں کو ادا کرتی ہے۔ حکومت اس سے اس کا حساب نہیں مانگ سکتی۔ یہی نہیں بلکہ اس کے مصرف کو بھی بدل نہیں کر سکتی۔ تعلیم میں اس ذہنی اور فکری آزادی سے طالب علموں میں تنوع اور ہمہ گیری پیدا ہو جاتی ہے۔ اس آزاد فضا میں استاد اور شاگرد دونوں خوش و خرم انداز سے بلند تر مقام کا عزم کرتے نظر آتے ہیں اس کے برعکس ہماری تعلیمی فضا مکدر اور ہمارے تعلیمی ادارے مجہول۔ استاد اور شاگرد دونوں قابل رحم۔ افسوس ہوتا ہے کہ جو قوم صدیوں مشعل راہ علم رہی ہے، اس کی زبوں حالی کا یہ عالم۔ میں ان کی تہذیب کی فسوں گری سے مسحور نہیں ہوا۔ لیکن ان کے تعلیمی اداروں سے اور ان کے نظام کار سے ضرور متاثر ہوا ہوں۔ اس وقت جب کہ یہ قوم بظاہر اقتصادی بحران میں مبتلا ہے اور اس کی عظیم الشان سلطنت جزائر برطانیہ کے چند حصوں اور ایک دو نو آبادیات پر مشتمل رہ گئی ہے۔ مگر ان میں اب بھی بلا کی توانائی موجود ہے۔ وہ اپنا گھر درست رکھنا جانتے ہیں۔ اگرچہ امریکہ کی سیاسی اور فوجی حیثیت کا تفوق و ہیبت بھرم امریکہ کے عطیات اور اس کی امداد کی بدولت باقی ہے۔ مگر برطانیہ عظمیٰ اب دم خم ہنوز چلتا نظر آتا ہے۔ ہم نے ان کی تہذیب و تمدن اور ان کے سامان نشاط کو تو اپنی زندگی کا جزو بنا لیا ہے کیا اب ہم ان سے ان کی زندگی کا یہ آورش اور کھلنڈرا پن بھی حاصل کر سکیں گے؟

احساس کمتری

حسن عزیز

ہر شخص میں برتری کے حصول کے لیے جدوجہد اور احساس کمتری دونوں ساتھ ساتھ پائے جاتے ہیں۔ چوں کہ ہم اپنے آپ کو کمتر تصور کرتے ہیں اس لیے ہم لگاتار کوشش کرتے ہیں اور کوشش سے اپنے جذبات پر فتح پا لیتے ہیں۔ کمتری کا احساس اس وقت تک نمایاں نہیں ہوتا جب تک کہ برتری حاصل کرنے کے لیے لگاتار کوشش کا طریقہ بالکل ناکام نہ ہو جائے یا کوئی جسمانی کمزوری نفسیاتی طور پر برتری کی کوشش کے خلاف ردعمل کرے۔ یا پھر احساس کمتری کے شکار میں کوئی جسمانی نقص ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس کے اثرات اس میں نمایاں ہونے لگتے ہیں۔

آئیے ہم ایک تیرہ برس کے لڑکے کے بارے میں غور کریں جو تتلاتا ہے۔ اس کا تتلانا اس میں مایوسی کا احساس پیدا کرتا ہے اور جوں جوں وہ زیادہ مایوس ہوتا جاتا ہے اس کا تتلانا بڑھتا جاتا ہے۔ اس طرح ایک ناخوش گوار سا چکر پیدا ہو جاتا ہے جو کہ اس کو ذہنی طور پر احساس کمتری میں ایسا مبتلا کر دیتا ہے کہ وہ کسی کے سامنے نہیں جا سکتا۔ کبھی کبھی وہ اتنا ناامید ہو جاتا ہے کہ خودکشی کے متعلق بھی سوچنے لگتا ہے۔ اس طرح اس لڑکے کا تتلانا اس کی زندگی میں ایک اہم مقام حاصل کر لیتا ہے اور اس کے ماحول پر اس طرح اثر انداز ہوتا ہے کہ وہ اس کو دوسروں کی توجہ کا مرکز بنا لیتا ہے۔ جوں جوں دوسروں کی ہمدردی اور توجہ اس کی طرف زیادہ ہوتی جاتی ہے توں توں وہ زیادہ تتلانے لگتا ہے اور اس طرح توجہ حاصل کرنے کی خواہش اور تتلاہٹ کا ایک نیا چکر شروع ہو جاتا ہے۔

اس لڑکے نے دنیا میں ایک غلط مقصد کو ایک مطمع نظر بنا لیا ہے۔ وہ ہمیشہ اقتدار غیر معمولی توجہ اور امتیاز حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس کو بااخلاق ہونا ہوگا، دوسروں

نشانہ بنتا نہ چلنے کی کوشش کرتی ہوگی اور اس کو اپنا ہر کام ایک نظام کے تحت کرنا ہوگا۔ لیکن ان مقاصد سے قطع نظر کے وہ ایک شکست کے دوران میں یہ سوچتا ہے کہ اس کے اندر کئی ایک خوبیاں ہیں ان میں سے ایک خوبی ہکلاہٹ ہے۔

اس لڑکے کا معاملہ کئی لحاظ سے اہم ہے کیوں کہ بنیادی طور پر اس کی زندگی ایک خاص رخ پر گامزن کر دی گئی ہے۔ ہکلاہٹ بھی ان بیشمار بیماریوں میں سے ایک ہے جنہیں بچے دھوکے میں اپنے ذہنی بچاؤ کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ایسے بچوں کو کسی نہ کسی طرح یقین ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی زندگی میں اپنی قابلیت کے بل بوتے پر کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ان ذرائع کو قدرت کے ان ہتھیاروں سے مشابہت دی جاتی ہے جو وہ جانوروں کو ان کی حفاظت کے لیے بخشتی ہے۔ مثلاً ان کے پنجے اور سینگ۔ جیسے ایک جانور اپنے پنجے اور سینگوں سے اپنا بچاؤ کرتا ہے، اسی طرح یہ بچے بھی اس چھوٹے بچاؤ کے لیے ذرائع اختیار کرتے ہیں، یہ معلوم کر لینا آسان ہے کہ یہ ہتھیار بچے کی کمزوری کے ساتھ کس قدر گہرا تعلق رکھتے ہیں اور اس کے علاوہ یہ بات بھی آسانی سے معلوم ہو جاتی ہے کہ باوجود ان ہتھیاروں کے بچے کی ناامیدی اور مایوسی اس کی زندگی کے نشیب و فراز کے ساتھ کیسے غالب آ جاتی ہے۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ کون کون سی چیزیں ان ہتھیاروں کا کام کرتی ہیں بعض بچے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ان کے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہوتا اور اس کے علاوہ اپنے جسم کے ارادی نظام کو کھو بیٹھتے ہیں۔ ان بچوں کے اندر ابھی تک بچپن کی عادتیں باقی ہوتی ہیں۔ ان بچوں میں کبھی کوئی جسمانی عارضہ نہیں پایا جاتا۔ لیکن وہ والدین اور اساتذہ کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے اس قسم کی عادت پیدا کر لیتے ہیں۔ بعض اوقات ان کی یہی چالاکی ان کو دوسرے لڑکوں کے مزاح کا شکار بنا دیتی ہے۔ ان ظاہری طور پر بنی ہوئی عادتوں کا علاج عام بیماری کی طرح نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ ان کا مطالعہ احساس کمتری اور ان ظاہری طور پر بنی ہوئی عادتوں کے نقطہ نظر سے ہونا چاہیے اس بچے کے معاملے سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس کی ہکلاہٹ کی شکایت جو بالکل نفسیاتی

چیز تھی کسی خاص وجہ سے پیدا ہوئی۔

اگر بچہ والدین کا اکلوتا بیٹا ہے تو ماں کو ہر وقت اس کے ساتھ لگاؤ رہتا ہے اور وہ اس کے ساتھ ہمیشہ بندھی رہتی ہے جب وہ بڑا ہو گیا تو اس نے سوچا کہ اس کی طرف پوری توجہ نہیں دی جا رہی بلکہ گھر کے لوگ اس کے چھوٹے بھائی سے زیادہ لاڈ پیار کرتے ہیں، چنانچہ اسے ایک ایسی ترکیب سوجھی جس سے اس کے والدین کی توجہ اس کی طرف دوبارہ ہو گئی۔ اس نے جان بوجھ کر تھتھلانا شروع کیا۔ اس کی تھتھلاہٹ نے خاص اہمیت حاصل کر لی۔ کیونکہ وہ دیکھتا تھا کہ جب وہ بولتا ہے تو دوسرے لوگ اس کے منہ کی طرف دیکھتے ہیں۔ اس تھتھلاہٹ کی وجہ سے وہ اپنے ماں باپ کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ اسکول میں بھی اس کی یہی حالت تھی، اس کا استاد اس کی طرف دوسروں کی نسبت زیادہ توجہ دیتا۔ اس طرح اسکول میں اور گھر میں اس نے برتری حاصل کر لی۔ اس نے اسکول کے اچھے لڑکوں کی ہمدردی اور ہر دل عزیزی حاصل کی، اس بات کی اس کو ہمیشہ خواہش تھی، اس میں شبہ نہیں کہ وہ ایک اچھا طالب علم تھا لیکن مدرسے میں اس کی تھتھلاہٹ کی وجہ سے اس کا خاص خیال رکھا جاتا تھا اور اسے ہر قسم کی سہولت دی جاتی تھی اگرچہ لڑکے کی تھتھلاہٹ نے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ استاد کی توجہ اس کی طرف زیادہ ہو گئی لیکن یہ ترکیب کسی حالت میں بھی مناسب قرار نہیں دی جا سکتی تھی۔

لڑکا جب یہ دیکھتا تھا کہ استاد کی پوری توجہ اس کی طرف نہیں ہے تو اس کو اتنا صدمہ پہونچتا تھا کہ دوسرے لڑکوں میں سے کسی کو بھی نہ ہو سکتا تھا۔ اس کے علاوہ گھر پر جب اس کے چھوٹے بھائی کا ظہور ہوا تو اس نے محسوس کیا کہ اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی جائے گی۔ عام بچوں کے برعکس اس کے اندر دوسروں میں دلچسپی پیدا کرنے کی اہلیت نہ رہی تھی۔ ایسے بچوں کے علاج کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ ان کے اندر جرأت پیدا کرنے کی کوشش کی جائے کہ انہیں اپنی طاقت اور اہلیت پر اعتماد ہونے لگے۔ بہتر ہے کہ بچوں سے دوستانہ تعلقات پیدا کرائے جایا کریں اور یہ اسی صورت میں پیدا ہو سکتے ہیں کہ ہمارا رویہ نرم ہو۔ اگر آپ نے

سخت رویہ سے ڈرا دیا تو وہ آپ کے بالکل خلاف ہو جائیں گے اور یہ تعلقات دوستی کی حد تک نہیں رہنے چاہئیں۔ بلکہ ان کو بچے کی جرات بڑھانے کے لیے استعمال کرنا چاہیے اور کوشش کرنی چاہیے کہ بچے میں لگاتار ترقی ہو۔ یہ ایسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ بچے کو آزاد کر دیا جائے اور مختلف تدابیر سے اس کو اس مقام پر لایا جائے جہاں وہ اپنے ذہنی اور جسمانی قوا پر اعتماد کرنے لگیں۔ ان طریقوں سے انہیں یہ یقین دلانا چاہیے کہ وہ چیزیں جن کو اب تک وہ حاصل نہیں کر سکے حاصل ہو سکتی ہیں اور اس کے لیے جرات اور عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔

بعض اوقات جب استاد یا والدین یہ دیکھتے ہیں کہ بچہ غلط راستے پر چل رہا ہے تو بغیر سوچے سمجھے کہہ اٹھتے ہیں کہ اس لڑکے کی زندگی ناکام یاب ہو گئی ہے۔ یہ اس کے والدین اور استاد کی سخت غلطی ہے۔ ایسی پیشن گوئی اس کی حالت کو بد سے بدتر بنا دیتی ہے اور اس سے بچے کی بزدلی اور بڑھ جاتی ہے جو کہ اس کے حق میں بری ثابت ہوتی ہے۔ اس کے لیے علاج بالکل مختلف ہونا چاہیے یعنی یہ کہ دماغ کو کسی نتیجہ خیز کام میں لگانا چاہیے۔ ورجل نے کیا خوب کہا ہے کہ "جب اپنے آپ پر کوئی اعتماد کرتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ ایک کام کرے گا تو وہ اس کام کو ضرور کر گذرتا ہے" یہ کبھی یقین نہیں کرنا چاہیے کہ

ہم بچے کو آزادی دے کر اس سے اس کے کردار کو برا بھلا کہنے سے یا نرمی سے بہتر بنا سکتے ہیں لیکن یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ ایسے بچے اکثر اپنا مذاق اڑواتے ہیں اور کبھی کبھی ان حالات میں اپنے کردار کو بدل لیتے ہیں۔

ایک لڑکے کو تیرنا نہیں آتا تھا اس لیے اکثر بچے اس کا مذاق اڑاتے رہتے تھے۔ آخر کار وہ اس مذاق کو برداشت نہ کر سکا اور اس نے چھلانگ لگانے والے تختے پر کھڑے ہو کر گہرے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ پانی گہرا تھا اور لڑکا تیرنے سے ناواقف تھا اس لیے وہ ڈوبنے لگا اسے بڑی مشکل سے بچا لیا گیا۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی ایسا بزدل جس کو اپنی عزت کا پاس ہے اپنی عزت کی خاطر ایسا کوئی کارنامہ کر گذرے لیکن ایسا کبھی کبھار ہوتا ہے۔ اس کی بزدلی ایسی بات

میں مضمر تھی جس کا وہ اقرار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ تیرنا نہیں جانتا تھا لیکن وہ اس کا انکار بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے کہ اس طرح لڑکوں میں آبرو جانے کا سوال تھا۔ اس نے اس بزدلی کا تو علاج نہ کیا بلکہ اپنی بزدلی کو پانی میں چھلانگ لگا کر اور شدید کر لیا۔

بزدلی ایک ایسی کمزوری ہے جو انسان کے تعلقات کو ختم کر دیتی ہے۔ ایک لڑکا جو اپنی ذات سے پریشان رہا ہے۔ وہ زیادہ عرصہ تک دوسروں کا خیال نہیں رکھ سکتا۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کو اپنے ہی لوگوں میں عزت اور آبرو مل جائے۔ اس طرح بزدلی کے اندر خود پسندانہ حجاب جو یانہ رویہ پیدا ہو جاتا ہے جو کہ اس کے سماجی رجحانات کو تباہ کر دیتا ہے ایک بزدل آدمی کو ہر وقت یہ خطرہ لاحق ہوتا ہے کہ کسی وقت لوگ اس کا مذاق نہ اڑائیں یا اس کو نظرانداز نہ کر دیا جائے۔ اس لیے اس کا دارومدار دوسروں کی رائے پر ہوتا ہے۔ وہ ایک ایسے انسان کی طرح ہو جاتا ہے جو دشمن کے ملک میں رہتا ہو، ایسا شخص یقیناً شبہ، حسد اور خود پسندی کے جذبات کو ترقی دے گا۔

اس قسم کے بزدل بچوں کا معاملہ آخرکار بڑا نازک ہو جاتا ہے۔ ایسے بچے کسی کی عزت نہیں کرتے اور کسی دوسرے کی عزت کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اس لیے جب کوئی دوسروں کو نیچا کرتے ہوئے ان سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے تو یہ اس کی کمزوری کی نشانی ہے جس کے خیالات دوسروں کے متعلق معاندانہ ہوں۔ ان کو ایسے خیالات سے موڑ دینا استاد کا کام ہے اور یہ ان لوگوں کے ذریعے سے دور نہیں ہو سکتے جنہوں نے لڑکپن میں اس قسم کی صرف علامات دیکھی ہوں نیز وہ آدمی جس نے حقیقی طور پر بچے میں اس کمزوری کو نہیں دیکھا ہے۔ وہ بھی اس کا علاج نہیں کر سکتا۔ جب بچے کا آئندہ مستقبل پر اعتماد ختم ہو جاتا ہے تو وہ حقیقت سے منہ موڑ لیتا ہے اور اپنی زندگی کے ایک بے کار پہلو کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ اس بات کا معلوم کرنا کہ بچہ مدرسے میں مایوس تو نہیں ہوتا ایک معلم کا اہم کام ہی نہیں بلکہ ایک فریضہ ہے۔ کیا ایک ایسا لڑکا جس کے اندر پہلے ہی سے احساس کمتری ہو وہ اپنے استاد او ساتھیوں کے ساتھ

وہ کر اپنے آپ پر اعتماد پیدا کر سکتا ہے؟ یہ کام استاد کے بس کا نہیں کیوں کہ بچہ اس وقت تک نیا سبق نہیں سیکھتا جب تک کہ اس کے سامنے ایک روشن مستقبل نہ ہو۔

بعض اوقات نا امیدی اور مایوسی محض وقتی طور پر ہوتی ہے البتہ یہ عام طور پر بچوں کی خواہشات کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً ایک لڑکے نے امتحان دیا اور اس میں کامیاب ہو گیا لیکن جب اس کو مجبوراً تعلیم ترک کر کے کوئی ملازمت تلاش کرنی پڑی تو وہ نا امید ہو گیا اس کے علاوہ بعض بچے جب کسی امتحان میں کوئی نمایاں حیثیت حاصل نہیں کرتے تو وہ کچھ عرصے کے لیے اپنی پڑھائی کو ترک کر دیتے ہیں۔ اس طرح وہ چار و ناچار جو کہ وہ متواتر کرتے رہے تھے اس کے اندر تعطل پیدا ہو جاتا ہے اور یہ تعطل ایک ذہنی الجھن یا ذہنی بیماری کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔

اگر ایسے بچوں کی مایوسی کو ختم نہ کیا جائے تو ان میں یہ عادت پیدا ہو جائے گی کہ وہ کبھی کسی کام کو پورا نہ کریں گے۔ اور جب وہ بڑے ہو جائیں گے تو ایک کام کو کرنے کے دوران میں فوراً دوسرا کام بھی ساتھ ہی شروع کر دیں گے۔ اور ان کو کبھی اس بات کا خواب و خیال بھی نہ ہوگا کہ کسی کام کی تکمیل ان کے لیے فائدہ مند بھی ہو سکتی ہے یا نہیں۔ اس طرح وہ ہمیشہ شکست اور ناکامی سے ڈرتے رہیں گے۔ اس لیے بچے کی ذاتی خصوصیات کو بنانا بہت زیادہ اہم ہے بھی بچے سے صرف سوالات کے ذریعے یہ معلوم نہیں کیا جا سکتا کہ وہ بچہ اپنے متعلق کیا خیالات رکھتا ہے۔ اگر ہم بچوں سے اس قسم کے سوالات پوچھیں گے تو وہ غیر یقینی اور مبہم جواب دیں گے بعض بچے کہیں گے کہ وہ بالکل تندرست و توانا ہیں لیکن بعض اپنے آپ کو بالکل نا اہل بتائیں گے۔ چناں چہ ان خیالات کی بنا پر بچہ کئی بار اپنے آپ کو کہتا ہے کہ میں کسی قابل نہیں۔ میں بہت نالائق ہوں۔ کوئی لڑکا ہی ایسا ہوگا جو کہ ان حملوں سے متاثر نہیں ہوتا۔ لیکن بعض لڑکے ایسے بھی ہوتے ہیں جو کہ اپنی لیاقت کا کم اندازہ لگاتے ہوئے اپنی خودی کی حفاظت بڑے تحمل اور بردباری سے کرتے ہیں۔

اگر ہم کسی لڑکے سے سوال کریں اور وہ اپنے خیالات کو واضح نہ کر سکے تو بہر حال ہم اس

ڈھنگ کو دیکھ سکتے ہیں کہ جس کے ذریعہ وہ اپنی مشکل کو حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مثلاً وہ ایک پُر اعتماد اور فیصلہ کیے ہوئے طریقے کی طرف بڑھتا ہے اور یا وہ ایسی علامات ظاہر کرتا ہے جو عام طور پر مایوس بچوں کے اندر پائی جاتی ہیں، اس میں ایک علامت ہچکچانا ہے، یہ بات ایک مثال سے واضح ہو سکتی ہے۔ ایک بچہ جرأت سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے لیکن جوں جوں وہ بڑھتا ہے اس کی رفتار دھیمی پڑتی جاتی ہے اور اپنے کام کے مقابل میں تھوڑے سے فاصلے پر بالکل ساکن ہو جاتا ہے۔ ایسے بچوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ذہنی لحاظ سے غیر حاضر ہیں۔ ایسے بچے عام آدمیوں کی طرح کام کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ ان کے سامنے دقت رہتی ہے۔ بعض اوقات بچے اپنے بزرگوں کا مذاق اڑاتے ہیں اتنے تیز ہوتے ہیں کہ بڑے سمجھتے ہیں کہ ان بچوں میں عقل کی کمی ہے۔ اگر ہم ان تمام چیزوں کو اپنی نظر کے سامنے رکھتے ہوئے انفرادی نفسیات کی روشنی میں مطالعہ کریں تو ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ اس تمام مشکل کی وجہ صرف اپنے اوپر اعتماد کی کمی ہے۔ ہم اکثر دیکھتے ہیں کہ بعض بچے جن میں برتری حاصل کرنے کا بے پناہ جذبہ ہوتا ہے ان کے دل میں کسی دوسرے شخص کے لیے ہمدردی کا جذبہ نہیں ہوتا۔ ایسے بچے کسی قانون کی پرواہ نہیں کرتے وہ خود غرض اور لالچی ہوتے ہیں اور جب ان کو کوئی راز معلوم ہو جاتا ہے تو اس کی آڑ لے کر دوسروں کے لیے تکلیف کا باعث بن جاتے ہیں۔ لیکن الٹا۔ ہم بچوں میں جن کا چال چلن قابل سرزنش ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے اندر ایک ایسا رجحان ہوتا ہے جو بالکل واضح طور پر انسانی ہوتا ہے بعض مرتبہ ایسے بچوں کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ انسانی نسل سے تعلق رکھتے ہیں، اگر ان کی خودی کا اور ان کی متعلقہ دنیاوی چیزوں سے تعلق کا موازنہ کیا جائے تو یہ کسی نہ کسی صورت میں واضح ہو جاتا ہے۔ اگرچہ جتنی زیادہ اس کی زندگی کی اسکیم تعاون سے علیحدہ ہوگی اتنا ہی زیادہ اس کے اندر سماجی جذبہ کم ہو جائے گا۔ ہمیں چاہیے کہ ان اظہار کی تلاش کریں جو کہ چھپے ہوئے احساس کم تری کو دھوکہ دیتی ہے، یہ جملے لامحدود ہیں اور یہ اظہار بچے کی نظر سے شروع ہوتے ہیں۔ آنکھ محض ایک عضلہ نہیں جو کہ شعاعوں کو جذب کر کے ان کو آگے

نے جاتا ہے۔ بلکہ یہ ایک ایسا عضلہ ہے جو کہ سماجی ذرائع کے کام آتا ہے۔ جس انداز سے ایک آدمی دوسرے کی طرف دیکھتا ہے وہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس آدمی کا دوسرے کے ساتھ منسلک رہنے کا کتنا رجحان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نفسیات کے ماہروں اور مصنفوں نے انسانی نظریہ پر اس قدر زور دیا ہے۔ اگر ہم یہ دیکھنا چاہیں کہ کسی دوسرے آدمی کا ہمارے متعلق کیا نظریہ ہے تو ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ ہمیں کس نظر سے دیکھتا ہے۔ ہم یہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ اس کی نظر میں کتنی جان ہے۔ لیکن اس میں بھی غلطی کا امکان ہے۔ کسی شخص کے نسل انسانی کے ساتھ تعلقات کو پرکھنے کے لیے یہ زیادہ موزوں اور صحیح طریقہ ہے۔

یہ اچھی طرح واضح ہے کہ وہ جوان بچے جن کے چہروں سے جوانی ظاہر نہیں ہو سکتی ان پر احساس کمتری کا شبہ ہوتا ہے۔ یہ نظری مشاہدہ بعض اوقات یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ کسی بڑے کام کو نہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چاہے یہ کوشش ایک قلیل مدت کے لیے ہو۔ اس سے بچے کی کوشش ظاہر ہوتی ہے جو کہ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ سے علیحدہ ہونے کی کوشش کرتا ہے اگر آپ کسی بچے کو اپنے قریب بلالیں تو وہ عقلاً آپ کے قریب آجائے گا اس سے اس کا رجحان ظاہر ہو سکتا ہے۔ بعض بچے کچھ دور ہی کھڑے رہتے ہیں۔ پہلے اپنے گردوپیش کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اور اگر آنا بہت ہی زیادہ ضروری ہو تو پھر ہی قریب آتے ہیں۔ ایسے بچوں کو غیر معمولی شبہ ہوتا ہے کیوں کہ ایسے بچوں کو اس سے پہلے کوئی نہ کوئی ایسا تجربہ ہوتا ہے جو کہ ان کے اندر ہچکچاہٹ کا عنصر پیدا کر دیتا ہے، جس کی اصل وجہ یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنی یک طرفہ عقل کا استعمال کرتے ہیں بچے کا اپنے والدین یا استاد کو دیکھنے کا رجحان بھی ایک بہت دل چسپ بات ہے اور یہ مشاہدہ کیا جا چکا ہے کہ وہ شخص جس کے پاس بچہ آزادی سے جاتا ہے وہ اس شخص سے کہیں زیادہ اہم ہے جس کے متعلق بچہ کہتا ہے کہ اس سے اُسے محبت ہے۔

ایسے بچے بھی ہوتے ہیں جو اپنے طرز گفتگو، اپنے جسم، اپنی عزت، اپنی گرج دار آواز اور اپنی جرات میں اعتماد اور جراءت کا احساس ظاہر کرتے ہیں۔ دوسرے بچوں کو اگر کہا جائے

وڑ جاتے ہیں۔ اور اپنے اس احساس کمتری کو دھوکہ دیتے ہیں۔

اگر ہم احساس کمتری کی تفتیش کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ جو کہ اس کو بذات خود پیدا شدہ احساس تصور کرتے ہیں لیکن اس خیال کو مصدق قرار نہیں دیا جا سکتا کیوں کہ کوئی بچہ خواہ کتنا ہی جراءت مند کیوں ہو اس کو ڈرایا جا سکتا ہے۔ وہ بچہ جس کے والدین ڈرپوک ہیں نفسیاتی طور پر بزدل ہوگا اس کی وجہ یہ نہیں کہ اس نے اس بزدلی کو وراثت میں لے لیا ہے بلکہ یہ بات ہے کہ اس نے ایک ایسے ماحول میں پرورش پائی ہے جس کے اندر خوف کا عنصر پایا جاتا تھا اور جس کا اثر یہ ہوا کہ اس کے ذہن میں یہ خوف سرایت کر گیا۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ بچے کی پرورش میں خاندان کی فضا اور ماں باپ کا چال چلن بہت اہم ہیں۔

جسم کے کسی حصے یا دماغ میں طبعی تبدیلی ایسی قابلیت پیدا نہیں کر سکتی کہ کسی انسان میں دوسروں سے تعلقات پیدا کرنے کی خواہش ہو جائے۔

اس کو سمجھنے کے لیے سب سے آسان معاملہ ایک بچے کا ہے جس کا دماغ پیدائشی طور پہ کمزور ہے، جو زمانہ ماضی میں بیمار رہا ہے اور اس کی کمزوری نے اس کی زندگی پر پردہ، دباؤ ڈال دیا ہے۔ ایسے بچوں کو اپنے آپ پر ضبط نہیں ہوتا اور وہ دنیا کو دشمنانہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ ایک کمزور بچے کو کوئی ایسا آدمی تلاش کرنا چاہیے جو کہ اس کی زندگی کو آسان بنا دے جو کہ اپنے آپ کو بچے کے لیے وقف کر دے اور جو اپنی کوشش اور حفاظتی رویے سے بچے میں ایک زبردست احساس کمتری پیدا کر دے کیوں کہ بچوں کا قد اور ان کی طاقت نوجوان کی نسبت کم ہوتی ہے۔ اس لیے ان کے اندر احساس کمتری کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ بچے کے اس احساس کو صرف اس بات سے پختہ بنایا جا سکتا ہے کہ بچے تو صرف دیکھنے کے لیے ہوتے ہیں اور ان میں بولنے کی طاقت نہیں ہوتی۔

یہ تمام خیالات بچے کے اس احساس کو زیادہ کر دیتے ہیں کہ وہ ایک ایسی حالت میں ہے، جس سے کسی کو اس سے فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ بچے کا یہ پہچان جانا کہ وہ دوسروں سے کمزور اور چھوٹا ہے اس کے اندر کمتری کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ جوں جوں وہ سوچتا ہے اتنا ہی اس کا یہ

جذبہ بڑھتا جاتا ہے۔ اس طرح اس کے پہچاننے کی کوشش کو زبردست دھکا لگتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے اندر اس قسم کے خیالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ بجائے اس کے کہ وہ اپنی زندگی کو اس سانچے میں ڈھالے کہ اس کی زندگی اس کے مطابق ہو جائے وہ اپنا ہی کلیہ گھڑ لیتا ہے کہ اپنے ہی آپ کو پیش نظر رکھو۔

یہ بالکل واضح طور پر کہا جا سکتا ہے کہ کم زور اپاہج اور بدصورت بچے میں احساس کمتری شدید ہوتا ہے۔ اس کا اظہار وہ دو باتوں میں کرتا ہے یا تو وہ جب کسی کے ساتھ بات کرتا ہے تو شرم محسوس کرتا ہے یا اس کی حرکات ظالمانہ ہوتی ہیں۔ اگر ہر دو قسم کی علامات کو دیکھا جائے تو یہ بالکل ایک دوسرے سے مختلف نظر آتے ہیں۔ لیکن غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ ان کی وجہ تو دراصل ایک ہی ہے۔ اگر ایسے بچے کسی چیز کو پہچاننے کی کوشش کریں تو وہ اپنے ہی آپ کو دھوکا دے جاتے ہیں، مثلاً اگر ایک وقت میں کسی چیز کو چھوٹا بتائیں گے تو دوسری جگہ اسی چیز کو بڑا بتائیں گے، ایسے بچوں کے سماجی خیالات کسی پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ کیوں کہ ایسے بچوں کو یقین ہو جاتا ہے کہ وہ زندگی سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے اور یا وہ زندگی کے لیے کوئی بھلا کام نہیں کر سکتے اور اگر یہ بات نہیں تو ان کے خیالات ہمیشہ زندگی کے روشن پہلو کی بجائے تاریک پہلو کی طرف رخ کر لیتے ہیں اور ایسے بچوں کا نقطہ نظر لیڈری یا بہادری ہو جاتا ہے۔

اگر کوئی بچہ ایک عرصہ دراز سے اپنے آپ کو کسی غلط راستے پر چلانے کی کوشش کرتا رہا ہو تو ایسے بچے کے ساتھ پہلی ہی گفتگو میں اس کے خیالات کو بدلا نہیں جا سکتا، اس کے لیے استاد کو صبر کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی ایسا معاملہ ہو کہ کسی بچے نے آگے بڑھنے کی کوشش کی ہو لیکن وقتی طور اس کی کوشش میں کوئی چیز حائل ہو گئی ہو تو اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ بچے کو یقین دلا دیا کہ ترقی یک دم حاصل نہیں ہو سکتی اس سے بچے کو حوصلہ ہو جاتا ہے اور وہ ناامید نہیں ہو اگر کوئی بچہ دو سال سے حساب میں کمزور ہے تو وہ اس کمی کو دو ہفتوں میں پورا نہیں کر سکتا ہم یہ بار بار دیکھتے ہیں کہ ناقابلیت کی کسی غلط نشو و نما یا تخصیت کی غلط بناوٹ کی وجہ سے یہ

ہوتی ہے۔

کسی شخص میں ناقابلیت یا جذبہ ترحم کی کمی اس کی دماغی کمزوری کا ثبوت نہیں ہیں۔ کم زور دماغ والے بچوں میں جسمانی طور پر ایسی علامات نمودار ہوتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ذہنوں کی غلط طور پر پرورش کی گئی ہے۔ یہ جسمانی نقص ان غدوروں کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے جو کہ دماغ کی نشوونما میں حصہ لیتے ہیں۔ بعض اوقات وقت کے ساتھ ساتھ یہ نقائص بھی ختم ہوجاتے ہیں اور صرف نفسیاتی علامات باقی رہ جاتی ہیں۔ یعنی کہنے کا مقصد یہ ہے کہ کم زوری جسمانی نظام کی وجہ سے تھی۔

ہم یہ دیکھتے ہیں کہ نفسیاتی احساس کمتری اور خودی کا رویہ کسی گذری ہوئی جسمانی احساس کمتری یا کمزوری کا باعث ہوسکتی ہے۔ لیکن ممکن ہے کہ یہ کسی ایسی چیز سے پیدا ہوا ہو جس کا جسمانی احساس کمتری کے ساتھ کوئی تعلق نہ ہو۔ ممکن ہے کہ یہ خرابیاں خراب اور غلط نشوونما کا نتیجہ ہوں یا کسی ایسے ماحول کا نتیجہ ہوں جس کے اندر نرمی اور شفقت کا عنصر نہ پایا جاتا ہو۔ اس قسم کے حالات میں بچے کی زندگی وبال جان بن جاتی ہے اور اس بچے کا رویہ اپنے گردوپیش میں ظالمانہ ہوجاتا ہے۔ اس لحاظ سے جسمانی احساس کمتری کے جو نتائج ہوں گے وہ اگر ان کے بالکل مطابق نہیں تو کم سے کم ان جیسے ضرور ہوں گے۔

ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے کہ ایسے بچے کی تربیت بہت مشکل ہے جس نے محبت اور شفقت کا نام تک نہ سنا ہو، ایسے بچے ہر شخص کو دشمنانہ نظر سے دیکھیں گے، اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ایسے ماحول میں پرورش پائی ہے۔ اگر ایسے بچوں کو مدرسے جانے پر مجبور کیا جائے تو وہ پژمردہ ہوجاتے ہیں اور وہ اپنے آپ کو مقید تصور کرنے لگتے ہیں اور جہاں تک ان کی قوت ان کا ساتھ دیتی ہے وہ اس نئی معیت کے خلاف ایک محاذ قائم کر لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا رویہ ایسے بچوں کے حق میں مناسب نہیں ہوتا جو اپنے بچپن کے دن خوشی میں کاٹتے ہیں۔

اس قسم کے آزش زدہ بچے عام طور پر ایسے انسان بن جاتے ہیں جو دوسروں کی زندگی کو تلخ کر دینے کے درپے ہوتے ہیں۔ ایسے بچے چونکہ اتنے طاقتور نہیں ہوتے کہ اپنے گرد و پیش پر پوری طرح حاوی ہوں۔ اس لیے وہ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے دوسرے ذرائع اختیار کرتے ہیں یعنی بجائے اپنے آپ کو ابھارنے کے اپنی کمزوری کو دباتے ہیں۔ بظاہر دوستی کی وجہ سے اپنے آپ کو بہت بھولا بن کر دکھاتے ہیں اور یہ دوستی اور یہ دوستی اس وقت تک قائم رہتی ہے جب تک کہ دوسرے اپنے آپ کو خود ان کے پنجوں میں نہ ڈال دیں۔ بعض بچے ایسے بھی ہوتے ہیں جو کہ ایسے لڑکوں سے دوستی کرتے ہیں جن کی حالت ان سے بھی گئی گذری ہوتی ہے۔

اس طرح احساس کمتری ان نونہالوں اور چمن ہستی کے ان کھلتے ہوئے شگوفوں کی زندگی پر ایسا گہرا سایہ ڈال دیتا ہے جس کی وجہ سے ان کی شخصیت کی سوتیں خشک ہو جاتی ہیں اور وہ استاد اور سماج کے لیے ایک مسئلہ لاینحل بن جاتے ہیں۔

برطانوی استادوں کی قومی تنظیم

نذیر احمد

جدید ترقی یافتہ معاشرے کی ایک اہم خصوصیت گروہی مفادوں کی تنظیم ہے۔ ہر پیشہ ورانہ گروہ اپنے پیشہ ورانہ وقار اور معیاروں کو قائم رکھنے اور اپنے جائز مفاد کی حفاظت کے لیے اپنے آپ کو منظم کرتا ہے اور اپنے جماعتی مسائل کا حل جماعتی قوت کے بل بوتے پر تلاش کرتا ہے۔ ہر ترقی یافتہ معاشرے میں معلمی ایک پُروقار اور کلیدی پیشہ ہے۔ اس لیے ترقی یافتہ ملکوں میں استادوں کی قومی تنظیموں نے خود اپنے لیے اور ملک و قوم کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ اس ضمن میں برطانوی استادوں کی حالیہ اخلاقی فتح کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

پنشن بل کا جھگڑا

برطانیہ کے موجودہ وزیر تعلیم سر ڈیوڈ ایکلز ہیں وہ چند ماہ گذرے مس ہارس برو کی جگہ وزارت میں لیے گئے تھے۔ مس ہارس برو کو استادوں کے سامنے جھکنا پڑا تھا۔ یہ بات بعض قدامت پسند اراکین پارلیمنٹ کو بہت ناگوار گذری تھی وہ چاہتے تھے کہ مس ہارس برو کا جانشین کوئی ایسا مضبوط مزاج وزیر تعلیم ہو جو استادوں کا مزاج درست کر دے۔ سر ڈیوڈ نے وزارت تعلیم کا قلم دان سنبھالا تو ان سے بڑی بڑی توقعات وابستہ کی گئیں۔ حکومت نے انہیں اپنا ایک مضبوط ستون خیال کیا۔ لیکن آج وہ اسی حکومت کے لیے ایک بوجھ بن کر رہ گئے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے رسوائے عالم پنشن بل کے طفیل استادوں کی ناراضگی خرید لی ہے۔ اور اس کلیدی پیشے کی ناراضگی کسی بھی حکومت کو راس نہیں آسکتی۔

پنشن بل کے تنازعے کی مختصر شرح یہ ہے کہ اب تک برطانوی استادوں کو اپنی پنشن کے حصے کے طور پر تنخواہ کا پانچ فی صد ادا کرنا پڑتا تھا۔ سر ڈیوڈ نے پارلیمنٹ میں ایک مسودہ قانون پیش کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ استادوں کا حصہ پانچ فی صد سے بڑھا کر چھ فی صد کر دیا جائے۔ اس کے جواز میں انہوں نے دلیل یہ دی کہ دوسرے سرکاری ملازموں کے مقابلے میں استادوں کو اپنی پنشن کے لیے کم حصہ ادا کرنا پڑتا ہے جو ان کے لیے ایک امتیازی رعایت ہے، یہ امتیازی رعایت ختم ہو جانی چاہیے۔ استادوں کو تسلی دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ تنخواہ میں معمولی سی کٹوتی کے بڑھ جانے سے ان کا انکم ٹیکس بھی کم ہو جائے گا

اس طرح وہ حقیر سی مالی قربانی کر کے ایک بھاری قومی خدمت انجام دیں گے۔

استادوں کی طرف سے مخالفت

اخباروں اور عوام نے اوّل اوّل اس مسودہ قانون کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ بلکہ جب استادوں نے من حیث الجماعت اس کے متعلق ناپسندیدگی ظاہر کی تو ٹائمز جیسے مؤقر اخبار نے بھی استادوں کے موقف کا مذاق اڑایا اور وزیرِ تعلیم کے استدلال کی پُرزور حمایت کی۔

لیکن برطانوی استاد ایک مؤثر قومی تنظیم میں منسلک ہیں۔ ان کے اہم جماعتی مفاد کو اس آسانی سے کچل دینا آسان نہ تھا۔ انگلستان ان دنوں کثرتِ زر کے خوفناک مسئلہ سے دوچار ہے۔ ضروریاتِ زندگی کی قیمتیں دن بدن بڑھتی جا رہی ہیں۔ ان حالات میں استادوں سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ اپنی پنشن کے لیے پہلے سے زیادہ حصّہ دیں۔ صریحاً ان کی تنخواہ میں کمی کے مترادف تھا۔ استاد بھلا اس حیثیت کو خاموشی سے کیوں کر قبول کرنے والے تھے۔ انہوں نے اس چیرہ دستی کے خلاف احتجاج کیا اور ایسی شدت سے احتجاج کیا کہ جلد ہی رائے عامہ بھی ان کی ہم نوا ہو گئی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ وزارتِ تعلیم کے نقطۂ نگاہ کے سب سے بڑے حامی روزنامہ ٹائمز کو بھی اپنا لب و لہجہ بدلنا پڑا۔ ایڈیٹر کا کی یہ انقلاب آفرین تبدیلی حالیہ سالوں میں برطانوی استادوں کی سب سے بڑی اخلاقی فتح ہے۔

فتح کے اسباب

اس میں کلام نہیں کہ ٹھنڈے دل سے سوچنے پر برطانوی استادوں کا نقطۂ نگاہ بڑا معقول اور مبنی بر حقائق نظر آتا ہے۔ لیکن اول اول اس نقطۂ نگاہ کو پیش کرنے کے لیے ہمت اور بے باکی کی ضرورت تھی۔ اس تاریخی اہم کا ایک ناقابلِ فراموش پہلو یہ ہے کہ استادوں کی قومی تنظیم کی باگ ڈور جن لوگوں کے ہاتھوں میں ہے وہ اس ہمت اور بے باکی سے عاری تھے وہ مصلحت اور عافیت کوشی کے حق میں تھے۔ چنانچہ جب مسئلے پر غور کرنے کے لیے پہلا عام جلسہ طلب کیا گیا تو ان عہدہ داروں نے پوری شد و مد کے ساتھ مصلحت کوشی کے راستہ کی تلقین کی لیکن ملک کے طول و عرض سے آنے والے مندوبین نے اس رائے کو سختی سے ٹھکرا دیا۔ انہوں نے مضبوط و انتہائی کارروائی کا مطالبہ کیا اور یک زبان ہو کر کہا کہ استادوں کی آواز کو مؤثر بنانے کے لیے ان کی طرف سے جوابی کارروائی ضروری ہے۔ اس جوابی کارروائی کی سب سے پہلی شق یہ تجویز کی گئی کہ قومی بجٹ کی سکیموں سے استاد علیحدہ تعلق ہو جائیں۔ مندوبین کا یہ مطالبہ اس شدت کے ساتھ پیش ہوا کہ عہدہ داروں کو سر جھکانے کے سوا چارہ نظر نہ آیا۔

استادوں کی یہ جوابی کارروائی محض خطرے کی گھنٹی کی حیثیت رکھتی تھی۔ استادوں کے سامنے ہڑتال اور اس قسم کے دوسرے انتہائی ذرائع موجود تھے۔ لیکن انہوں نے برطانوی روایات کے حسب حال انتہائی قدم اٹھانے سے پہلے عوام کو اپنے غم و غصہ سے آگاہ کرنا ضروری سمجھا۔ ملک بھر کے مدرسوں میں قومی بچت کی جو سکیمیں چل رہی ہیں استادوں کے بے تعلق ہو جانے سے ان پر فوری اثر پڑا۔ اس چیز نے عوام کو ایک دم چونکا دیا۔ استادوں کے مطالبوں پر ہر جگہ کان دھرا جانے لگا۔ وزارت تعلیم اور استادوں کے دلائل کو ہر نقطۂ نگاہ سے تولا گیا۔ بالآخر رائے عامہ نے اپنا فیصلہ واضح طور پر استادوں کے حق میں دے دیا۔ ملک کے بیشتر اخباروں اور رسالوں نے استادوں کی تائید کی اور وزیر تعلیم کے استدلال کو بودا اور دور از حقائق قرار دیا۔

پارلیمنٹ کا فیصلہ

رائے عامہ کے اس فیصلے نے ثابت کر دیا کہ استادوں کے مندوبین کی رائے صحیح تھی اور قومی تنظیم کے رہنما سلامت روی کا جو راستہ تجویز کر رہے تھے وہ غلط تھا۔ لیکن اس کے باوجود پارلیمنٹ میں استادوں کو فتح حاصل نہ ہو سکی۔ وزیر تعلیم پوری سختی کے ساتھ اپنے استدلال پر ڈٹے رہے۔ جب پارلیمنٹ میں پنشن کے مسودہ قانون کی تیسری خواندگی کی گئی تو انہوں نے انہی فرسودہ دلائل کو دہرایا جن کا بارہا تمسخر اڑایا جا چکا تھا۔ آخر یہ مسودہ قانون صرف چند آرا کی کثرت سے منظور ہو گیا۔ وزیر تعلیم نے اس موقع پر استادوں کو صرف ایک تسلی دی وہ یہ کہ پنشن کے لیے زیادہ حصہ ادا کرنے سے ان پر جو مالی بوجھ پڑتا ہے اس کا ازالہ بہت جلد تنخواہوں میں اضافے سے ہو جائے گا۔ اس یقین دہانی پر تبصرہ کرتے ہوئے ملک کے اکثر اخباروں نے لکھا ہے کہ اگر حکومت کو یہی کرنا تھا کہ ایک ہاتھ سے استادوں کی جیب سے کچھ پونڈ نکال لے اور دوسرے ہاتھ سے ان کی جیب میں تقریباً اتنی ہی رقم ڈال دے تو اسے اس سارے سودے میں کیا ہاتھ آیا؟ یہی نا کہ اس نے ایک کلیدی پیشے کی ناراضگی ہمیشہ کے لیے خرید لی۔

برطانوی استادوں کی جماعتی قوت کا یہ مظاہرہ پسماندہ ملکوں کے استادوں کے لیے بڑا سبق رکھتا ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ پاکستان کے استاد بھی انہی خطوط پر ایک مضبوط قومی تنظیم قائم کریں۔

انفرادیت

محمد عامر فاروقی

انسانی زندگی کی تعمیر میں دو چیزیں خاص طور پر نمایاں ہیں ایک انسان کی ذات یا انفرادیت اور دوسری وہ جماعت جس سے وہ فرد متعلق ہوتا ہے جس میں اس کا اٹھنا بیٹھنا، چلنا، پھرنا، کھانا، پینا سب ہی ہوتا ہے۔ مفکرین کا اس بارے میں اختلاف ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ فرد اصل ہے، اسی کی ترقی اور نشوونما کی کوشش اصل تعلیمی مقصد ہے۔ دوسرا گروہ اس نظریہ کا حامی ہے کہ افراد تو اصل سوسائٹی یا معاشرہ کے عناصر ہیں ان کی ذات کی قربانی سے اگر کوئی سوسائٹی ارتقائی منازل آسانی سے طے کر سکے تو یہ قربانی ضروری ہے اور یہی تعلیم کا مقصد ہونا چاہیے۔

بادی النظر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں متضاد تعلیم ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ واقعی ایسا ہے یا نہیں۔ اس کے لیے ہمیں ایک ایک نظریہ کو لے کر جانچنا پڑے گا۔

آدمی میں کچھ جبلی قوتیں موجود ہیں ان میں سے دو سب سے اہم ہیں ایک اپنی جان کی حفاظت اور اس کی داشت و پرداخت، دوسری اپنی حیثیت کو نمایاں کرنے اور اپنی فوقیت کو تسلیم کرانے کی خواہش۔ ان دونوں جبلتوں کی تشفی کے لیے کچھ نہ کچھ سوسائٹی کا سہارا ضروری ہے۔ تاہم جہاں تک دوسری جبلت کا تعلق ہے۔ کم و بیش اس کا بار خود فرد واحد پر پڑتا ہے اگر کسی کی یہ جبلت اپنے اظہار کے لیے صحیح موقع نہیں پاتی تو وہ شخصیت یا تو میکانکی ہو کر رہ جاتی ہے۔ یعنی اس کی اپنی رائے پر دوسروں کی رائیں حاوی ہو جاتی ہیں اور بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ وہ جس راستہ پر شروع سے چلا جاتا ہے۔ اس ڈگر سے ایک قدم بھی ادھر ادھر نہیں

ہٹ سکتا۔ خاص مواقع پر بھی اپنی رائے کے استعمال سے قاصر رہتا ہے بشل پتھر کے نیچے دبی ہوئی گھاس کے...... اس صورت میں اس کا وجود نہ اپنے لیے مفید ہوتا ہے اور نہ غیروں کے لیے ایسی مثالیں ہندوستان میں پہلے بہت ملتی تھیں کہ لوگ سا خود سفر نہیں کر سکتے تھے۔ مسلمانوں میں تعلیم تہذیب کے نام لیوا خاندانوں کی عورتوں میں یہ کمی اب بھی پائی جاتی ہے وہ بغیر کسی مرد کے اپنی ذات کو کوئی حیثیت نہیں دیتیں۔ اس طرح کی کمی دور کرتا اور مختلف ذرائع سے ایک بلند کردار کی تشکیل کا نام انفرادیت ہے۔

تعلیمات میں انفرادیت کے مقصد پر سر پرسی نن نے اپنی کتاب (EDUCATION ITS DATA AND FIRST PRINCIPLES) میں نہایت وضاحت سے لکھا ہے اور انفرادیت کے مقصد پر زور دیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ برطانیہ میں "ہابس" سے لے کر اب تک جتنے فلسفی گذرے ہیں سب انفرادیت پسند رہے ہیں بقول پرسی نن "انسانی دنیا میں نہ صرف مردوں اور عورتوں (بحیثیت افراد) کی بے روک ٹوک حرکات کے ذریعہ خوبیوں کی نشوونما ہوتی ہے۔ بلکہ خود انہی آزادانہ حرکات میں خوبیاں پنہاں ہوتی ہیں۔ اس لیے تعلیم کا مقصد ایسا ہونا چاہیے کہ اس حقیقت سے مطابقت رکھ سکے"۔ وہ اس طرح کا نظریہ چاہتا ہے جو "انفرادیت پر زور دے اور اس کے حقوق کی حفاظت کرے" "تعلیم کو ہر شخص کے لیے ایسی شکلیں پیدا کرنی چاہئیں جن سے اس کی انفرادیت کی بہتر سے بہتر طریقہ پر تکمیل ہو سکے تعلیم فرد کو اس لائق بنا دے کہ وہ زندگی کے رنگا رنگ خاکے میں رنگ آمیزی کرنے میں اس حد تک حصہ لے سکے جس حد تک اس کی فطرت اس کو اجازت دے "اس رنگ آمیزی کی نوعیت اس فرد پر چھوڑ دینی چاہیے" تاکہ وہ فرد واحد زندگی گذار کر اور زندگی کے ہنگاموں میں رہ کر اپنا حصہ خود تعمیر کرے کیونکہ ہر شخص کا مقصد زندگی دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ زید کو اگر ایک چیز پسند ہے تو بکر کو وہی ناپسند ہو سکتی ہے جس طریقہ پر الف زندگی گذارنا اچھا سمجھتا ہے ہو سکتا ہے کہ وہی طریقہ دب کے لیے کوفت کا باعث ہو۔

فلسفیانہ دلائل سے ثابت کرنے کے بعد پرسی نن کی توجہ علم حیوانات کی طرف جاتی ہے۔ وہ

فلسفت جانوروں کی مثال لیتا ہے اور ثابت کرتا ہے کہ ان میں انفرادیت موجود ہے، سب سے نمایاں مثال اس کیڑے پر تجربہ کی ہے جو خول میں رہتا ہے، اس تجربہ کے متعلق کچھ لکھنے سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دیکھا جائے کہ یہ کیڑا کس طرح کی زندگی گذارتا ہے۔ اس کے خول کے سامنے ایک طشتری نما چیز ہوتی ہے جس کو غذائی ذروں کے لیے برابر کھولتا اور بند کرتا رہتا ہے۔ تجربہ کرنے والا اس کیڑے کو پانی سے بھرے ہوئے طشت میں رکھتا ہے۔ اس میں ایک زہریلی دوا ڈالتا ہے، شروع میں تو حسب عادت اس دوا کے ذرات کو اندر لے جاتا ہے۔ لیکن دوسری تیسری بار کے بعد جب یہ سموم پانی اس کے پاس پہونچتا ہے تو اپنا طشتری نما منہ یا سونڈ اندر کر لیتا ہے اور دیر تک اندر رکھے رہتا ہے جب بار بار اس کو اسی طرح کے تلخ تجربات سے دو چار ہونا پڑتا ہے تو وہ ایک کش مکش کے بعد اپنا خول چھوڑ دیتا ہے اور نکل بھاگنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرح وہ اپنی خودی یا انفرادیت کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ گائے بھینس بیل، ہرن وغیرہ کے سینگ جنگلی سور کے دانت شیر اور بلی کے پنجے قدرت کی طرف سے عطیے ہیں جو ان کی خودی برقرار رکھنے کے لیے ان کو ودیعت ہوئے ہیں۔ انہی تمام مثالوں کی مدد سے وہ اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ قدرت کے کارخانے میں بھی انفرادیت کی بقا ملحوظ ہے۔ برگسن کی ان مثالوں کی وجہ سے بعض نقاد اسے فطرت پرست کا خطاب دیتے ہیں حالانکہ ان مثالوں سے اس کا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ وہ حیوانات اور نباتات کے الجھاؤ میں پھنس کر رہ جائے۔ اس غلط فہمی کا سبب انفرادیت کا لفظ ہے۔ علم حیوانات میں اس لفظ کے معنی ہیں فرد ہونے کی حالت جو اپنا وجود دوسرے افراد سے الگ رکھے۔ برگسن کے یہاں انفرادیت نصب العین بھی اس کی منزل مقصود ہے۔ یہ وہ روحانی تکمیل ہے جسے ہر فرد کو حاصل کرنا چاہیے۔ کوئی فرد کسی مقام پر بھی انفرادی طور پر مکمل نہیں کہا جا سکتا اس لیے اسے اس کو لگاتار کوشش کرتے رہنا چاہیے۔

مختصر یہ کہ خودی یا انفرادیت سے مراد اپنی ذات کا ادراک ہے۔ یعنی ہر فرد کو یہ جاننا چاہیے کہ اس کی بھی کوئی حیثیت ہے، وہ بھی اس کارگاہ عالم میں بہت کچھ کر سکتا ہے۔ کبھی کبھی

لوگ۔ احساس خودی کو اظہار خودی کے معنی میں سمجھ لیتے ہیں، حالاں کہ یہ دو مختلف چیزیں ہیں، اظہار اور ادراک میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اظہار خودی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فرد کی فطرت کا جو تقاضا ہوتا ہے وہ اس کے مطابق کام کرتا ہے۔ بلا لحاظ اس کے کہ اس کی ان حرکتوں سے دوسروں کو تکلیف پہنچتی ہے یا آرام۔ وہ اکثر طفلانہ اور بہیمانہ انداز بھی اختیار کر لیتا ہے۔ خودی کے اگر یہی معنی ہیں تو کون ہے جو ایسی خودی کو سراہے گا۔ انفرادیت کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ فرد مطلق العنان ہو جائے خودی کے ادراک سے مطلب یہ ہے کہ ذات ضبط و تنظیم کے شعور کے ساتھ قوی ہو اور مکمل ہونے کی کوشش کرے۔ یہاں پر پھر ایک بار اس بات کی یاددہانی ضروری ہے کہ ادراک خود وہ مقصد ہے جس کا حصول ہر فرد کی تعلیم بلکہ زندگی کی منشا ہونا چاہیے۔ یہ وہ منزل ہے جو ابھی انسانی زندگی میں آئی نہیں نہ جس کا آنا آسان ہے۔

اگر اس سلسلہ میں ہم یونگ کی تنبیہ کو مان لیں تو نامناسب نہ ہوگا وہ کہتا ہے کہ انفرادیت کے معنی یہ نہیں کہ فرد کی برتری معاشرتی ماحول کے خلاف محسوس ہو۔ بلکہ انفرادیت سے مراد وہ روحانی انفرادیت ہے جو فرد اپنی داخلی دنیا میں داخلی تقویت کی مدد سے حاصل کرتا ہے۔ یونگ کا شخصیت کے متعلق بھی ایک نظریہ ہے وہ کہتا ہے کہ "کسی کی شخصیت، اس کے بچپن سے اس میں موجود نہیں ہوتی" اس میں صرف وہ قوتیں موجود ہوتی ہیں جن سے شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم کہاں تک اپنی شخصیت کی تعمیر کر سکتے ہیں؟ اس کا سارا دارومدار اس بات پر ہے کہ کہاں تک حالات حاضرہ اور اپنے محدود وجود سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں تاکہ اس منزل پر پہنچ سکیں جہاں اپنی حرکات و عمل کا تعین ہم خود کر سکیں۔ ہماری زندگی کی سب سے اہم حرکت وجود مطلق کا حصول ہے شخصیت کی نشوونما اور روحانی ارتقا کی صورت میں اس طرح کے وجود کا امکان ہے۔ ہماری ساری زندگی ایک مہم ہے کہ وہ مطلق شخصیت اور روحانی انفرادیت کے حصول میں کس طرح عمر صرف کرے۔ یہاں پر وجود مطلق اور شخصیت مطلق دو الفاظ ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں وجود مطلق یا شخصیت مطلق سے ہرگز خدا کی ذات

مراد نہیں بلکہ ایسی شخصیت مراد ہے جو معیاری کہی جا سکے اور جسے کسی شخص کو شخصیت کہنے میں ذرا بھی پس و پیش نہ ہو۔

یوکن کے یہاں جو روحانی انفرادیت یا شخصیت کا تصور ملتا ہے علم حیوانات کی انفرادیت سے بالکل مختلف ہے۔ اس سے اس کا ذرا بھی لگاؤ نہیں۔ اس کے یہاں یہ مقاصد ہیں۔ آخری منازل ہیں۔ نصب العین ہیں۔ شروع نہیں۔ سافر کی پہلی منزل نہیں۔ اس لیے تعلیمات میں اگر کوئی قابل قبول معنی انفرادیت کی نشو و نما کے ہیں تو بس یہ ہیں کہ قابل قدر جسمانی اور روحانی شخصیت کو پروان چڑھایا جائے۔ اس سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ انسانی شخصیت کے روحانی امکانات تک انتہائی ترقی لطیف ترین اور بہترین چیز ہے۔ یہ خدا کا بہترین شاہکار ہے۔ اب ہم جس طرح پرسی نن کے ہمنوا ہیں یوکن کے اس عقیدہ کی بھی تائید کر سکتے ہیں کہ تعلیم کا مقصد شخصیت کی بلندی و برتری ہے۔

اس کے پہلے ابھی یہ چیز واضح ہو چکی ہے کہ پرسی نن کی انفرادیت کے وہ معنی نہیں ہیں جس مفہوم علم حیوانات یہ لفظ آتا ہے۔ اس کی تائید یوکن کے نظریہ انفرادیت و شخصیت سے ہوتی ہے۔ پرسی نن انفرادیت کے تصور کو واضح طور پر اپنی کتاب (EDUCATION ITS DATA AND FIRST PRINCIPLES) میں بیان کرتا ہے کہ انفرادیت کو اگر زندگی کا نصب العین مان لیا جائے تو یہ بات صاف ہو جائے گی کہ زندگی خود حرکت کرنے والی چیز ہے اور انسانی زندگی آزاد ہے اور اپنے افعال خود متعین کرتی ہے۔ اگر اس کے یہ معنی لیے جائیں کہ انسان اس قدر آزاد ہے کہ وہ اپنی فطرت کے خلاف بھی عمل پیرا ہو سکتا ہے تو یہ نہایت مضحکہ خیز بات ہوگی لیکن اگر انسانی ارادہ کی آزادی سے یہ مراد ہو کہ وہ زندگی پر مستولی ہے تو جائز ہوگا۔ انفرادیت میں اس کا خیال ہے کہ ایک وحدت ہوتی ہے۔ مگر کثرت سے الگ نہیں اور ہر مقصدی عمل میں کثرت میں وحدت ہونا ضروری ہے۔ ایک مصنف جب ایک کتاب تصنیف کرتا ہے تو اس کے لیے اسے کاغذ، قلم، دوات، روشنائی اور اسی طرح کی بے شمار چیزیں درکار ہوتی ہیں۔ مگر آخر میں

اس کثرت کا نتیجہ صرف ایک کتاب کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اقبال کے ہاں بھی انفرادیت یا خودی کا تصور بہت واضح طور پر ملتا ہے وہ ہر چیز میں اسی ایک جوہر کو تلاش کرتا ہے اس کا نظریہ خودی یونگ کے نظریہ شخصیت سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔ وہ بھی روحانی خودی کا قائل ہے وہ اس کی نشوونما عقل کی مدد سے نہیں کرتا بلکہ عشق کی مدد سے کرنا چاہتا ہے اور اس کو اس ارتقائی منزل تک پہونچانا چاہتا ہے جہاں انسانی روح، روح خداوندی سے دو بدو گفتگو کر سکے، وہ کہتا ہے کہ خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے۔ خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے۔

جس چیز کو اقبال نے عشق کہا ہے، اسی کو جرمنی کا مشہور ڈاکٹر فرائڈ قوت ارادی کے نام سے موسوم کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ انسان کی قوت ارادی اس قدر تیز ہوتی ہے کہ اگر وہ چاہے تو بڑی سے بڑی بات کر سکتا ہے، اس کی خودی کبھی پامال نہیں کی جا سکتی، یہ ضرور ہے کہ اس کو دبایا جا سکتا ہے۔ مگر اس دبانے کا نتیجہ اچھا نہیں نکل سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ اگر بچپن میں ایک شخص کو ایک کام سے منع کر دیا جائے تو وہ مان جائے یا دب جائے مگر اس کا وہ جذبہ جو اس حرکت میں شامل تھا مردہ نہیں ہو سکتا، یہ اس کے تحت الشعور میں محفوظ رہے گا اور جب کبھی یہ بیدار ہوگا تو اس کی رو اور شدید اور تیز ہو جائے گی۔ اس کے نزدیک انسانی دماغ کی دو حدیں ہیں، ایک شعوری اور دوسری تحت الشعوری۔ شعوری اور تحت الشعوری حدوں کے درمیان ایک طرح کی روک ہوتی ہے جو تحت الشعور سے خیالات کو شعور میں آنے میں حارج ہوتی ہے۔ باوجود اس کے کہ تحت الشعوری خیالات کا احساس نہیں ہوتا یہ انسانی افعال کے زبردست محرک ہوتے ہیں اور انسان کا کردار تعمیر کرتے ہیں کبھی کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ شعور اور تحت الشعور میں ایک طرح کی جنگ چھڑ جاتی ہے جس کا نتیجہ اکثر مہلک بیماریوں مثلاً فالج، لقوہ، گٹھیا وغیرہ کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ اکثر بچوں کا ہکلاپن اسی کشمکش کا نتیجہ ہوتا ہے۔ متعدد بار یہ تجربہ میں آیا ہے کہ ایک بائیں ہاتھ سے کام کرنے والے بچے کو جب اس سے روکا گیا ہے تو وہ اسی طرح کی کسی نہ کسی چیز میں مبتلا ہو گیا ہے۔ غرض فرائڈ کے نزدیک بھی انفرادیت کی نشوونما تعلیم کا مقصد ہونا چاہیے۔ گو اس نے کبھی اس انداز میں کہیں اس کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ اس نظریہ کو انگلستان میں ہمیشہ سراہا گیا، یہی وجہ ہے وہاں اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ اساتذہ کا ناجائز دباؤ بچوں کے کردار کو تباہ و برباد نہ کر دے۔

لائبریری

محمد ابوالمسنح

ہر وہ مکان جس میں کم سے کم ایک انسان بھی بستا ہے لائبریری کے بغیر تاریک ہے (سسیرو)

گذشتہ چند سالوں میں مجھے اپنی ذاتی حیثیت میں بچوں کی مختلف لائبریریوں کے تحقیقی طور پر دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس سلسلہ میں جو تاثرات میں نے لیے ہیں ان کا ملخص یہ ہے :۔

ابتدائی مدارس :۔ روپے کی کمی کی وجہ سے اول تو اکثر و بیشتر دیہاتی مدارس میں لائبریری میں بچوں کے لیے ایک بھی کتاب نہیں، اور اگر کسی پرانے مدرسہ میں کوئی کتاب ہے بھی تو آج سے تیس سال پہلے کی مہیا کی ہوئی۔

دورافتادہ طلبہ اخبار، رسائل اور لائبریری کے ناموں تک سے ناواقف پائے گئے۔ ایک محتاط اندازہ کے مطابق دو ہزار طلبہ میں سے صرف ایک بچے کو رسالہ یا کسی اخبار کے کالموں کے پڑھنے کا موقع ملتا ہے۔ زائد کتب کے مطالعہ کرنے کا اتفاق تو اس سے بھی کم تعداد کو ہوتا ہے۔

اساتذہ خود بھی اخبارات۔ رسائل اور کتب کے پڑھنے میں کم دلچسپی لیتے ہیں۔ ایک اوسط درجہ مرکزی مدرسہ میں بائیس اساتذہ صرف ایک روزنامہ۔ دو ہفتہ وار اخبار اور چار ماہوار رسالے منگواتے ہیں۔

قصباتی مدارس کی لائبریریوں میں چند ایک کتب ضرور موجود ہوتی ہیں۔ مگر اساتذہ کی سرد مہری کے باعث ان کا استعمال نہ ہونے کے برابر ہے۔

اس درجہ کے بچے کہانیوں کے پڑھنے۔ غیر ملکوں کے بچوں نیز عام پالتو اور وحشی جانوروں کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے از حد مشتاق پائے گئے اور ایسی رنگین و باتصویر کتب جو موٹے حروف میں لکھی ہوئی ہوں اور دو سے تیس صفحات تک کی ہوں بے حد پسند کی جاتی ہیں۔

وسطانی مدارس :۔ طلبہ کے چندے میں سے بالعموم ایک روزنامہ۔ دو چار رسائل اور چند ایک کتب لائبریری میں ضرور منگوائی جاتی ہیں۔ مگر جہاں اخبارات اور رسائل اساتذہ کی نذر ہو جاتے ہیں، وہاں کتب بھی صرف چند خوش قسمت طلبا کو

جاری ہوتی ہیں۔

اس درجہ کے طلبہ سفر ناموں۔ ایجادوں اور مہموں اور جنگی واقعات بتلانے والی کتابوں میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔

اعلیٰ مدارس: ۔ طلبہ اور اساتذہ میں زائد مطالعہ کرنے بالخصوص اخبارات کے پڑھنے کا کافی شوق پایا جاتا ہے۔ مگر اخبارات طلبہ کے ہاتھوں تک کم ہی پہنچتے ہیں۔ لائبریری میں اچھی کتب کا فقدان ہے اور ان کا جاری کروانا ایک کار دشوار۔ خال خال طلبہ ایسے بھی نکل آتے ہیں جو نصاب کو ازحد ضخیم اور تعلیل سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارا مقصد صرف امتحان پاس کرنا ہی نہیں بلکہ ترقی کی دوڑ میں جیتنا بھی ہے۔ مگر چونکہ استادوں اور مدرسے کی نگاہ میں صرف نمبروں کی زیادتی ہی سب کچھ ہے، اس لیے طلبہ بھی اس لٹریچر کے پڑھنے کے لیے وقت نہیں نکال سکتے جو ان کے امتحانی نمبروں میں اضافہ کا موجب نہ بن سکیں۔

مگر اس کے باوجود اسی فی صد سے زائد تعداد ایسے طلبہ کی ہے جن کے پاس اپنی اپنی نجی کتب ورسائل موجود نہ ہوتے ہیں۔ مگر مجھے یہ دیکھ کر انتہائی رنج ہوا کہ ان میں سے صرف بیس فی صد طلبہ کے پاس قابل برداشت لٹریچر تھا، باقی سب کے پاس اکثر فلمی کہانیاں۔ اخلاق سوز افسانے وغیرہ تھے اور یہ اکثر ان کے بستوں اور بورڈنگ ہاؤس کی الماریوں میں رکھے ہوئے تھے جنہیں وہ اپنے فارغ اوقات میں مزے لے لے کر پڑھتے ہیں۔

نفسیاتی طور پر اس درجہ کا ہر بچہ اپنے کردار کو بنانے کے لیے بالعموم کسی قومی ہیرو مثلاً اقبال اور محمد بن قاسم کو بطور مثال منتخب کرکے اس کے متعلق زیادہ سے زیادہ لٹریچر پڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ چونکہ حافظہ عروج پر ہوتا ہے، اس لیے ان کے اپنے کلام یا ان کے متعلق شعروں کو یاد کرتا ہے اور ڈراموں میں حصہ لینے کا متمنی ہوتا ہے۔

ناشرین اور مصنفین: ۔ بازار میں معلومات افزا اور کردار کی تشکیل کرنے والی کتب کی از حد کمی ہے۔ ان کا ارزاں داموں پر مہیا کرنا ایک بہت بڑی قومی خدمت ہے۔ اس پر پوری توجہ کی جائے اور اشاعت کے لیے اساتذہ اور بچوں کی لکھی ہوئی کتب کو ترجیح دی جائے۔

اساتذہ کی دشواریاں: ۔ بالعموم کوئی استاد بھی کتب خانے کا کام خوشی سے لینے کو تیار نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس کام کو صحیح معنوں میں چلانے کے لیے کم سے کم ایک گھنٹہ روزانہ زائد صرف کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اکثر اوقات کتب گم ہو جاتی ہیں تو ان کی قیمت بھی مدرس کو اپنی گرہ سے ادا کرنا ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اتنی بڑی قربانی کا دینا آسان کام نہیں۔

افسران مجاز کو اس کس مپرس شعبہ پر توجہ دینی چاہیے اور ذیل کی تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کی سعی کرنا چاہیے۔

(۱) یہ درست ہے کہ طلبہ کے چندوں سے جمع شدہ رقوم زیادہ نہیں ہوتیں۔ مگر ہر سال اس طلبی سے تھوڑی سی رقم لائبریری کے لیے مختص کر دینی چاہیے۔

(۲) اساتذہ کو نہ صرف خود مطالعہ کرنے کا شوق دلانا چاہیے بلکہ لائبریری کو صحیح معنوں میں چلانے کے لیے تربیت بھی ملنی چاہیے۔

(۳) پانچ سو طلبہ کی تعداد والے مدارس میں نصف جز وقتی اور اس سے زیادہ تعداد والے مدارس میں ہمہ وقتی ناظم کتب خانہ مقرر ہونا چاہیے۔

(۴) طلبہ کے نقطۂ نظر سے اخبارات، رسائل اور کتب کے اجرا دینے کے متعلق نہ صرف پابندیاں نرم کر دینی چاہئیں بلکہ دفتری کارروائی کو بھی آسان ترین بنا دینا چاہیے ۔۔۔ کتب خانہ کے ناظم کو چاہیے کہ وہ

(ا) کتب کو مضمون وار تقسیم کر کے ایک خاص ترتیب سے رکھے۔

(ب) تمام کتب، رسائل اور اخبارات کی فہرست کسی نمایاں جگہ پر آویزاں کرے۔

(ج) رسائل اور اخبارات میں ضروری شائع ہونے والے مضامین پر سرخ نشان لگا دینا چاہیے۔ یا ان تمام عنوانات کو ایک تختہ سیاہ پر لکھ کر قارئین کی توجہ مبذول کرے۔

ضروری اور کارآمد مضامین کے تراشے لے کر ان کی الگ الگ فائلیں بنائے۔ بچوں کو فہرست کتب کے ملاحظہ کرنے اور کتب تک رسائی کرنے کا طریق بتائے۔ لائبریری میں مذہبی کتب بشمول قرآن شریف۔ چارٹس۔ نقشے۔ ایلوں اور لیبوں کے اوقات کار۔ اخبارات۔ رسائل۔ بچوں کا انسائیکلوپیڈیا۔ اٹلس۔ ڈکشنریاں۔ ڈائرکٹریاں مختلف سے تعارف۔ ریڈیو اور سمعی و بصری اعانات تک کا سامان مہیا کرے۔

مقامی لائبریریوں سے انحاد کر کے بچوں کو نہ صرف ان کے استعمال کرنے کا طریقہ بلکہ ان سے مناسب مراعات بھی دلائے۔

مختلف ناشرین اور مصنفین کو وقتاً فوقتاً مدعو کر کے خاص خاص عنوانات پر تقریریں کرائے۔

طلبہ کو یہ بات ذہن نشین کرا دینی چاہیے کہ لائبریری ایک قومی امانت ہے اور از حد مقدس۔ اس لیے کتب پر لکھنا سطریں یا تصویریں پھاڑنا یا ان کا چرانا ایک قومی جرم ہے:

نوزائیدہ بچوں کا کردار

صوفی گلزار احمد

ماں اور نوزائیدہ بچہ کے رشتے کو کسی صورت بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا، جب نوزائیدہ بچہ اس دنیا میں قدم رکھتا ہے تو اس کے لیے ہر شے عجیب و غریب ہوتی ہے وہ کسی چیز سے واقف نہیں ہوتا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وہ ایک خاص قسم کا کردار لے کر ماں سے لیتا ہے۔ یہی کردار ہے جس کی تشکیل ماں کے پیٹ میں ہوتی ہے اور اس کی زندگی کا یہ حصہ ماں کی زندگی کا اہم دور ہوتا ہے۔ بچہ خاص فطری صلاحیتوں کا مالک بن جاتا ہے اور اس کردار کی تشکیل میں یہی صلاحیتیں نمایاں حصہ لیتی ہیں۔ یہی صلاحیتیں اس کی باہر کی زندگی میں اثرانداز ہوتی ہیں۔ اور اس کے کردار کی نشوونما میں کافی حد تک مدد دیتی ہیں۔ ان تمام باتوں کے باوجود نوزائیدہ بچہ کی بیرونی دنیا کے ساتھ مناسبت بڑا اہم مسئلہ بن جاتا ہے۔ اور اسے کافی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

نوزائیدہ بچوں کے کردار کا ابتدائی دور ماہرین نفسیات اور والدین کے نزدیک بڑا اہم ہے۔ ان دونوں کی لگاتار کوششوں نے ذرا بڑی عمر کے بچوں اور بالغوں کی زندگی کا بنظرِ غائر مطالعہ کر کے نوزائیدہ بچہ کے کردار کو بخوبی پرکھا ہے۔ نوزائیدہ بچہ کے ابتدائی کردار کو وہ غیر ضروری حرکات سے منسوب کرتے ہیں اس میں شک نہیں کہ جہاں تک بچے کے کام کاج میں مختلف اشیا کو پکڑنے اس کے چلنے پھرنے اور دیگر جسمانی حرکات کا تعلق ہے وہ غیر ضروری دکھائی دیتی ہیں۔ اس کے باوجود یہ حرکات کچھ مقصد ضرور رکھتی ہیں اور خاص کر دورانِ خون میں یہ حرکات کافی مدد دیتی ہیں جب کہ بچہ زندگی میں نئے نئے تجربات سے دوچار ہوتا ہے، ایسی حرکات کو اکثر ایک خاص کردار کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ کیوں کہ اس میں تمام جسم مصروف رہتا ہے۔ ایک بڑی عمر کے بچے کا کردار انہی حرکات سے تشکیل پاتا ہے۔

یہ پیدائش سے پہلے جبکہ بچے کے پھیپھڑے اور انتڑیاں صحیح کام نہیں کر رہی ہوتیں بچے کی بے ضابطہ حرکات دوران خون میں مدد دیتی ہیں۔ یہ جسم اور دماغ کے خون میں حرکت پیدا کر دیتی ہیں جبکہ بچہ آکسیجن اور جسم کی غذا انوال کی نالی سے حاصل کرتا ہے: بچے کی یہ ابتدائی حرکات خاص طور پر سانس لینے اور جسم کے مختلف اعضا کی نشوونما سے تعلق رکھتی ہیں۔ اسی لیے ایک چھ ماہ کے بچے کے متعلق یہ کہنا صحیح ہے کہ وہ رونے اور ہنسنے میں تمام جسم کو حرکت دیتا ہے۔ چناں چہ ایک نوزائیدہ بچہ خوراک حاصل کرتے، سانس لینے اور محسوس کرنے میں تمام جسم کو استعمال میں لاتا ہے۔ بازوؤں کو ہلانے، ٹانگیں چلانے، چیخنے چلانے اور سر کو ادھر ادھر مارنے سے اپنے مختلف اعضا کو غذا اور آکسیجن پہنچاتا ہے۔ پھیپھڑوں اور دماغ کو بھی یہ غذا مہیا کرتا ہے یہ عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ اگر بچے کی حرکات کو روکا جائے اور اسے حرکت کرنے میں پوری پوری آزادی حاصل نہ ہو تو وہ کافی شدید حرکات کرنے پر اتر آتا ہے۔ اور خاص طور پر اس وقت جبکہ اس کی انگوٹھا چوسنے کی عادت کا تدارک کرنے کی خاطر بازوؤں کو باندھ دیا جائے۔ یہ شدید حرکات ماحول کے خلاف باغیانہ رویہ کو ظاہر کرتی ہیں۔ اسی طرح کی باغیانہ حرکات اس وقت دیکھنے میں آتی ہیں۔ اگر بچے کے سر کو مضبوطی سے پکڑ لیا جائے اور وہ سر کو ادھر ادھر مارنے سے محروم رہے۔ یعنی ہی ان کی حرکات میں کسی قسم کی دخل اندازی صحت مند بچوں میں بھی اس رویہ کی حامل ہوتی ہے اور وہ چیخنا چلانا بھی شروع کر دیتے ہیں۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ نوزائیدہ بچوں کے اعضا میں حرکت صحت کے لیے مفید ہوتی ہے۔ جہاں نوزائیدوں کو لپیٹے رکھنے کا رواج ہے وہاں یہ عام دستور ہے کہ نوزائیدہ بچہ کو پیدائش کے فوراً بعد کپڑوں میں لپیٹ دیا جاتا ہے۔ اگر اسے جلد لپیٹا نہ جائے تو وہ اس کے لیے بھر کبھی رضامند نہیں ہوتا اور باغیانہ رویہ کا اظہار کرتا ہے۔

اکثر ماؤں کو بچے کو گود میں اٹھائے ہوئے بڑے اشتیاق سے یہ کہتے سنا گیا ہے کہ "میں حیران ہوں کہ یہ کیا سوچ رہا ہے" یہ چیز بڑی حیران کن ہے کیوں کہ یہ بات مشاہدہ سے ثابت ہو چکی ہے کہ بچہ پہلے دو یا تین مہینے کے دوران میں بالکل سوچ سمجھ سے کام نہیں لیتا۔ نوزائیدہ بچہ کی یہ خاص خصوصیت ہے کہ وہ سوچنے سے پہلے مناسب جسمانی حرکات سے اپنا مطلب واضح کرے۔ چناں چہ نوزائیدہ بچوں کی زندگی میں (یعنی کوئی فعل یا حرکت کرنے سے پہلے سوچ سمجھ لینا چاہیے!) اس اصول کو کوئی دخل نہیں۔ بچوں کی حرکات و سکنات کے ذمہ دار اس کے فطری اور پیدائشی تقاضے ہیں۔ جنہیں وہ ہر صورت پورا کرنے کے لیے مصروف رہتا ہے۔ چناں چہ بچے کی ابتدائی حرکات اس کی جسمانی اور جنسی بھوک کی تسکین کے متعلق ہیں۔ ان حرکات میں دلچسپی اور غیر دلچسپی کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔

نوزائیدہ بچہ کی زندگی کے ابتدائی ایام صحت کے لحاظ سے کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ دوران خون میں کافی شدت دکھائی دیتی ہے۔ اس دوران میں خون کے مسام جو پیدائش سے پہلے صحیح کام کر رہے ہوتے ہیں کام سے جواب دے دیتے ہیں۔ دل کا عضو بھی تیزی سے نشوونما پاتا ہے اور خون کو تیزی سے مختلف جگہوں پر بھیجنے میں مدد دیتا ہے۔ اس دوران میں ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ابتدائی زندگی میں اس کی صورت وہ نہیں ہوتی ہے جو بچے کے سن بلوغ پر پہنچنے پر بنتی ہے پیدائش سے پہلے اس کی صورت، شکل، وضع قطع سے ممکن ہے ہم اس نتیجہ پر پہنچ جائیں کہ اس کا پہلا عمل یا حرکت اس مواد کو آنتوں کی نالی اور معدہ سے نکالنے کی خاطر ہوتا ہے جس کی اسے سخت ضرورت رہتی ہے۔ جب کہ یہ مواد معدہ جیسی جگہ میں ذخیرہ کی صورت میں جمع رہتا ہے۔ اس جگہ سے خون چھاتی اور سر کی طرف پھرتا ہے لیکن سب سے پہلے اس خون کی گردش دل کی نشوونما کے لیے نہایت ضروری ہے۔ اس لیے یہ خیال کیا گیا ہے کہ پیدائش کے فوراً بعد ہی اعضا کی حرکت سے خون کی گردش نہایت ضروری امر ہے۔ یہاں تک کہ ذرا بعد کی عمر میں بھی یہ عمل جاری رہتا ہے۔ مشہور ماہر عضویات ڈاکٹر والٹر بی کینن لکھتا ہے کہ اعضا اس طرح زیادہ حرکت کرتے ہیں، اگر دل کی طرف زیادہ سے زیادہ خون بھیجا جائے۔ اعضا کی یہ حرکت خون کو دل سے پھیپھڑوں کی طرف بھی بھیجتی رہتی ہے تاکہ وہ صاف ہوتا رہے۔

نوزائیدہ بچہ کی سب سے پہلی حرکات جسم کی نشوونما کی خاطر ہوتی ہیں۔ اعضا کی یہ حرکات لگاتار جاری رہتی ہیں، جب تک کہ بچے کا دماغ پختہ نہ ہو جائے اور جب تک بچے میں پختگی پیدا نہیں ہوتی۔ یہ ماں کا فرض ہے کہ وہ اپنے احساس ذات سے بچے کے دماغ کا کام سرانجام دے اور وہ اس طرح کہ وہ اپنی پوری ہمدردی اور الفت سے بچہ کی طرف پوری توجہ دے اور بچے کو ایسی حرکات کرنے میں مدد دے جو وہ اپنے بل بوتے پر سرانجام نہیں دے سکتا کیونکہ بچہ نئے حالات کا مقابلہ نہیں کر سکتا، جب تک کہ اس کا دماغ پوری طرح نشوونما نہیں پاتا ہے۔

ایک سوجھ بوجھ رکھنے والی ماں یہ سب کچھ جانتی ہے کہ بچے کے لیے نئے حالات کا مقابلہ کرنا کتنا دشوار ہے اور اس کے لیے نئے کاموں کو سیکھنا اور ان میں مہارت اور استعداد حاصل کرنا بھی کتنا دشوار امر ہوتا ہے اس لیے اس کی یہی کوشش ہوگی کہ ابتدائی زندگی میں بچے کے دماغ میں ایسے خیالات اور تصورات کو جگہ نہ دی جائے جو ایک پختہ ذہن میں موجود ہوتے ہیں۔ اگر بچے میں فطری تقاضے موجود ہیں تو یہ ماں کا سب سے بڑا سرمایہ ہے، انہی فطری تقاضوں کے ذریعہ وہ بچے کی حالت کو سنوارنے اور اس کی مناسب نشوونما میں ہاتھ بٹا سکتی ہے۔ عام ذہین لوگوں کے ذہن میں انہی فطری تقاضوں کے متعلق کافی

الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ بقائے زندگی یا بقائے نسل کی خواہش ایک ایسا فطری تقاضہ ہے جو ہماری زندگی پر ہر وقت اثر انداز رہتا ہے، چناں چہ ابتدائی زندگی میں بچے کے کردار کی تشکیل میں یہی فطری تقاضے اور رجحانات نمایاں حصہ لیتے ہیں اور باہر کا ماحول بچے کی زندگی میں اتنی اہمیت نہیں رکھتا۔ جب کبھی ہم اپنی ذات کے احساس کو اخلاقی اور معاشرتی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں تو شروع شروع میں ہم ہر انسانی فطرت کو سمجھنے سے بالکل قاصر رہتے ہیں۔ ہمارے لیے یہ چیز جاذب توجہ ہونی چاہیے کہ بچے میں اپنی ذات کا احساس موجود ہے اور وہ اپنی ضروریات کی تکمیل چاہتا ہے، چناں چہ وہ بچے جنہیں ابتدائی زندگی میں اپنی ضروریات کی تسکین میسر نہیں ہوتی ایک ایسی ذات یا شخصیت کی تعمیر کرتے ہیں جس کی بنیاد نہایت کمزور ہوتی ہے۔ اس کے برعکس جب بچے اپنی ضروریات کی تسکین کریں اور اعضا کی حرکات کو عمل میں لائیں جن کے ذریعہ ان ضروریات کی تکمیل ہوتی ہے تو وہ اپنی ذات میں تحفظ کا احساس پیدا کر لیتے ہیں اور اس طرح اپنی ذات میں قوت ارادی اور مستحکم عزائم کو بھی جگہ دیتے ہیں۔

ایک واقعہ لیجیے جو اس پہلو پر روشنی ڈالے گا کہ کس طرح ایک معمر عورت بچے کی ضروریات کو سمجھنے میں قاصر رہی۔ یہ عورت کافی ذہین تھی لیکن بچے کو بہلانے اور اسے خوش رکھنے کا ملکہ نہیں رکھتی تھی وہ بچے کے قرب سے گھبراتی تھی اور جب کبھی اسے بچے کو گود میں اٹھانے کا موقع ملتا تو بچہ زور زور سے چیخنا چلانا شروع کر دیتا تھا۔ جب ڈاکٹر نے اسے سوال کیا کہ وہ بچے کی طرف زیادہ توجہ دینے میں زیادہ تامل کیوں کرتی ہے تو وہ کہنے لگی کہ میں اپنے بچے کو خود غرض نہیں بنانا چاہتی۔ بچے میں کچھ صبر اور انتظار کا مادہ بھی موجود ہونا چاہیے اور خاص کر ایسے موقعوں پر جبکہ گھر میں خاص مصروفیت ہو۔ آپ نے دیکھا کہ انتظار ایک نوزائیدہ بچے کے لیے کتنا تباہ کن ہے اور اس کی ذہنی اور جسمانی قوتوں پر کس حد تک بُرا اثر ڈالتا ہے۔ لیکن یہ ذہین اور معمر عورت اس بات کو سمجھنے سے قاصر رہی بچے میں صبر اور انتظار کا مادہ ضرور پیدا کیا جا سکتا ہے لیکن ایسی عمر میں نہیں جب کہ بچہ کافی چھوٹی عمر کا ہو، یہ بات اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ بچہ زیادہ سے زیادہ دو سال کی عمر میں ہو، والدین پر یہ ظاہر کرنا ذرا مشکل ہے کہ ایک قسم کی تسکین اور آرام نوزائیدہ بچہ کی زندگی کے لیے کتنا اہم ہے اور یہ بچے میں کسی قسم کی خود غرضی کا مادہ پیدا نہیں کر دیتا۔ بچے کی ضروریات کی تسکین نہایت ضروری ہے اور یہ واقعہ اس ضمن میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے، چناں چہ اس خاص بچے نے اپنے جسمانی تناؤ اور ہیجان کو تسکین دینے کے لیے ایک بہانہ تلاش کر لیا اور وہ لیٹے لیٹے بستر کی چادر کا ایک کونہ چوستا رہتا تھا۔ اس طرح اُسے سیکڑوں مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑتا۔ چادر کے دھاگے اس کے منہ اور ناک میں گھس جاتے اس کے علاوہ اسے دیگر اشیاء کو چوسنے کی عادت بھی پڑ گئی۔ یہ تمام چیزیں اس کے کردار پر اثر انداز ہوئیں اور اُس کی

نشو و نما کافی حد تک رک گئی۔ یہاں تک کہ وہ ماں کے لیے مصیبت بن گیا۔ آپ نے دیکھا کہ ماں کی اچھی تربیت کے خیال نے بچے کے کردار کو سنوارنے کی بجائے اسے غلط راہ پر ڈال دیا۔

اس میں شک نہیں کہ کافی لوگوں کو اس بات کا علم ہے کہ بچے کی ذہنی زندگی اس کی ایسی حرکات و سکنات جیسے کہ چوسنے، سانس لینے اور کھانے پینے سے کافی حد تک تعلق رکھتی ہیں لیکن اس پہلو پر کبھی روشنی نہیں ڈالی گئی۔ بچے کی فطری ضروریات کو بہت کم سمجھا گیا ہے اور اُس کے جذباتی ردِّ عمل اور اس کے سوچنے سمجھنے کی قوت کی طرف بھی بہت کم توجہ دی گئی ہے حتیٰ کہ یہاں تک نفسیاتی پہلو کو کبھی بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ دونوں پہلو نوزائیدہ بچے کی زندگی میں اہم حیثیت رکھتے ہیں۔ ابتدائی زندگی میں وہ فطری ضروریات کی تسکین چاہتا ہے اور پھر ان فطری ضروریات کی تسکین کے ذریعے وہ جذباتی ضروریات کی تسکین کرتا ہے، اس کی ذہنی نشو و نما میں بھی یہ چیز مدد دیتی ہے، ایک متوازن شخصیت کی تشکیل کے لیے یہ نہایت ضروری باتیں ہیں۔

نوزائیدہ بچے کی تمام خواہشات کا گہوارہ ماں ہوتی ہے۔ وہ اپنی خواہشات کی تسکین کی خاطر ماں کی طرف راغب ہوتا ہے اور کسی حالت میں بھی ناامیدی کا سامنا نہیں کرنا چاہتا۔ انہی اندرونی تاثرات کا نتیجہ ہے کہ اس میں ایک ایسا ردِّ عمل ظہور میں آتا ہے کہ گھر کے افراد کو پہچاننے لگتا ہے اور ہمدردی اور اُلفت کا اظہار بھی کرنے لگتا ہے۔

تعلیمی دنیا پر ایک نظر

عمارتوں کی کمی

دوسری عالمی جنگ کے بعد شرح پیدائش میں جو اضافہ ہوا ہے برطانوی مدارس میں اس کا پورا اثر ۱۹۵۹-۶۱ء میں محسوس کیا جائے گا۔ ان سالوں میں برطانوی مدارس میں تعداد طلبہ انتہائی حد کو پہونچ جائے گی۔ بچوں کی اس بھیڑ سے عہدہ برآ ہونے کے لیے برطانوی تعلیمی اداروں نے عمارتوں کی تعمیر و توسیع کے منصوبے تیار کر رکھے ہیں۔ لیکن ان تعمیری منصوبوں پر حسب توقع عمل نہیں ہو سکا۔ اس امر کا انکشاف وزارت تعلیم کے ایک حالیہ پارلیمانی جواب سے ہوا جس میں بتایا گیا تھا کہ ڈرہم کی مقامی تعلیمی حکومت سال رواں میں اپنے باقاعدہ تعمیری منصوبوں میں سے چھ کو شروع نہیں کر سکی۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی کہ موزوں فنی ماہر اور حسب حال ٹنڈر موصول نہ ہو سکے تھے۔ یہ دشواریاں محض ڈرہم تک محدود نہیں۔ خیال ہے کہ باقی مقامی تعلیمی حکومتوں کے تعمیری منصوبوں کا بھی ڈرہم کا سا حال ہوگا۔ اس پارلیمانی جواب نے تعلیمی حلقوں میں تشویش پیدا کر دی ہے اور یہ خطرہ حقیقی سمجھا جانے لگا ہے کہ ۱۹۵۹-۶۱ء میں تمام بچوں کے لیے مدرسوں میں گنجائش نہیں رہے گی۔

پرائمری پاس اراکین پارلیمنٹ

انگلستان جیسے ملک میں بھی اس وقت بعض اراکین پارلیمنٹ ایسے ہیں جن کی تعلیم ابتدائی مدرسے سے آگے نہیں بڑھی تھی۔ برسر اقتدار قدامت پسند جماعت میں ان کی تعداد کوئی ایک درجن کو پہنچتی ہے۔ یہ گروہ عام طور پر ای۔ ایس۔ بی (ایلیمنٹری اسکول بوائز) کے نام سے موسوم ہے۔ اس گروہ میں سے ایک رکن وزارت میں بھی شامل ہے البتہ حال ہی میں جب سر ایڈن نے اپنی وزارت میں تبدیلی کی تو اس گروہ میں سے کوئی اور آدمی وزارت میں شامل نہیں کیا گیا۔

برطانوی ٹریننگ کالج

برطانوی ٹریننگ کالجوں کے اخراجات کے متعلق سال ہی میں کچھ اعداد و شمار منظر عام پر آئے ہیں۔ ایک حالیہ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ان کالجوں کے اخراجات فی طالب علم ۷۳۵ پونڈ سالانہ کی انتہا سے لے کر ۲۳۴ پونڈ سالانہ تک ہیں۔ اخراجات میں اتنے بڑے تفاوت کی ایک وجہ ٹریننگ کالجوں کی فیسوں میں وسیع تفاوت ہے۔ برطانیہ کے کئی ایک

ٹریننگ کالج پرائیویٹ اداروں کے ماتحت ہیں۔ ان پرائیویٹ کالجوں میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو ۲۷۰ پونڈ سالانہ تک فیس وصول کرتے ہیں اور بعض کی فیس صرف ۱۹۷ پونڈ سالانہ ہے ۔

علمی خدمت

لوگوں کو سستے داموں اچھی کتابیں مہیا کرنا ایک بڑی علمی خدمت ہے۔ برطانیہ میں جوزف ڈینٹ نامی ایک شخص نے اس کام کا آغاز سنہ ۱۹۰۶ء میں کیا تھا۔ جب اس نے "ایوری مین" کے سلسلہ کتب کی پہلی کتاب شائع کی۔ اس سلسلہ کتب کا مقصد یہ تھا کہ اعلیٰ پایہ کی علمی کتابوں کو اچھے کاغذ اور دیدہ زیب طباعت کا جامہ پہنا کر عوام کے پاس کم سے کم قیمت پر پہنچا جائے۔ پچھلی نصف صدی میں "ایوری مین" سلسلہ کتب میں سیکڑوں بلند پایہ کتابیں شائع ہو کر لوگوں تک پہنچیں۔ ان میں سے بعض کتابیں آج صرف پرانی کتابیں بیچنے والوں کے ہاں سے ہی مل سکتی ہیں اور ان کی قیمت اس وقت ان کی اصل قیمت سے بھی زیادہ ہے۔ اس سال "ایوری مین" سلسلے کی ہزارویں کتاب شائع ہوئی ہے ۔

استادوں کی بہم رسانی

برطانیہ میں نئے استادوں کی بہم رسانی پر جس قدر زور دیا جا رہا ہے اس کا کچھ اندازہ برطانوی وزیر تعلیم کی ایک تازہ تقریر سے ہو سکتا ہے جس میں انہوں نے کہا کہ عین ممکن ہے کہ وزارت تعلیم سر دست باقی تمام طرف سے توجہ ہٹا کر اسے صرف استادوں کی تربیت پر مرکوز کر دے۔ اس غرض کے لیے استادوں کی تربیت پر زیادہ روپیہ صرف کرنا پڑے گا۔
سر ڈیوڈ ایکلز نے ان خیالات کا اظہار ایک ٹریننگ کالج کے زیر تربیت اساتذہ کو خطاب کرتے ہوئے کیا تھا انہوں نے کہا برطانیہ کو آج صرف اپنے مدرسوں کے لیے ہی استاد درکار نہیں بلکہ اسے سمندر پار بھیجنے کے لیے بھی استاد درکار ہیں۔ آج ہمیں لیکچرار درکار ہیں جو دولت مشترکہ کی یونیورسٹیوں میں جا کر پڑھائیں۔ آج ہمیں استاد چاہئیں جو سمندر پار ملکوں کے مدرسوں میں جا کر کام کریں جس یقین اور جذبے کے ساتھ یہ لوگ اپنا کام کریں گے اسی حد تک برطانیہ سرد جنگ میں کامیاب رہے گا وزیر تعلیم نے استادوں سے کہا کہ ان میں سے ہر ایک کو چاہیے کہ زندگی کا کچھ حصہ سمندر پار ملازمت کی نذر کر کے ایک اہم قومی خدمت میں حصہ لے ۔

عوامی زندگی کی سطح

ڈاکٹر جے۔ جی باولبے نے رائل سوسائٹی آف ہیلتھ کے ایک حالیہ جلسے میں تقریر کرتے ہوئے یہ حیرت انگیز

بکشاف کیا کہ ذہنی سطح کے اعتبار سے برطانیہ کی آدھی آبادی حسبِ اوسط سطح سے پست تر ہے۔ انہوں نے مزید کہا قد کے معاملے میں بھی یہی حال ہے۔ پچاس فی صد لوگ اوسط قد سے پست تر ہیں۔ وزن، عمر، دولت اور جفاکشی کے میدانوں میں بھی آدھی آبادی اوسط سطح سے پست تر ہے۔ مقرر نے اس صورتِ حال پر افسوس کرتے ہوئے کہا کہ یہ چیز جدید معاشرتی فکر کے لیے ناقابلِ قبول ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کو ہر بات میں اوسط سے بلند تر ہونا چاہیے۔

یہ ایک ایسے ملک کا ذکر ہے جو ترقی کی دوڑ میں رہنماؤں میں شمار ہوتا ہے۔ پسماندہ ملکوں میں اگر صحیح اعداد و شمار جمع کیے جا سکیں تو شاید کل آبادی کا کتنا بڑا حصہ ہر بات میں اوسط درجہ سے نیچے دکھائی دے۔

سرکاری جریدہ کے اعلانات

صیغہ رجال ــــــــــ شعبۂ مدارس

۱۰۵۲۵ م۔ غلام عباس شاہ ایف۔ اے۔ سی۔ ٹی۔ ایم۔ اے۔ او۔ ٹی معلم عربی گورنمنٹ
۲۶ مارچ ۱۹۵۶ء ہائی اسکول کیمبل پور کو جو اس وقت بھکر گورنمنٹ ہائی اسکول میں بطور قائم مقام انگریزی مدرس (۹۰ ــ ۱۵ ــ ۱۲۰ ــ ۷ ــ ۱۹۰) کے عام پیمانہ تنخواہ میں کام کر رہے ہیں اپنی تنخواہ پر (۶۰ ــ ۱۴۰) کے پیمانہ تنخواہ میں معلم عربی گورنمنٹ ہائی اسکول بھکر ۲۷ مارچ ۱۹۵۶ء یا مابعد کی تاریخ حاضری سے م۔ عبد الرشید کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے مقرر کیا گیا۔

〃 م۔ عبد الرشید خاں ایف۔ اے۔ منشی فاضل، ادیب فاضل او۔ ٹی (۶۰ ــ ۱۴۰) معلم السنہ شرقیہ گورنمنٹ ہائی اسکول بھکر کو ۲۷ مارچ ۱۹۵۶ء یا بعد کی تاریخ حاضری سے م۔ غلام عباس کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر معلم عربی گورنمنٹ ہائی اسکول کیمبل پور مقرر کیا گیا۔

〃 م۔ عبد الحی منشی فاضل او۔ ٹی (۶۰ ــ ۱۴۰) قائم مقام معلم السنہ شرقیہ گورنمنٹ ہائی اسکول کیمبل پور کو تاریخ حاضری سے م۔ عبد العلی کی جگہ اپنی تنخواہ پر قائم مقام معلم السنہ شرقیہ گورنمنٹ ہائی اسکول کیمبل پور مقرر کیا گیا۔

پ۔ عبد العلی مولوی فاضل او۔ ٹی (۶۰ ــ ۱۴۰) معلم عربی گورنمنٹ ہائی اسکول کیمبل پور کو تاریخ حاضری سے ایک نئی آسامی پر اپنی تنخواہ پر معلم السنہ شرقیہ سنٹرل ماڈل اسکول لاہور مقرر کیا گیا۔

۱۰۰۲۸ مسٹر سراج الدین ایس وی (۶۰ ــ ۱۴۰) معلم اردو گورنمنٹ ہائی اسکول ظفروال
۲۰ مارچ

کو یکم اپریل ۱۹۴۰ء سے ایک نئی منظور شدہ اسامی پر (۱۵۰ — ۱۰ — ۲۵۰) کے پیمانہ تنخواہ میں ترقی دی گئی۔

۱۰۰۲۸ ۲۰ مارچ ۱۹۴۰ء — م۔ سردار خاں میٹرک منشی فاضل ایس وی (۶۰ — ۱۴۰) اردو مدرس گورنمنٹ پرائمری اسکول جو ریجی لاہور کو یکم مئی ۱۹۴۰ء سے ایک نئی منظور شدہ آسامی پر (۱۵۰ — ۱۰ — ۲۵۰) کے پیمانہ تنخواہ میں ترقی دی گئی۔

〃 م۔ دوست محمد خاں منشی فاضل ایس۔ وی (۶۰ — ۱۴۰) معلم اردو گورنمنٹ ہائی اسکول ظفروال کو ۱۸ اپریل ۱۹۴۰ء سے س۔ نادر علی شاہ کی جگہ جو سبکدوش ہو چکے ہیں (۱۵۰ — ۱۰ — ۲۵۰) کے پیمانہ تنخواہ میں ترقی دی گئی۔

〃 م۔ عبدالحلیم منشی فاضل ایس۔ وی (۶۰ — ۱۴۰) معلم اردو گورنمنٹ ہائی اسکول حضرو کو ۵ مئی ۱۹۴۰ء سے م۔ عبدالکریم کی جگہ جو سبکدوش ہو چکے (۱۵۰ — ۱۰ — ۲۵۰) کے پیمانہ تنخواہ میں ترقی دی گئی۔

〃 م۔ اللہ بخش ایس۔ وی (۶۰ — ۱۴۰) معلم اردو گورنمنٹ گورنمنٹ ہائی اسکول خوشاب کو عارضی طور پر یکم اپریل ۱۹۴۰ء سے ۱۹ مئی ۱۹۴۰ء تک م۔ امیر عنایت اللہ کی جگہ جو فوجی خدمت پر گئے ہیں (۱۵۰ — ۱۰ — ۲۵۰) کے پیمانہ تنخواہ میں ترقی دی گئی۔

〃 م۔ نظام الدین ایس۔ وی۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی ورنیکلر ٹیچر کو عارضی طور پر یکم اپریل ۱۹۴۰ء سے ۲۴ مئی ۱۹۴۰ء تک م۔ زمان خاں کی جگہ جو فوجی خدمت پر گئے ہیں (۶۰ — ۱۴۰) گریڈ سے (۱۵۰ — ۱۰ — ۲۵۰) میں ترقی دی گئی۔

〃 م۔ علام محمد میٹرک ایس۔ وی معلم اردو گورنمنٹ ہائی اسکول باغبانپورہ کو یکم اپریل ۱۹۴۰ء سے ۱۷ اپریل ۱۹۴۰ء تک قائم مقام م۔ محمد اسلم خاں نیازی کی جگہ جو کیڈٹ کالج حسن ابدال میں کام کر رہے ہیں (۶۰ — ۱۴۰) کے پیمانہ تنخواہ سے (۱۵۰ — ۱۰ — ۲۵۰)

پیمانہ تنخواہ میں ترقی دی گئی

۱۰۰۲۸ م۔ کریم بخش جوش ایس۔ وی معلم اردو گورنمنٹ ہائی اسکول نالہ خورد کو ۱۸ اپریل ۵۵ء / ۱۷ مارچ ۵۶ء سے ۲ مئی ۵۵ء تک بطور قائم مقام م محمد اسلم خاں نیازی کی جگہ جو کیڈٹ کالج حسن ابدال میں کام کر رہے ہیں (۶۰ — ۱۲۰) کے پیمانہ تنخواہ سے (۱۵۰ — ۱۰ — ۲۵۰) کے پیمانہ تنخواہ میں ترقی دی گئی۔

// م۔ غلام غوث۔ ایس۔ وی معلم اردو گورنمنٹ نارمل اسکول نارووال کو ۲ مئی ۵۵ء سے ۱۹ مئی ۵۵ء تک بطور قائم مقام م محمد اسلم خاں نیازی کی جگہ جو کیڈٹ کالج حسن ابدال کام کر رہے ہیں (۶۰ — ۱۲۰) کے پیمانہ تنخواہ سے (۱۵۰ — ۱۰ — ۲۵۰) کے پیمانہ میں ترقی دی گئی۔

// م۔ محمد عبداللہ خاں ایس وی معلم اردو گورنمنٹ ہائی اسکول کو ۲۰ مئی ۵۵ء سے ۲۴ مئی ۵۵ء تک بطور قائم مقام م۔ محمد اسلم خاں نیازی کی جگہ جو کیڈٹ کالج حسن ابدال میں کام کر رہے ہیں (۶۰ — ۱۲۰) کے پیمانہ تنخواہ سے (۱۵۰ — ۱۰ — ۲۵۰) کے پیمانہ تنخواہ میں ترقی دی گئی۔

// م۔ محمد یار خاں میٹرک منشی فاضل ایس۔ وی معلم اردو گورنمنٹ ہائی اسکول سرگودھا کو ۲۷ جون ۵۵ء سے میر زمان خاں کی جگہ جو فوجی خدمت پر گئے ہیں (۱۵۰ — ۱۰ — ۲۵۰) کے پیمانہ تنخواہ میں ترقی دی گئی

// م۔ غلام رسول خاں۔ ایف۔ اے۔ ایس۔ وی۔ اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز ڈیرہ غازی خاں کو ۲۷ جون ۵۵ء سے ۳۱ جون ۵۵ء تک بطور قائم مقام مسٹر محمد اسلم خاں نیازی کی جگہ جو کیڈٹ کالج حسن ابدال میں کام کر رہے ہیں (۶۰ — ۴ — ۱۰۰ / ۱۰۵ — ۷ — ۱۴۰) کے پیمانہ تنخواہ سے (۱۵۰ — ۱۰ — ۲۵۰) کے پیمانہ تنخواہ میں ترقی دی گئی۔

۱۰۰۲۸ م۔ سلطان محمود میٹرک ایس۔ وی ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی اسکول ٹلی پور کو یکم اگست ۵۰ء
۲۰ مارچ ۵۶ء سے ۳۰ نومبر ۵۰ء تک م۔ بشتاق علی خان کی جگہ جو فوجی خدمت پہ گئے ہیں
مقرر کیا گیا۔

// محمد سلطان۔ ایس۔ وی ورنیکلر ٹیچر گورنمنٹ ہائی اسکول عیسیٰ خیل کو یکم اگست ۵۰ء سے
۴ اگست ۵۰ء تک م۔ محمد اسلم خان کی جگہ جو کیڈٹ کالج حسن ابدال میں کام کر
رہے ہیں مقرر کیا گیا۔

۱۲۵۱۱ م۔ عبدالرحیم شاہ ایس۔ ای (۶۰ - ۱۴۰) اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول راجن پور
۹ اپریل ۵۰ء کو تاریخ حاضری سے م۔ منظور احمد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر اردو مدرس
گورنمنٹ ہائی اسکول خانیوال مقرر کیا گیا۔

م۔ منظور احمد ایس وی (۶۰ - ۱۴۰) اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول خانیوال
کو تاریخ حاضری سے م۔ عبدالرحیم شاہ کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر اردو
مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول راجن پور کو مقرر کیا گیا۔

۱۱۷۴۴ س۔ منظور حسین شاہ (۶۰ - ۱۴۰) ورزش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول رینالہ خورد کو
۳ اپریل ۵۶ء تاریخ حاضری سے مسٹر عبدالرشید ورزش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول پاکپتن کی جگہ
اپنی تنخواہ پر مقرر کیا گیا۔

// محمد بشتاق میٹرک ورزش ماسٹر ایک امیدوار کو تاریخ حاضری سے س۔ منظور حسین شاہ
کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے ورزش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول رینالہ خورد مقرر کیا گیا۔

۱۰۸۶۹ م۔ بشتاق احمد بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (۱۴۰ - ۲۵۰) انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول
۲۷ اپریل ۵۰ء بھالیہ کو تاریخ حاضری سے م۔ محمد اکبر ایف۔ اے سی۔ ٹی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا
ہے انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول تلہ گنگ مقرر کیا گیا۔

// محمد اکبر ایف۔ اے سی۔ ٹی۔ انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول تلہ گنگ کو تاریخ حاضری

م۔ مشتاق احمد بی اے۔ بی۔ ٹی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر انگلش ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول چالیہ مقرر کیا گیا۔

۱۰/ مسٹر رشید احمد ملک ایم۔ اے (جغرافیہ) اسسٹنٹ ماسٹر (۲۵۰ — ۲۰ — ۳۵۰ — ۲۵ — ۵۵۰) کی مدت ملازمت ۱۵ مئی ۱۹۵۶ء تک بڑھائی جاتی ہے۔
پنج ۵۶

۹/ م۔ غلام عباس شاہ ایف۔ اے۔ سی۔ ٹی مولوی فاضل انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول
پنج ۵۶ منٹگمری کو تاریخ حاضری سے م۔ عبدالحی منشی فاضل کی جگہ جو سبکدوش ہو چکے ہیں عربی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول کمالیہ پر اپنی تنخواہ پر مقرر کیا گیا۔

۱۱/ م۔ عبدالمجید ایس۔ وی (۶۰ — ۱۴۰) اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول خانیوال کو تاریخ
۵۶ حاضری سے مسٹر حسین احمد منشی فاضل کی جگہ جو ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ہیں (زمرہ ۱۶) اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول ملتان اپنی تنخواہ پر مقرر کیا گیا۔

م۔ مرتضےٰ خان ایس۔ وی منشی فاضل اردو ٹیچر گورنمنٹ ہائی اسکول منٹگمری کو تاریخ حاضری سے مسٹر عبدالمجید ایس۔ وی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول خانیوال اپنی تنخواہ پر مقرر کیا گیا۔

سردار محمد شفیع ایس وی ایک امیدوار کو مسٹر مرتضےٰ خاں کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول منٹگمری (۶۰ — ۱۴۰) مقرر کیا گیا۔

۱۲ م۔ مسٹر محمد صادق ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی سینئر ہاؤس ماسٹر پنجاب کیڈٹ کالج حسن ابدال کو
۵۶ ۵ فروری ۱۹۵۶ء سے (۴۰۰ — ۷۵۰) کے پیمانہ تنخواہ میں مستقل کیا گیا۔

۶ مرید اکبر ایس وی (۶۰ — ۱۴۰) اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول کمالیہ کو تاریخ
۵۶ حاضری سے م۔ مرید حسین ایس وی کی جگہ جو سبکدوش ہو چکے ہیں اپنی تنخواہ پر اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول لیہ مقرر کیا گیا۔

صالح محمد میٹرک ایس وی (۶۰ — ۱۴۰) اردو مدرس گورنمنٹ نارمل اسکول چنیوٹ کو

تاریخ حاضری سے م۔ہرمد اکبر کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اپنی تنخواہ پر اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول کمالیہ مقرر کیا گیا۔

۶۶۹۴ م۔محمد انور خاں میٹرک ایس۔وی ایک امیدوار کو تاریخ حاضری سے صالح محمد کی جگہ
۲۵ فروری ۵۶ء جن کا تبادلہ ہو چکا ہے (۶۰ - ۱۲۰) عام پیمانہ تنخواہ میں ۷۲ روپے ماہوار پر اردو مدرس گورنمنٹ نارمل اسکول چنیوٹ مقرر کیا گیا۔

م۔محمد ہاشم ایس۔وی ایک امیدوار کو تاریخ حاضری سے بطور ایک زائد مدرس (۶۰ - ۱۲۰) کے عام پیمانہ تنخواہ میں اردو مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول مظفر گڑھ مقرر کیا گیا۔

۶۲۹۵ م۔عبدالرحیم سوہدری فاضل او ٹی (۶۰ - ۱۲۰) عربی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول سانگلا کو تاریخ
۲۰ فروری ۱۹۵۶ء حاضری سے م۔فتح دین کی جگہ جو سبکدوش ہو چکے ہیں اپنی تنخواہ پر عربی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول کھنڈووال مقرر کیا گیا۔

" ح۔محمد اسحاق شعیب مولوی فاضل منشی فاضل ایک امیدوار کو م۔عبدالرحیم کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے تاریخ حاضری سے ۶۰ - ۱۲۰ کے عام پیمانہ تنخواہ میں ۷۲ روپے ماہوار پر عربی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول سانگلا مقرر کیا گیا۔

۶۳۱۵ م۔نذیر احمد اختر بی۔اے۔بی۔ٹی (۱۲۰ - ۲۵۰) انگریزی مدرس گورنمنٹ ہائی اسکول پسرور کو تاریخ
۲۰ فروری ۵۶ء حاضری سے م۔عبدالمجید کی جگہ جو صدر معلم مقرر کیے جا چکے ہیں اپنی تنخواہ پر انگریزی مدرس گورنمنٹ نارمل اسکول پسرور مقرر کیا گیا۔

Regd. No. L. 5327

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اور

آموزش (اردو)

۱ - پاکستان بھر میں یہ دو ھی تعلیمی رسالے ھیں - جنکو سرکاری سرپرستی اور امداد حاصل ہے -

۲ - پاکستان بھر میں یہی دو تعلیمی رسالے ھیں - جو مرکزی اور صوبائی درسگاھوں اور تعلیمی حلقوں میں مقبول ھیں -

۳ - ان رسالوں کے متعلق ادارتی خطوط اور چھپنے والے مضامین ایڈیٹر (پرنسپل) سنٹرل ٹریننگ کالج لاھور کو بھیجے جائیں - ان رسالوں میں چھپے ھوئے مضامین کیلئے معاوضہ دیا جاتا ہے -

۴ - یہ رسالے ہر مہینے کے دوسرے ھفتہ میں چھپتے ھیں اور ان کا چندہ آٹھ روپیہ (انگریزی) اور چھ روپیہ (اردو) ہے - جو کہ منیجر کو بھیجنا چاھئے -

۵ - ان رسالوں میں اشتہار دینے سے آپکی اشیاء مقبول ھونگی - تجارتی معاملات کیلئے خط و کتابت منیجر سے کریں -

منیجر پنجاب ایجوکیشنل جرنل
آموزش
۲ کچہری روڈ - لاھور (پاکستان)

آموز

شمارہ ۳] لاہور [جوز

اس شمارہ میں

مدیران تحریر { پروفیسر سراج الدین
پروفیسر ایم - اے - مخدومی }

معاونین { عبدالغفور چوھدر
فضل احمد }

آموزش
لاہور

جون ۱۹۵۶ء

جلد ــــــــ ۹

شمارہ ــــــــ ۲

سالانہ چندہ

پاکستان کے لیے ۶ روپے

غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

ناشر

یونی ورسٹی بک ایجنسی لاہور

آر۔ ایچ۔ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کے
یونیورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

ادارئیہ

مکانیت کی کمی

ایم۔ اے مخدومی

پاکستان میں آج تعلیم جن دشواریوں سے دوچار ہے ان میں مکانیت کی کمی کو سرفہرست رکھنا چاہیے۔ قصبوں اور دیہات کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ لاہور اور کراچی جیسے مرکزی شہروں کے مدرسوں میں گھوم جایئے، ہر جگہ طلبہ کی وہ بے پناہ بھیڑ نظر آئے گی کہ پناہ بہ خدا۔ جو مدرسے تعدادِ طلبہ کے بارے میں کوئی معقول معیار قائم رکھنے پر مصر ہیں، ان کے یہاں داخلے کے وقت ایسا کڑا مقابلہ ہوتا ہے کہ بڑے بڑے مقابلے کے امتحان ہیچ نظر آنے لگتے ہیں۔ والدین ان مدرسوں میں بچوں کو داخل کرانے کے لیے مہینوں منتظر رہتے ہیں۔ لمبی چوڑی انتظاری فہرستیں تیار ہوتی ہیں اور مدرسے والوں پر چاروں طرف سے بے پناہ دباؤ پڑتا ہے۔

یہ افسوسناک صورتِ حال دو بڑے اسباب کی پیداوار ہے: ۔

(۱) مدرسوں کے پاس عمارتوں کی کمی (۲) تربیت یافتہ استادوں کی کمی۔

ان میں سے بنیادی سبب اب عمارتوں کی کمی کو ہی سمجھنا چاہیے۔ کیوں کہ ملک میں تربیت یافتہ استادوں کی بہم رسانی کے لیے خاطر خواہ انتظامات موجود ہیں۔ موجودہ تربیتی ادارے اس قابل ہیں کہ ضرورت پڑنے پر زیادہ استادوں کو بھی تیار کر دیں۔ استادوں کی کمی مختصر ہنگامی تربیتی نصابوں کے ذریعہ بھی پوری ہو سکتی ہے۔ مگر مکانیت کی کمی پورا کرنے کا مسئلہ اس سے مختلف ہے۔ نئی عمارتیں بنانے کے لیے روپے کے علاوہ تعمیری ساز و سامان اور فنی مہارت کی ضرورت ہے اور یہ چیزیں کم یاب ہیں۔

مکانیت کی شدید کمی کا مسئلہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں جو صرف پاکستانی مدرسوں کے ساتھ مخصوص ہو۔ یہ دشواری آج دنیا بھر کے مدرسوں کو درپیش ہے۔ امریکہ ہو یا برطانیہ مدرسوں کے تعمیری پروگرام ہر جگہ رکے ہوئے نظر آتے ہیں۔ امریکی انجمن والدین و اساتذہ نے اپنے ایک حالیہ اجلاس میں یہ انکشاف کرکے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا تھا کہ امریکی مدرسوں میں مکانیت کی جو کمی موجود ہے، اسے پورا کرنے کے لیے نیویارک کے مجسمۂ آزادی سے لے کر کیلیفورنیا کے باب زریں کے پل تک (تقریباً ۲۰۰۰ میل لمبی) ۷۵ فٹ چوڑی ایک منزلہ عمارت تعمیر ہونی چاہیے! دنیا کے دوسرے ملکوں میں مکانیت کی

یہ کمی اور بھی زیادہ شدید صورت میں موجود ہے۔

غرض موجودہ عالمی حالات میں اس بات کا امکان بہت کم ہے کہ مستقبل قریب میں ہمارے تمام مدرسوں کو خاطر خواہ مکانیت میسر آجائے گی۔ تو کیا جب تک ایسا نہ ہو سکے اس وقت تک مدرسے اپنے دروازے بہت سے بچوں پر بند رکھیں؟ ایسا کرنا نئی نسل کے ساتھ بہت بڑی بے انصافی ہوگی۔ ایک آزاد جمہوری ملک میں تعلیم ہر شہری کو پیدائشی حق ہونا چاہیے۔

مکانیت کا مسئلہ جس قدر مشکل ہے، اسی قدر اس کا فوری حل اشد طور پر ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر مدرسے کے لیے معیاری مکانیت بہم پہونچانا ایک امر محال ہے تو کیا اس صورت میں یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم اس بارے میں مشرقی روایات سے استفادہ کریں؟ پاکستان ایک گرم اور خشک ملک ہے جہاں سال کے بڑے حصے میں یہ ممکن ہے کہ جماعتیں کھلی ہواؤں میں درختوں کے سائے تلے یا دھوپ میں لگیں۔ مکانیت کی چھوٹی موٹی ضرورتیں پھوس کے چھپروں سے پوری کی جا سکتی ہیں۔ دیہی رقبوں میں مسجد کی عمارت اور گاؤں کے چوپال سے کام لیا جا سکتا ہے۔ سابقہ ریاست بہاولپور میں اس قسم کا ایک تجربہ جاری ہے۔ غرض ہمارے تعلیمی مسائل اتنے الجھے ہوئے ہیں کہ ان کے حل کے لیے روایتی راستوں کو چھوڑ کر نئی راہیں تلاش کرنا پڑیں گی۔

جغرافیہ
شمالی امریکہ (اعادہ)

سبقوں کے خاکے

عبد الغفور چوہدری

جماعت ہفتم ۔ لڑکوں کی اوسط عمر ۱۲ ۔ ۱۳ سال

ذیل میں اعادہ کے سبق کی روئداد درج ہے ۔ استاد کا مقصد لڑکوں کو چند دنوں بعد ہونے والے امتحان کے لیے تیار کرنا تھا ۔ سبق تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے ۔

(ا) بیس منٹ کے لیے مختصر سوال و جواب (ب) دس منٹ کے لیے مختصر تحریری اعادہ (ج) دس منٹ کے لیے درسی کتاب کا مطالعہ ۔

استاد بیشتر معلومات طلبہ سے اخذ کرتا ہے ۔ البتہ مزید وضاحت کے لیے کہیں کہیں اصلاح اور اضافے کرتا ہے غور کیجیے اعادہ کے سبق کے طریق کار اور نئے سبق مثلاً (چلی) کے طریق کار میں کیا فرق ہے ۔ استاد لڑکوں کے جوابات کو دہراتا نہیں ۔ بلکہ تیزی سے سوالات پوچھتا جاتا ہے ۔ لیکن ربط و تسلسل ٹوٹنے نہیں پاتا ۔ سبق تیز رفتاری سے چلایا جا رہا تھا ۔ اس لیے اس میں تنوع ضروری تھا ۔ چناں چہ سبق کو تین اجزا میں تقسیم کیا گیا ۔

استاد :۔ اس نقشے کو غور سے دیکھو ۔ سطح کے لحاظ سے تم شمالی امریکہ کو کتنے حصوں میں تقسیم کر سکتے ہو !

شاگرد :۔ تین حصوں میں ۔

استاد :۔ ان کے نام بتاؤ ۔

شاگرد :۔ مغربی پہاڑ ۔ وسطی میدان ، اور مشرقی پہاڑ ۔

استاد :۔ ہاں ۔ مغربی سلسلہ کوہ ایک اور براعظم تک پھیلتا چلا گیا ہے ۔

شاگرد :۔ جنوبی امریکہ میں کوہستان انڈیز تک ۔

استاد :۔ شمالی امریکہ میں سب سے مشہور سلسلہ کوہ کونسا ہے ؟

رد :- کوہستان راکی

تاد:- کوئی اور سلسلہ کوہ ؟

رد :- ساحلی سلسلہ کوہ

تاد:- کیا تم اس سلسلہ کوہ میں کسی مشہور گھاٹی کا نام بتا سکتے ہو ؟

رد :- بڑی گھاٹی۔

ستاد :- براعظم شمال میں کونسی قدرتی گزرگاہ ہے ؟

گرد :- دریائے سینٹ لارنس۔

ستاد :- اس کے جنوب میں کیا ہے ؟

گرد :- اپلیشین پہاڑ۔

ستاد :- مشرقی اور مغربی سلسلہ ہائے کوہ کے درمیان میدان ہے۔ اگر دو پہاڑی سلسلوں کے درمیان میدان ہو، اور بارش کی مقدار خاصی ہو تو وہاں کیا ہوگا۔ گویا جہاں پہاڑ ہوں، میدان ہو اور خوب بارش برستی ہو تو وہاں ——— ؟

شاگرد :- وہاں بہت سے دریا ہوں گے۔

ستاد :- امریکہ کے بڑے بڑے دریاؤں کے نام کیا ہیں ؟

شاگرد :- مسسی سپی اور میسوری۔

ستاد :- ان دریاؤں کے اکثر معاون کہاں سے نکلتے ہیں ؟

شاگرد :- کوہ اپلیشین سے۔

ستاد :- ذرا ان بے شمار دریاؤں کی گزرگاہوں کو دیکھو۔ تمہارے خیال میں یہ کیسے بہتے ہوں گے ؟ ایک لفظ میں جواب دو۔

شاگرد :- تیز

استاد :- تیز کے کیا معنی ہیں ؟

شاگرد :- تیز بہنے والا دریا، تیز رفتار۔ آبشار۔ طوفان خیز

استاد :- ان میں سے بعض دریا اس قدر تیز بہتے ہیں کہ ان کے کناروں کے درمیان زمین میں گہرے نشیب پڑ گئے ہیں

ایسے نشیب کو کیا کہتے ہیں؟

شاگرد:۔ گھاٹی۔

استاد:۔ بعض دریا سست رفتار ہیں۔ کیوں؟

شاگرد:۔ جن پہاڑوں میں سے وہ بہتے ہیں۔ وہ زیادہ اونچے نہیں ہیں۔

استاد:۔ ان دو قسم کے دریاؤں میں فرق کیا ہے؟

شاگرد:۔ سست رفتار دریاؤں میں کشتیاں اور جہاز چلتے ہیں

استاد:۔ جس دریا میں کشتیاں اور جہاز چل سکیں وہ کیا دریا ہوتا ہے؟

شاگرد:۔ جہاز رانی کے قابل۔

استاد:۔ اس براعظم میں کس قسم کی آب وہوا ملتی ہے؟

شاگرد:۔ مختلف قسم کی۔

استاد:۔ کیوں؟

شاگرد:۔ کیوں کہ اس کا ایک سرا خط استوا کے قریب ہے اور دوسرا قطب شمالی کے قریب۔

استاد:۔ آب وہوا کا انحصار کن تین اہم چیزوں پر ہے۔

شاگرد:۔ سطح سمندر سے بلندی خط استوا سے فاصلہ اور سمندر سے فاصلہ۔

استاد:۔ ذرا نقشے میں اس کے انتہائے شمال کو یعنی شمالی کینیڈا کو دیکھو۔ یہاں کس قسم کی آب وہوا ہوگی؟

شاگرد:۔ قطب شمالی کے خطے جیسی۔

استاد:۔ یعنی؟

شاگرد:۔ یعنی سارا سال سخت سرد۔

استاد:۔ اگر کینیڈا کے جنوب کی طرف سفر کریں تو آب وہوا پر کس چیز کا اثر پڑے گا؟

شاگرد:۔ عرض بلد کا۔

استاد:۔ اس کی وضاحت کرو؟

شاگرد :۔ خطِ استوا سے فاصلہ کا۔

استاد :۔ اسے تم کیسی آب و ہوا کہو گے ؟

شاگرد :۔ منطقہ معتدل کی آب و ہوا۔

استاد :۔ اس کے خواص بیان کرو۔

شاگرد :۔ گرمی اور سردی دونوں میں بارش

استاد :۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے وسطی میدان میں کینیڈا سے نیچے جنوب کی طرف آب و ہوا پر زیادہ تر کیا چیز اثر ڈالتی ہے ؟

شاگرد :۔ سمندر سے فاصلہ۔

استاد :۔ یہاں شدت کی آب و ہوا ہو گی۔ ایسی آب و ہوا کے خواص کیا ہیں ؟

شاگرد :۔ گرمیوں کا موسم سخت گرم اور سردیوں کا موسم سخت سرد اور گرمیوں میں بارش۔

استاد :۔ اور کیلیفورنیا میں کیسی آب و ہوا ہے ؟

شاگرد :۔ بحیرہ روم کے خطے جیسی آب و ہوا۔ گرمیوں کا موسم لمبا اور خشک اور سردیوں میں کم سردی اور بارش۔

استاد :۔ خلیج میکسیکو کے خطے میں آب و ہوا کا انحصار کس چیز پر ہے ؟

شاگرد :۔ سمندر سے بلندی پر

استاد :۔ ان کے علاوہ یہاں اور کس قسم کی آب و ہوا پائی جاتی ہے ؟

شاگرد :۔ سمندری آب و ہوا۔

استاد :۔ ایسی آب و ہوا کس ملک میں پائی جاتی ہے ؟

شاگرد :۔ برطانیہ میں۔

استاد :۔ اس کے خواص کیا ہیں ؟

شاگرد :۔ نہ شدت کی گرمی اور نہ ہی شدت کی سردی۔

استاد :۔ تو گویا شمالی امریکہ میں پانچ قسم کی آب و ہوا ہے۔ یعنی .... ؟

شاگرد ۔ (۱) سرد خطے کی (۲) برّی (۳) بحیرہ روم کے خطے جیسی (۴) معتدل اور (۵) سمندری آب وہوا۔

استاد ۔ اب ہوا کا لوگوں کے پیشوں سے کیا تعلق ہے ؟

شاگرد ۔ فصلوں کا انحصار آب وہوا پر ہوتا ہے ۔

استاد ۔ شمالی کینیڈا کی آب وہوا سخت سرد ہے ۔ وہاں کے لوگوں کا پیشہ کیا ہوگا ؟

شاگرد ۔ جانوروں کا شکار ۔

استاد ۔ اس سے نیچے معتدل قسم کی آب وہوا ہے ۔ اس خطے میں لوگوں کا پیشہ کیا ہوگا ؟

شاگرد ۔ گیہوں پیدا کرنا ۔

استاد ۔ اس سے نیچے جنوب میں آب وہوا گرم اور مرطوب ہے ۔ اس لیے یہاں مکی ۔ تمباکو اور کپاس پیدا ہوتی ہے ۔ بحیرہ روم کے خطے کی پیداوار کیا ہے ؟

شاگرد ۔ پھل ۔

استاد ۔ اب ہم صنعتوں کا حال پڑھتے ہیں ۔ شمالی امریکہ بڑا مشہور صنعتی ملک ہے ۔ اس کی سب سے بڑی صنعت کیا ہے ؟

شاگرد ۔ لوہے اور فولاد کے کارخانے ۔

استاد ۔ ٹھیک ہے ۔ ان کارخانوں میں کیا چیزیں بنتی ہیں ؟

شاگرد ۔ موٹر کاریں ۔ سٹیم رولر ۔ مشینیں ۔ سوئیاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

استاد ۔ شمالی امریکہ میں لوہے اور فولاد کے کارخانے کہاں واقع ہیں ؟

شاگرد ۱ ۔ کینیڈا میں ۔

شاگرد ۲ ۔ پنسلوینیا میں ۔

استاد ۔ شمالی امریکہ کے مشہور صنعتی شہر کا نام بتاؤ ؟

شاگرد ۔ پٹس برگ ۔

استاد ۔ شمالی امریکہ میں اور کس قسم کے کارخانے ہیں ؟

شاگرد ۔ کپڑے کے

استاد ۔ شاباش! سوتی کپڑا تیار کرنا اس کی اہم صنعت ہے۔ سوتی کپڑا تیار کرنے کے لیے روئی کے علاوہ اور کس چیز کی ضرورت ہے؟

شاگرد ۔ کوئلے کی۔

استاد ۔ ٹھیک ہے۔ سوتی کپڑے کے کارخانے وہاں قائم کیے گئے ہیں جہاں کپاس پیدا ہوتی ہے۔ اس جگہ قائم کیوں نہیں کیے گئے جہاں کوئلے کی کانیں ہیں؟

شاگرد ۔ کوئلے کو کپاس کے پاس لے جانا آسان ہے۔ لیکن کپاس کو کوئلے کے پاس لے جانا مشکل ہے

استاد ۔ اچھا۔ اب ذرا نیوفاؤنڈلینڈ کو دیکھو۔ یہاں ایک اہم صنعت ہے وہ کیا ہے؟

شاگرد ۔ کاڈ مچھلی کا شکار۔

استاد ۔ اس کے لیے کونسی جگہ مشہور ہے؟

شاگرد ۔ ڈاگر بینک

استاد ۔ اور وینکوور کی مشہور صنعت کیا ہے؟

شاگرد ۔ سامن مچھلی کا شکار۔

دوسرا شاگرد ۔ مچھلی کو ڈبوں میں بند کرنا۔

استاد ۔ کیوبک میں ایک اہم صنعت قائم ہے وہ کیا ہے؟

شاگرد ۔ اسبسٹوس یعنی ایسا گتّا جو آگ سے محفوظ رہ سکے۔

استاد ۔ اس کے علاوہ اور کونسی صنعت ہے؟

شاگرد ۔ درخت کاٹنا۔

استاد ۔ ہاں درخت کاٹنا۔ اور کس ملک کے لوگوں کا پیشہ درخت کاٹنا ہے؟

شاگرد ۔ ناروے کے لوگوں کا۔

استاد ۔ ٹھیک ہے۔ بھلا میکسیکو کی مشہور صنعت کیا ہے؟

شاگرد ۔ مٹی کا تیل نکالنا۔

استاد ۔ ہالی وڈ میں ایک اہم صنعت قائم ہے۔ کون بتا سکتا ہے ؟

شاگرد ۔ فلمی صنعت۔

استاد ۔ کیا یہ ایک صنعت ہے۔ بتاؤ کیوں ؟

شاگرد ۔ امریکہ فلموں سے روپیہ کماتا ہے اور ایکٹروں اور ایکٹرسوں کے علاوہ فلموں میں کئی دوسرے لوگ بھی کام کرتے ہیں۔

استاد ۔ ہاں امریکہ کی صنعتیں اور لوگوں کے پیشے ایک بار پھر دہراؤ۔

شاگرد ۔ سرد خطے میں جانوروں کا شکار۔ اس کے جنوب میں گیہوں کی کاشت اور مکئی کی کاشت۔ کیوبک میں درخت کاٹنا پنسلوینیا میں کوئلے اور لوہے کی صنعت۔ نیو انگلینڈ کی ریاستوں میں کپڑے کے کارخانے۔ ٹیکساز میں مٹی کا تیل نیو فاؤنڈلینڈ میں مچھلی کا شکار۔ برٹش کولمبیا میں مچھلی کا شکار اور مچھلی کو سکھا کر ڈبوں میں بند کرنا۔ ہالی وڈ اور لاس اینجلز میں فلمی صنعت

استاد ۔ شاباش! اچھا اب شمالی امریکہ کی سیاسی تقسیم بیان کرو۔ شمالی امریکہ میں کون کون سے ملک ہیں ؟

شاگرد ۔ کنیڈا اور ریاست ہائے متحدہ دو ملک ہیں۔

استاد ۔ میکسیکو کیوں نہیں ؟ وہ بھی اسی میں شامل ہے۔ گویا شمالی امریکہ پر تین ملکوں کا قبضہ ہے۔ ان کے نام بتاؤ ؟

شاگرد ۔ کینیڈا برطانیہ کے ماتحت ہے۔ ریاست ہائے متحدہ آزاد ملک ہے اور میکسیکو بھی آزاد ہے۔

استاد ۔ کینیڈا کے دارالخلافہ کا کیا نام ہے ؟

شاگرد ۔ اٹاوہ

استاد ۔ ریاست ہائے متحدہ کا دارالخلافہ کون سا شہر ہے ؟

شاگرد ۔ واشنگٹن۔

استاد ۔ میکسیکو کا دارالخلافہ کونسا ہے ؟

شاگرد ۔ شہر میکسیکو۔

استاد ۔ کینیڈا کے حاکم اعلیٰ کو کیا کہتے ہیں ؟

شاگرد ۔ گورنر جنرل۔

استاد	اسے کون منتخب کرتا ہے؟

شاگرد	انگلستان کی ملکہ۔

استاد	ریاست ہائے متحدہ میں کیسی حکومت ہے؟

شاگرد	جمہوری۔

استاد	اُس کا صدر کون ہے؟

شاگرد	جنرل آئیزن ہاور

استاد	اور میکسیکو کے صدر کا کیا نام ہے؟ اچھا چھوڑو یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں۔ سبق ختم کرنے سے پہلے میں چند اصطلاحات تختۂ سیاہ پر لکھتا ہوں ان کی تعریفیں کرو۔

(تختۂ سیاہ پر مندرجہ ذیل اصطلاحات لکھی جاتی ہیں)

ٹنڈرا۔ سطح سمندر سے بلندی۔ پمپاس۔ پیراموس۔

شاگرد ۱	قطب شمالی کے اردگرد کے برفانی علاقوں کو ٹنڈرا کہتے ہیں۔

شاگرد ۲	قطب شمالی کے اردگرد کے سرد خطے کی پیداوار کو ٹنڈرا کہتے ہیں۔

استاد	ہاں شمالی کینیڈا کے علاوہ ایسی پیداوار اور کہاں پائی جاتی ہے؟

شاگرد ۱	ایشیا کے انتہائے شمال یعنی سکنڈے نیویا۔ سائبیریا۔ فن لینڈ اور جنوبی قطب کے علاقوں میں۔

شاگرد ۲	سطح سمندر سے بلندی سے مراد وہ اونچائی ہے جس پر کوئی مقام واقع ہو۔ یہ اونچائی فٹوں میں ماپی جاتی ہے۔

شاگرد ۳	پمپاس جنوبی امریکہ کے ایک خاص میدانی حصہ کو کہتے ہیں جس کی بڑی پیداوار گیہوں ہے اور جہاں مویشی پالے جاتے ہیں۔

استاد	شمالی امریکہ میں پمپاس کے مقابلے میں کونسا میدان ہے؟

شاگرد	پریری کا میدان . . . . اور روس میں سٹیپ کا میدان۔

شاگرد ۲	پیراموس اُس خطۂ زمین کو کہتے ہیں جو سطح سمندر سے دس ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہو۔

استاد۔	اچھا اب اپنی کتابیں کھولو اور دس منٹ کے لیے خاموشی سے شمالی امریکہ کا حال پڑھو۔

طلبہ کی یونی فارم کا مسئلہ

فضل احمد

آموزش کے اس شمارے میں مفتی محمد اقبال صاحب کا ایک مضمون مندرجہ بالا موضوع پر شائع ہو رہا ہے۔ مفتی صاحب موصوف ایک گورنمنٹ ہائی اسکول کے سرمعلم ہیں اور اس سے پہلے سالہا سال تک بطور رلے۔ڈی آئی کام کر چکے ہیں۔ لہٰذا ان کے خیالات کو آزمودہ کار اور واقف حال اساتذہ کے افکار کا آئینہ سمجھنا چاہیے۔

مضمون نگار نے اپنے اس مضمون میں بتایا ہے کہ انسپکٹر مدارس راول پنڈی نے مری میں سر معلموں کی ایک کانفرنس بلائی جس میں انھیں ہدایت کی کہ اپنے اپنے مدرسوں میں یونی فارم رائج کریں۔ مضمون نگار نے بھی اس حکم کی تعمیل کی اور سختی سے اس پر عمل پیرا ہونا چاہا۔ لیکن اس ضمن میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے مضمون نگار کے جذبات انسانیت کو شدید ٹھیس پہونچائی اور انھوں نے اپنے مدرسے میں یونی فارم کی پابندی کو ختم کر دیا وہ واقعہ یہ ہے کہ ایک روز ایک طالب علم یونی فارم کی بجائے ریشمی دھوتی باندھے آگیا۔ سرمعلم کو اس حرکت پر سخت غصہ آیا اور قریب تھا کہ بید سے اس کی خبر لی جاتی، اتنے میں طالب علم نے یہ انکشاف کیا کہ یہ ریشمی دھوتی دراصل اس کی بہن کی دھوتی ہے۔ اس کا باپ اس قدر نادار ہے کہ اسے پاجامہ سلا کر نہیں دے سکتا، وہ مدرسے آتے وقت بہن کی دھوتی بطور دھوتی استعمال کرتا ہے اور گھر جا کر باقی سارا دن لنگوٹی باندھے رہتا ہے۔ سرمعلم اس صورت حال سے بہت متاثر ہوئے اور طالب علم مذکور کو ریڈ کراس فنڈ سے مطلوبہ قسم کا پاجامہ اور قمیص بنوا دی۔ اس پر شہر بھر میں چرچا ہونے لگا کہ سرمعلم کو کیا حق ہے کہ ریڈ کراس فنڈ سے ایک ایسے طالب علم کی مدد کرے جو ریشمی دھوتی پہنتا ہے! اس تمام واقعہ نے سرمعلم کے جذبات کو اس بری طرح مجروح کیا کہ انھوں نے یونی فارم کا حکم واپس لے لیا اور طلبہ کو اجازت دے دی کہ جس لباس میں چاہیں مدرسے میں آئیں۔

غیر جمہوری طریق کار

اس استدلال میں اول سے آخر تک بہت سی باتیں محل نظر ہیں، سب سے پہلی بات یہ ہے کہ جدید تعلیم مدرسے کو

کوئی ایسا معاشرہ خیال نہیں کرتی جس میں سربراہ معلم آمرِ مطلق کا درجہ رکھتا ہو اور محض "کن" کے کہنے سے جس چیز کو چاہے وجود میں لے آئے اور جس چیز کو چاہے ختم کر دے۔ اس کے برعکس نئی تعلیم کا بنیادی موقف یہ ہے کہ مدرسہ ایک ایسا معاشرہ ہے جس میں اساتذہ، طلبہ اور والدین برابر کے شریک کار ہیں۔ یہ تینوں اجزا مسلسل تعاون اور افہام و تفہیم سے ایک ایسی اجتماعی زندگی کی داغ بیل ڈالتے ہیں جس میں طلبہ برضا و رغبت بھرپور حصہ لیتے ہیں۔ طلبہ کی تعلیم و تربیت اسی عملی حصہ گیری سے عبارت ہے۔

اس نظری پس منظر میں اب واقعہ زیر بحث پر نظر ڈالیے۔ مدرسے میں طلبہ کے لباس سے متعلق ایک حکم نافذ کیا جاتا ہے۔ ہر چند کہ اس کے متعلق انسپکٹر مدارس نے مشورہ دیا تھا لیکن اس کا یہ مطلب تو نہ ہونا چاہیے تھا کہ سربراہ معلم دفتر میں بیٹھ کر ایک حکم لکھ دیں جو تمام طلبہ کو سنا دیا جائے اور ایک مقررہ تاریخ سے "بہ زور ہید" اس پر عمل درآمد شروع کر دیا جائے۔ اگر نئی پود کو جمہوریت اور اسلامی اقدار کی تعلیم دینے کے یہی ڈھنگ ہیں تو معلوم نہیں استبداد اور مطلق العنانی کس چیز کا نام ہے؟

نفسیاتی طور پر یہ حقیقت ثابت شدہ ہے کہ جماعتی زندگی میں وہی عمل مطلوبہ اخلاقی نتائج پیدا کر سکتا ہے جو جماعتی فیصلے کی پیداوار ہو۔ یونی فارم کے فیصلے کو اوپر سے ٹھونسنے کی بجائے بہتر صورت یہ ہوتی کہ مختلف اساتذہ اپنی اپنی جماعتوں میں کچھ دنوں تک اس سوال پر بحث کرتے۔ طلبہ کو اس کے تعلیمی اور اخلاقی فوائد بتاتے۔ طلبہ کے نقطہ ہائے نگاہ کو سنتے۔ ان کی مفروضہ یا حقیقی دشواریاں معلوم کرتے، مخصوص حالات رکھنے والے طلبہ کو انفرادی بات چیت کا موقع دیتے اور اس طرح نہ صرف غالب اکثریت کو یونی فارم کا سرگرم حامی بنا لیتے بلکہ معدودے چند نادار طلبہ کی مجبوریوں کا شافی حل بھی ڈھونڈ لیتے۔ اس قسم کی ذہنی تیاری اور انتظامی پیش بندی کے بغیر جو چیز بھی اجتماعی زندگی پر چسپاں کی جائے گی وہ نہ صرف مطلوبہ اخلاقی تربیت سے عاری رہے گی۔ بلکہ اکثر اوقات دل ہلا دینے والی انفرادی دشواریاں بھی پیدا کرے گی۔

بہ فرض محال اگر یونی فارم کا حکم فوری طور پر جاری کرنا ناگزیر بھی تھا تو اس کے نفاذ کی ذمہ داری اساتذہ کو سونپی جانی چاہیے تھی تاکہ وہ نسبتاً چھوٹے گروہ کے ذاتی حالات کا فرداً فرداً جائزہ لے سکتے اور غیر معمولی مجبوری کی خبر سربراہ معلم کو دے دیتے۔ اس صورت میں یہ نوبت کبھی نہ آتی کہ سربراہ معلم غصے سے بیچاں و تیاں بید و ہوا میں گھماتے۔ ایک ننھی سی معصوم روح پر جلاد وار پل پڑنے کو تیار ہیں۔ جب دفعتہً ایک غیر متوقع حقیقت کا انکشاف نہ صرف ان کے ہاتھ کو روک دیتا ہے بلکہ ان کے عزم کی

بنیادیں بھی اس طرح کھوکھلی کر کے رکھ دیتا ہے کہ وہ اس منصوبے سے یک دم ہاتھ کھینچ لیتے ہیں جس کے لیے وہ ایک لحظہ پہلے تک سراپا عزم تھے۔

یہ سارا واقعہ قرون وسطیٰ کے ان تہرمان تاعبداروں کی یاد تازہ کرتا معلوم ہوتا ہے جن کے متعلق سعدیؒ مرحوم فرما گئے ہیں کہ :- "گاہے بہ سلامے برنجند وگاہے بہ دشنامے خلعتے دہند"۔ سراکا عزم راسخ پہلے اور سماعت عذر بعد میں"۔ یہ ایسا طریق کار ہے جس کی ایک جمہوری معاشرے میں کوئی گنجائش نہیں، چہ جائے کہ اسے دنیا کی واحد اسلامی جمہوریت کے مدرسوں میں اپنایا جائے۔ ہمارے پختہ کار اساتذہ اور سربراہ معلم جو اس اصول کو اب تک اپنے انتظامی امور کا سنگ بنیاد بنائے ہوئے ہیں۔ انہیں اس بات پر اچھی طرح سوچ بچار کرنا چاہیے کہ کیا انتظامی قابلیت کی دھن میں وہ ایسی راہ پر تو نہیں چل رہے جو فرعونی روایات کی باقیات السیئات میں سے ہے اور جس پر چل کر اجنبی حکمران ایک صدی سے زیادہ عرصہ تک مسلمان قوم کو پاؤں تلے روندتے رہے ہیں۔ یہی وہ استخفاف ہے جس کے چپ چاپ برداشت کرنے کو قرآن حکیم نے واضح طور پر فسق کا نام دیا ہے۔ اگر قوم کے نونہالوں کو مدرسوں میں اس فسق کی تربیت ملے گی تو کل کو بڑے ہو کر وہ ملکی ذمہ داریاں جس طور پر انجام دیں گے اس کے متعلق کسی صاحب نظر کو غلط فہمی نہیں ہو سکتی۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

اوپر کی سطروں میں سچی جمہوری روح اور جمہوری طریق کار کی جو وکالت کی گئی ہے اس سے بہت سے روایت پرست استادوں کو شاید اختلاف ہو لیکن یہ اختلاف محض ایک غلط فہمی کی پیداوار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بڑے سے بڑا ترقی پسند ماہر تعلیم بھی یہ کبھی نہیں کہے گا کہ استاد اپنی نکیل طلبہ کے ہاتھ میں دے دے۔ اپنی پختہ عمر، وسیع تجربے اور بلند علمیت کے باعث استاد کو ہر حال میں ایک نمایاں قائدانہ حیثیت حاصل رہنی چاہیے۔ جمہوری طریق کار کا مطالبہ فقط یہ ہے کہ اس قائدانہ مقام کی بنیاد طلبہ کے دلوں میں ہو نہ کہ اقتدار پر۔ جمہوریت اور آمریت کی حدیں اس قدر ملی ہوئی ہیں کہ سطحی نظر اکثر اوقات ان کے امتیاز کرنے میں دھوکہ کھا جاتی ہے۔ جمہوریت بھی نظم و ضبط کی اتنی ہی قائل ہے جتنی آمریت۔ البتہ دونوں کے طریق کار میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ کوئی نگران یا دہ تما اس وقت تک صحیح جمہوری طریق کار کو نہیں اپنا سکتا جب تک اس نے سچی جمہوری روح کو نہ پالیا ہو اور اپنے ساتھیوں کو اس کی اسمانی لذت سے آشنا نہ کر دیا ہو۔

غیر نفسیاتی علاج

واقعہ زیر بحث کا دوسرا حیران کن پہلو وہ غیر نفسیاتی علاج ہے جو سربراہ معلم نے ایک نادار طالب علم کی مجبوری کے لیے

ہو پڑ گیا۔ ناداری کوئی ایسا مرض نہیں جو صرف پاکستان کے ساتھ مخصوص ہو۔ تقسیم دولت کی ناہمواریاں اس قدر عالمگیر ہیں کہ تاریخ کا امیر ترین قوم بھی ان سے خالی نظر نہیں آئے گی۔ مدرسہ چونکہ وسیع تر قومی معاشرے کا ایک چھوٹا سا جزو ہوتا ہے۔ اس لیے یہ ناہمواریاں اس میں بھی منعکس ہوئے بغیر نہیں رہتیں۔ یہ ایک اتنی عام اور کھلی ہوئی حقیقت ہے جس کے لیے ہر معلم کو تیار رہنا چاہیے۔ ریڈ کراس فنڈ اور اس قسم کے دوسرے امدادی فنڈ تقسیم دولت کی ناہمواریوں سے پیدا شدہ مجبوریوں کو رفع کرنے کے لیے ہی وجود میں لائے جاتے ہیں۔ مگر ان امدادی رقوم کے استعمال میں سب سے پہلی احتیاط یہ ہونی چاہیے کہ امداد لینے والے کی عزت نفس کو کسی قسم کا دھکا نہ لگے۔ ہادی عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ: "خیرات اس طرح دی جائے کہ دایاں ہاتھ دے تو بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہونے پائے" اسی نفسیاتی حقیقت پر مبنی ہے۔ مگر ہمارے تجربہ کار صدر معلم ایک حقیقی طور پر حاجت مند طالب علم کو ریڈ کراس فنڈ سے قمیص اور شلوار اس طور پر دلاتے ہیں کہ فوراً سارے قصبے میں اس بات کا چرچا ہو جاتا ہے۔ اس انداز بخشش پر غریب طالب علم ضرور جی میں کہتا ہوگا کہ "مجھ پر احسان جو نہ یہ کرتے تو احسان ہوتا"۔

راقم کو اپنے قیام امریکہ کا ایک دن اچھی طرح یاد ہے۔ ہم ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے صدر مقام میں جیفرسن میموریل جونیئر ہائی اسکول دیکھنے گئے۔ انگلستان امریکہ اور بعض دوسرے ترقی یافتہ ملکوں میں مدرسے بچوں کے لیے دوپہر کے کھانے کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔ دوسری باتوں کے علاوہ اس سے غرض یہ ہوتی ہے کہ ہر بچے کو کم سے کم دن میں ایک بار متوازن غذا مل جائے اور یوں نہ صرف اس کی تندرستی ترقی پائے بلکہ اس میں یہ شعور بھی پیدا ہو کہ صحت بخش اور متوازن غذا سے کیا مراد ہے۔ جیفرسن میموریل اسکول کے صدر معلم ہمیں مدرسہ دکھاتے دکھاتے دارالطعام میں لے گئے۔ جب ان سے یہ سوال پوچھا گیا کہ کیا تمام والدین اتنی استطاعت رکھتے ہیں کہ بچے کے دوپہر کے کھانے کے اخراجات برداشت کر سکیں تو انہوں نے جھٹ اعتراف کیا کہ دولت کی عام ریل پیل کے باوجود امریکہ کے دارالسلطنت میں بھی ایسے والدین کی کمی نہیں جو بچوں کے دوپہر کے کھانے کے اخراجات ادا نہیں کر سکتے۔ مگر انھوں نے ساتھ ہی یہ وضاحت بھی کر دی کہ ہم ایسے بچوں کو فاقے رہنے کی اجازت نہیں دے سکتے اور نہ ہی انھیں خیرات پر جینے کا عادی بنانا چاہتے ہیں۔ ہم ان سے دارالطعام میں کام لیتے ہیں وہ برتن صاف کرتے اور دوسری خدمات انجام دیتے ہیں اور یوں اپنا دوپہر کا کھانا کماتے ہیں۔ ان کی عزت نفس کو اس احساس سے بڑا سہارا ملتا ہے کہ وہ خود اپنی محنت کی کمائی کھا رہے ہیں۔

ایک امریکی ماہر تعلیم نے اپنی ایک تازہ تصنیف میں اس قسم کے ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ اس کا تعارف ایک ایسے

کلبے سے ہوا جہاں والد اپنی پیشہ ورانہ ترقی کی خاطر سال بھر کے لیے فنی تربیت حاصل کر رہا تھا۔ اس کلبے نے پیسے سے اس منصوبے کی ضروریات کو نگاہ میں رکھ کر کچھ رقم بچائی تھی۔ اس کے باوجود بڑی لڑکی نے جو ذرا سیانی تھی مدرسے کے اوقات کے بعد کچھ کام کاج کر کے اتنی رقم پیدا کر لی جس سے وہ اپنے لیے کپڑوں کے چند جوڑے خرید سکے۔

غرض سارے مدرسے میں ایک یا چند ایک، ایسے طلبہ کا کل آ جن کے والدین یونیفارم تیار نہ کر سکتے ہوں کوئی ایسا انقلاب آفرین واقعہ نہیں جس سے مدرسے کی ساری زندگی ہی تہ و بالا ہو جائے۔ ہمارے ملک کی روایات اور کاروباری سہولتیں اس قسم کی نہیں کہ ایک طالب علم آسانی کے ساتھ اپنی محنت سے کچھ کما لے لیکن ایسی روایات اور اس قسم کی سہولتیں پیدا کرنے میں پہلا قدم استادوں ہی کو اٹھانا چاہیے۔ راقم ذاتی طور پر ایک ایسے طالب علم کو جانتا ہے جو ایک گورنمنٹ ہائی اسکول کی آٹھویں جماعت میں پڑھتا ہے اور مدرسہ کے اوقات کے بعد ریڑھی پر موسمی پھل اور سبزیاں فروخت کرتا ہے اور یوں اپنا اور اپنی بیوہ والدہ اور یتیم بہن بھائیوں کا پیٹ پالتا ہے۔ یہ لڑکا پڑھائی میں بھی عام درجے سے کافی اونچا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس طرح پر طلبہ کی حوصلہ افزائی کی جائے کہ وہ اپنی مدد آپ کریں جہاں تو مدرسے کے پیسے امداد کرنا ناگزیر ہو جائے وہاں بھی اس بات کا سختی سے لحاظ رہنا چاہیے کہ مدد لینے والے کی عزت نفس کو ٹھیس نہ لگے۔

والدین سے عدم تعاون

واقعہ کا بڑا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ قصبے کے عوام نے سر معلم کی جائز امداد کو غلط بخشی کا نام اس لیے دیا کہ انہوں نے ایک ایسے لڑکے کو قمیص اور شلوار مہیا کی تھی جو مدرسے میں ریشمی دھوتی پہن کر آتا تھا۔ حیرت ہے کہ ان لوگوں کو وہ ریشمی کپڑا تو نظر آ گیا جو یہ ستم رسیدہ چند گھنٹوں کے لیے بہن کے جسم سے اتار لاتا تھا۔ مگر انھیں وہ پھٹی ہوئی لنگوٹی دکھائی نہ دی جو وہ دن رات گلی بازاروں میں پہنے پھرتا تھا۔ اس سے زیادہ تعجب اس بات کا ہے کہ سر معلم نے حقیقت حال آشکارا کرنے کے لیے آموزش کے صفحات تک پہنچنے کی زحمت تو اٹھائی لیکن ان لوگوں کو بھروسے میں لینا ضروری نہ سمجھا جن سے انہیں وہ دانت سابقہ تھا اور جن کا ہمدرد و فہیم مدرسے کی صحت مند نشو و نما کا سب سے بڑا ضامن ہو سکتا تھا۔ عوام کو بھروسے میں نہ لینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ سر معلم مدرسے کی اجتماعی زندگی کے ایک ایسے مفید پہلو کو ترک کرنے پر مجبور ہو گئے جس کی افادیت کا انہیں خود بھی یقین تھا۔

یکساں طور پر حیران کن یہ امر ہے کہ ہم طالب علم زیر بحث کے والد یا سرپرست کو تصویر میں سے یکسر غائب پاتے ہیں
لڑکے کو مدرسہ بھیجنے سے پہلے اس کے والد کے ساتھ تفصیلی بات چیت ہونی چاہیے تھی۔ اسے یہ احساس دلانا ضروری تھا کہ
آئندہ بیٹی کو ریشمی دھوتی کی بجائے سوتی دھوتی خرید کر دے اور اس طرح کنبے کے بجٹ میں بیٹے کی قمیص شلوار
کے لیے گنجائش پیدا کرے۔ جدید تعلیم محض طلبہ کی تعلیم پر نہیں رک جاتی۔ وہ والدین کو بھی اپنے دائرہ اثر میں لاتی ہے۔ والدین
کو اپنے حال پر چھوڑ کر محض بچے پر توجہ صرف کر کے کوئی تعلیم اپنا مقصد پورا نہیں کر سکتی۔ ہمارے آزمودہ کار سر معلم نے اس
اہم نکتہ کی طرف بظاہر کوئی توجہ نہیں دی۔

غیر سائنسی استدلال

اس قصے کا سب سے افسوس ناک پہلو اس کی جذباتی اپیل ہے۔ یہ اپنے جواز کے لیے معقولیت کی بجائے جذبات کا
سہارا لیتا ہے۔ جدید تعلیم کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اپنی ساری عمارت نفسیاتی حقائق اور ٹھوس تجرباتی شہادت
کی بنیادوں پر اٹھائی ہے۔ اس کے برعکس روایت پرست تعلیم کے پاس لکیر پیٹنے اور جذباتی نعروں کا سہارا لینے کے سوا اور
کچھ نہیں۔ زیر بحث واقعہ میں سر معلم نے دوسرے طریق کار سے کام لیا ہے۔

سابق پنجاب کی وزارت تعلیم نے یونی فارم کی سفارش پچھلے سال کی تھی۔ صوبے کے کئی مدرسوں نے تقریباً
ایک سال سے اس سفارش پر عمل شروع کر رکھا ہے۔ یہ فرض کر لینا بدیہی طور پر لغو ہے کہ ان مدرسوں میں کوئی بھی طالب علم
ایسا نہ تھا جسے یونی فارم مہیا کرنے میں دشواری پیش نہ آئی ہو یقینی طور پر ان میں کئی نادار طلبہ ایسے ہوں گے جو اول اول مقررہ
قسم کا لباس فراہم نہ کر سکتے ہوں مگر چند استثنائی صورتوں کی بنا پر ایک اچھے اصول کی صحت یا افادیت میں فرق نہیں آ جاتا
نادار سے نادار طالب علم بھی آخر جسم ڈھانپ کر مدرسے میں آتا ہے۔ اگر وہ فوری طور پر یونی فارم تیار نہ کر سکتا ہو تو اسے اس سے
مستثنیٰ قرار دینے میں کوئی ہرج نہیں۔ اگر مدرسے میں اس قسم کے درجن یا نصف درجن طلبہ کو شروع شروع میں مستثنیٰ
قرار دینا پڑے تو اس میں چنداں مضائقہ نہیں۔ ایسے طلبہ کے متعلق ان کے ہم جماعتوں کو بتا دینا چاہیے کہ تمہارے یہ
بھائی سردست لباس کے معاملے میں تمہارے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرنے کے قابل نہیں۔ مگر جوں ہی ان کے موجودہ کپڑے
پھٹیں گے وہ نئے کپڑے مقررہ وضع ہی کے تیار کرائیں گے۔ افہام و تفہیم اور جائز سہولت کے اس راستے پر چلنے سے
ہر مدرسہ چند ماہ کے اندر اندر سب کے سب طلبہ کو یونی فارم میں ملبوس دیکھ سکتا ہے۔ یہ سائنسی طریق کار ہے۔

مگر ہمارے محترم سر معلم ایک نادار طالب علم کی دکھ بھری کہانی سن کر اتنے دل برداشتہ ہوئے کہ یونی فارم کی افادیت پرسے ان کا یقین یک دم اٹھ گیا۔ ان کا یہ جذباتی ردعمل گوتم بدھ کے اس روایتی قصے کی یاد تازہ کرتا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ بچپن میں راجکمار گوتم کو دنیاوی دکھوں سے بالکل بے خبر رکھا گیا تھا۔ مگر سیانا ہونے پر جب اس نے ایک بڈھے ایک بیمار اور ایک مردے کو دیکھا تو اس کا دل دنیا سے یک دم اس طرح اچاٹ ہوا کہ فوراً اسے لات مار کر جنگلوں کی راہ لی۔ مگر آخر الامر گیان حاصل ہو جانے پر گوتم بدھ کو بھی دوبارہ اسی دنیا میں لوٹنا پڑا تھا جس کو کبھی وہ خیر کہہ گیا تھا۔

نقطۂ نگاہ کا فرق

صرف یہ ایک مثال روایت پرست تعلیم اور ترقی پسند تعلیم کے مختلف نقطہ ہائے نگاہ کا فرق واضح کرنے کے لئے کافی ہے۔ اس پر سیر حاصل تبصرہ بھی صرف یہ فرق واضح کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔ جن سر معلم صاحب کے افکار اور طریق کار کو موضوع بحث بنایا گیا ہے ان کی نیک نیتی میں ہرگز کوئی کلام نہیں۔ انہوں نے دیانت داری سے ایک چیز کو درست سمجھا اور کر گذرے لیکن محض نیک نیتی انسانی مسائل کا شافی حل پیش نہیں کرسکتی۔ اس کے ساتھ سائنسی انداز فکر اور تجرباتی طریق کار بھی ہونا چاہیے۔ ترقی پسند تعلیم خلوص نیت کے علاوہ ان دو چیزوں کا بھی مطالبہ کرتی ہے۔

طلبہ کی یونی فارم کا مسئلہ

یہاں تک ایک خاص واقعہ زیر بحث تھا۔ اب یونی فارم کے مسئلہ پر ایک عام تنقیدی نگاہ ڈالنی چاہیے۔ بجا ہے کہ جس ملک میں فی کس اوسط ماہوار آمدنی پندرہ بیس روپے کے لگ بھگ ہو وہاں بعض والدین کو اول اول امر دشوار معلوم ہوگا کہ بچوں کو ایک خاص قسم کا لباس تیار کر کے دیں۔ لیکن یہ دشواری درسی کتابوں کے معاملے میں بھی ہے۔ اس کے باوجود کبھی کسی صاحب شعور آدمی نے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ درسی کتابیں اڑا دینی چاہئیں۔ وجہ بالکل ظاہر ہے۔ درسی کتابوں کے بغیر موثر تدریس ممکن ہی نہیں۔ لہٰذا ہر کس و ناکس کو چار و ناچار درسی کتابیں فراہم کرنی ہیں۔ جو والدین اس استطاعت سے یکسر محروم ہوں ان کی مدد مدرسہ یا کوئی اور تنظیم کر دیتی ہے۔ بعض ترقی یافتہ ملکوں میں درسی کتابیں حکومت کی طرف سے مفت مہیا کی جاتی ہیں۔ بہر حال ان کی گرانی یا والدین کی ناداری انہیں غیر ضروری نہیں بنا سکتی۔

یونی فارم کے معاملے میں اصولی صورت حال کیا ہے؟ یقینی طور پر یونی فارم لکھائی پڑھائی کے کام میں کچھ مدد نہیں
دیتی۔ مگر یہ جماعت کی مؤثر تدریس اس کے بغیر بھی ممکن ہے۔ پھر اسے درسی کتابوں کی طرح لازمی قرار دینے کا جواز کیا ہے؟
اس کا جواب یہ ہے کہ تعلیم کا جدید تصور صرف لکھائی پڑھائی تک محدود نہیں۔ وہ بچوں کے اطوار و اخلاق کو بھی اپنے
دائرے میں لیتا ہے اور تعلیم کو تربیت کردار کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔ اب خیال فرمایئے کہ وہ مدرسہ کس قسم کے کردار کی تربیت
کرے گا جہاں چند بچے طرح طرح کے قیمتی لباس پہنے اتراتے پھریں۔ ایک بہت بڑی تعداد ان کو رشک و حسد کی نگاہ
سے دیکھا کرے اور مستقل طور پر اسی آرزو میں رہے کہ کسی نہ کسی طرح انہیں بھی اس معیار کا لباس ہاتھ لگ جائے
اور ایک خاصی تعداد ایک لاعلاج احساس کم تری کے نیچے بے رحمانہ طور پر پستی رہے۔ اس مدرسے کی پیداوار کو
ان بڑے گروہوں میں بانٹا جا سکے گا:-

(۱) ایک ایسا گروہ جو بری طرح پندار کا شکار ہے وہ اپنے آپ کو کسی بات میں بھی دوسروں جیسا سمجھنے کا عادی
نہیں۔ وہ ایک بلند تر مقام کو اپنا پیدائشی حق سمجھنے لگا ہے۔

(۲) وہ گروہ جس نے پہلے گروہ کی نقالی میں ایک جھوٹا روپ دھار رکھا ہے اس کے ذرائع اس نقالی کی اجازت
نہیں دیتے مگر وہ ہر جائز و ناجائز ذریعہ سے اپنے تصنع کو برقرار رکھنے پر تلا ہوا ہے۔

(۳) وہ گروہ جسے یہ یقین ہو چکا ہے کہ پہلے گروہ تک رسائی کسی طرح ممکن نہیں۔ اس احساس نے اس گروہ میں
ایک پائیدار شکست خوردہ ذہنیت پیدا کر دی ہے۔ اس احساس نے ان لوگوں کی شخصیتوں کو نیم مفلوج سا کر
رکھا ہے۔

یہ نتائج کسی بھی مدرسے کے لیے قابل فخر نہیں ہو سکتے۔ ترقی پسند تعلیم بنیادی طور پر جمہوریت پسند تعلیم ہے
لہٰذا یہ صورت حال اس کے لیے بالکل ناقابل قبول ہے۔ یونی فارم کا اجرا ان طبقاتی درجہ بندیوں کا مؤثر طور پر راستہ
روک دیتا ہے۔ بالغ زندگی میں ہر شخص اپنی حیثیت اور ضرورت کے مطابق جس قسم کا لباس چاہے پہنے لیکن
طالب علمی کے زمانے میں یونی فارم کی بدولت یہ بات ممکن نہیں رہتی کہ لباس کسی امتیاز یا تفریق کا ذریعہ بنے۔ اس
سے قومی وحدت اور احساس اخوت کو جو تقویت ملتی ہے، اس کا پورا اندازہ عملی نتائج دیکھ کر ہی کیا جا سکتا
ہے۔

ـــ ترقی یافتہ ملک کی مثال

ریاست ہائے متحدہ امریکہ سرمایہ دارانہ نظام معیشت کا آج دنیا میں سب سے بڑا علم بردار ہے، دولت کی
یادی تقسیم کے بارے میں اس ملک کو مثالاً پیش کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس ملک کے مدرسوں میں قدم رکھتے ہی
ـــ خوش گوار یکسانیت اور ہم آہنگی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ تمام لڑکے موٹی نیلی زین کی پتلونوں اور مختلف رنگوں
نگ جیکٹوں میں ملبوس نظر آتے ہیں۔ یہ وہ لباس ہے جو عام مزدور اور کسان کام کاج کے وقت پہنتے ہیں طلبہ
ں یہ لباس اس قدر مقبول ہے کہ کوئی لڑکا، خواہ وہ کتنا ہی امیر کیوں نہ ہو، دوسرے لباس کا خیال بھی دل میں نہیں لائے گا۔
ا پر لطف یہ ہے کہ یہ یونی فارم کسی سرکاری دباؤ یا حکم سے نافذ نہیں بلکہ قومی مزاج کا ایک جزو بن چکی ہے۔

اس یونی فارم سے ایک جمہوری معاشرے کو جو قوت حاصل ہوتی ہے راقم کو اس کا بھرپور احساس اس روز ہوا
ہ اس نے ریاست ڈیلاویر کے شہر ولمنگٹن میں ٹاورہل اسکول کو دیکھا۔ یہ ایک پرائیویٹ مدرسہ ہے جو امریکہ کے
رپتی خاندان ڈوپونٹ کی فیاضی سے چل رہا ہے۔ اس خاندان کا شمار امریکہ کے امیر ترین خاندانوں میں ہوتا ہے، اور
یائی صنعت کے میدان میں اسے کم و بیش اجارہ داری حاصل ہے۔ ٹاورہل سکول میں قدم رکھتے وقت مجھے تقریباً یقین
لہ ڈوپونٹ خاندان کے بچوں کو کسی نہ کسی امتیازی نشان سے پہچاننا ممکن ہوگا۔ جب چند کمروں میں جانے کے بعد
ں ایسا امتیازی نشان نظر نہ آیا تو آخرکار میں نے استاد سے پوچھا کہ یہاں ڈوپونٹ بچے کون کون سے ہیں۔ اس نے
ستہ سے تین چار لڑکے لڑکیوں کی طرف اشارہ کیا جو جماعت میں مختلف جگہوں پر بیٹھے تھے۔ اس روز سکول ہال میں
بہ کا ایک عام جلسہ ہوا جس کے تمام انتظامات طلبہ ہی کے ہاتھ میں تھے۔ میرا گمان تھا کہ ان عہدہ داروں میں اکثریت
ور ڈوپونٹ بچوں کی ہوگی۔ چناں چہ جلسہ کے اختتام پر صدر جلسہ سے (جو ایک طالبہ تھی) پوچھا کہ کیا تم ڈوپونٹ ہو؟
ں پر اس نے مسکرا کر جواب دیا کہ نہیں میں تو ان کے وظیفہ پر تعلیم حاصل کر رہی ہوں۔ اب اس صورت حال کا موازنہ
جاگیردارانہ قسم کے معاشرے سے کیجیے جہاں صاحبزادے کی "بسم اللہ" پر تمول کی وہ نمائش ہوتی ہے کہ دور دور تک
رہو جائے اور مدتوں یادگار رہے۔ پھر صاحبزادہ صاحب اس شان سے مکتب کو چلتے ہیں کہ پیچھے پیچھے دو ایک گماشتے
ستہ اور تختی اٹھائے چلے آ رہے ہیں۔ مدرسہ ختم ہونے سے پہلے ہی گماشتوں کا یہ دستہ صاحبزادے کی ہم رکابی کے لیے
ر آموجود ہوتا ہے۔ جو معاشرہ اس قسم کی ناقابل عبور ٹکڑیوں میں کٹ کر رہ جائے گا اس کے بودے پن میں اور کیا کسر

باقی رہ جاتی ہے! یہ اسی حقیقت کا احساس تھا جس نے فاروق اعظم رضؓ کو شدت کے ساتھ یہ مطالبہ کرنے پر مجبور کیا تھا کہ عمال حکومت خواہ وہ کتنے ہی اونچے عہدے پر فائز کیوں نہ ہوں لباس کے معاملے میں بے حد سادگی اختیار کریں۔

غرض یونی فارم طلبہ میں پسندیدہ اخلاق و اطوار پیدا کرنے اور قومی یک جہتی حاصل کرنے کی سمت میں ایک نہایت اہم قدم ہے۔ اس اعتبار سے اس کی تعلیمی اہمیت اتنی ہی بڑی ہے جتنی درسی کتابوں کی۔ پاکستان جیسے نوزائیدہ ملک کے لیے جہاں متعدد لسانی اور نسلی گروہ موجود ہیں اور جہاں سب سے پہلی ملکی ضرورت ان تنگ نظریوں کو پھلانگ کر ایک مستحکم قومی شعور پیدا کرنا ہے، مدرسوں میں یونی فارم کا نفاذ تعلیمی افادیت کے علاوہ ایک اہم قومی افادیت بھی رکھتا ہے۔

خاتمہ کلام

ہمارے ملک میں یونی فارم کا تجربہ ابھی نیا نیا ہے۔ سابق صوبہ پنجاب کے مدرسوں میں سے کئی ایک نے اسے کئی سال بھر سے نافذ کر رکھا ہے۔ مجوزہ یونی فارم عموماً پائدار اور کم قیمت قسم کے کپڑے سے تیار ہو سکتی ہے۔ مثلاً ایک پرائمری مدرسے نے اپنے بچوں کے لیے ملیشیا کا پاجامہ اور سفید قمیص تجویز کر رکھی ہے۔ جب کہ اس کے پڑوسی ہائی اسکول نے ملیشیا کی قمیص اور سفید پاجامہ تجویز کیا ہوا ہے۔ پچھلے سال یوم آزادی کے جلوس میں راقم نے ان بچوں کو پہلی بار یونی فارم میں ملبوس دیکھا۔ یہ لباس ہم آہنگی اور یکسانیت کی جو حسین تصویر پیش کر رہا تھا وہ صرف دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی تھی۔

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ سابق صوبہ پنجاب کے مدرسوں کے لیے جو یونی فارم تجویز کی گئی تھی اسے صحیح معنوں میں یونی فارم کا نام دینا قدرے دشوار ہے کیوں کہ ہر مدرسے کے سامنے کئی قسم کے متبادل لباس پیش کر دیے گئے تھے جن میں سے وہ اپنے لیے کوئی مخصوص جوڑا پسند کر سکتا تھا۔ اس سے ایک مدرسے میں یک رنگی پیدا ضرور ہو سکتی ہے اور لباس کی اونچ نیچ کا سوال بھی ختم ہو جاتا ہے، مگر ملکی سطح پر یک رنگی کا نصب العین حاصل نہیں ہوتا۔ اس سے بہتر فیصلہ سابق صوبہ سرحد کی وزارت تعلیم کا تھا جس نے صوبہ بھر کے مدرسوں کے لیے ملیشیا کی قمیص اور شلوار بطور یونی فارم مقرر کی تھی۔

لباس ہر شخص کی طرح بچوں کی شخصیت پر بھی ایک ناقابل انکار اثر ڈالتا ہے۔ نشو و نما کے مخصوص زمانے میں جب ایک چھوٹی سی چیز بھی شخصیت پر ایک باقی رہنے والا اثر چھوڑ سکتی ہے۔ یہ امر تعلیمی طور پر بے حد اہم ہے کہ لباس کے مسئلہ کا ایک شافی حل ڈھونڈا جائے تجرباتی شہادت نے ثابت کیا ہے کہ اس اہم مسئلہ کا یونی فارم سے بہتر اور کوئی حل نہیں ہے۔

حرفتی تعلیم

محمد عبدالعزیز

پس منظر

صنعتی ترقی اور حرفتی فروغ مغرب کا دوسرا استعماری ہتھیار ہے جس کی تباہ کاری سامراجی تاراج سے کسی طرح کم نہیں۔ ایشیائی قوموں نے بظاہر مغرب کی سیاسی اور انتظامی اجارہ داری کا طلسم توڑ دیا ہے، لیکن اس کے حرفتی جادو کا ہنوز منتر تلاش نہیں کرسکیں یہی وجہ ہے کہ روس، برطانیہ حتیٰ کہ تباہ شدہ جرمنی کی حرفتی تجارت آج بھی مسلم ہے۔ مغرب کی اس صنعتی سیادت کا سبب علوم طبعی کی ترقی و توسیع ہے جو اتنی تیز اور اتنی سریع ہے کہ پہلی عالمگیر لڑائی میں جو ہتھیار جدید سمجھے جاتے تھے دوسری عالمگیر لڑائی نے اس پر قدامت کی مہر لگادی اور ایک ایسے تباہ کن ہتھیار کی تخلیق کی جس سے نسل انسانی کو آن واحد میں تباہ کیا جاسکتا ہے۔ اس سے میری مراد ایٹم بم اور اس کی تباہ کاریاں ہیں۔ اب کہ جنگ ختم ہوچکی ہے اور قرائن سے اس کی تجدید کے امکانات بھی کم نظر آتے ہیں۔ ایٹم بم کے خالقوں نے ایٹم برائے امن کے متعلق بھی سوچنا شروع کردیا ہے، اگرچہ اس کے ساتھ ساتھ حفظ امن کے نام پر ہائیڈروجن بم کے تجربے بھی ہوتے رہتے ہیں۔ حرفتی ترقی کا یہ ایک تباہ کن پہلو ہے جس پر نسل انسانی کی بقا کے لیے ایک حد قائم کی جاسکتی ہے۔ کیونکہ جو طاقت ہیروشیما اور ناگاساکی پر بم گراکر انسانی تباہی کا موجب ہوسکتی ہے وہی نقیب امن بن کر ان زخموں کے لیے مرہم بھی مہیا کرسکتی ہے۔

حرفتی ترقی دور حاضر کے لیے ایک چیلنج ہے جس کا انسان کی تمدنی، اقتصادی اور تعلیمی زندگی سے براہ راست تعلق ہے۔ یہ حرفتی ترقی اگرچہ مغرب کے جہد مسلسل کی رہین منت ہے جو صدیوں کی شکست و ریخت عمل اور ردعمل، تجربے اور تجزیے کے بعد نئی نئی راہیں نکالنے میں کامیاب ہوسکی ہے۔ لیکن اس کی برکات سے مشرق بھی اتنا ہی متمتع ہو رہا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ مغرب کے طیارے کے بال و پر خود

اس کے سامنے ہیں اور ہم اس سے یہی بات پر استفادہ لیتے ہیں، چوں کہ حرفتی ترقی کا قوموں کی اقتصادی، تمدنی اور سیاسی بلکہ تعلیمی زندگی سے گہرا تعلق ہے، اس لیے جو قومیں اس لحاظ سے ترقی یافتہ کہلاتی ہیں ان کے صنعتی اور تعلیمی نظام کے مطالعے سے ہم بھی بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ ان ترقی یافتہ قوموں میں روس، برطانیہ، امریکہ اور جاپان بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ روس اور امریکہ اس لیے کہ صنعتی فروغ کے ساتھ ساتھ سیاسی اور اقتصادی غلبہ دونوں کا مقصد ہے۔ برطانیہ اس لیے کہ دو سو برس کی تجارتی اجارہ داری کے بعد اسے نئی ابھرتی ہوئی قوموں کی تیار کردہ مصنوعات سے مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے اور جاپان اس لیے کہ شکست و مابعد شکست کی صعوبتوں کے باوجود اس نے اپنی تجارتی ساکھ کو دوبارہ قائم کر لیا ہے۔ مغربی جرمنی بھی اگرچہ اس لحاظ سے جاپان کے دوش بدوش ہے لیکن سیاسی اور جغرافیائی لحاظ سے اس کی حیثیت قدرے مختلف ہے۔

روس نے حال ہی میں اپنی حرفتی ترقی کے پانچ سالہ منصوبے کا اعلان کیا ہے۔ یہ منصوبہ اشتراکی روس کے لیے کوئی نیا منصوبہ نہیں۔ اس قسم کے منصوبے ۱۹۲۸ء سے مسلسل روس کی معاشی اور اقتصادی زندگی کی اساس بن چکے ہیں۔ لیکن موجودہ منصوبے کو وقت کے سیاسی رجحانات کے پیش نظر مختلف زاویوں سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ممکن ہے روس میں اس کی اہمیت خالص اقتصادی ہو لیکن مغرب اسے روس کے عزائم اقتدار کا نیا حربہ سمجھتا ہے۔ دنیا کی سیاسی اور اقتصادی بساط پر روس کی یہ چالیں مغربی استعماری نظام کی بقا کے لیے مہلک سمجھی جاتی ہیں۔ ایک مغربی مبصر سیاست کے الفاظ میں یہ روس کا وہ حربہ ہے جو اس نے مغرب سے سیکھا ہے اور اس کی ضرب حملۂ ترکمانہ سے کہیں شدید ہوگی۔"

سیاسی اور اقتصادی جنگ

اس وقت دنیا دو اقتصادی گروہوں میں تقسیم ہو چکی ہے۔ ایک طرف امریکہ اور اس کا نظام سرمایہ داری۔ دوسری طرف روس اور اس کی اشتراکیت۔ ایک بزعم خود آزاد دنیا کہلاتا ہے، اس میں امریکہ اور اس کے متوسلین شامل ہیں۔ اس نام نہاد آزاد دنیا میں بسنے والے اشتراکی روس اور اس کے زیر اثر ممالک کو پردۂ آہن کہتے ہیں۔ ان دونوں گروہوں کی کش مکش اگرچہ اقتصادی ہے لیکن اقتصادی اقتدار سیاسی غلبے کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ جغرافیائی لحاظ سے روس کو مغرب پر ایک ایسی فوقیت حاصل ہے جس کی وجہ سے نہ تو اسے کسی عسکری میثاق کی ضرورت ہے اور نہ کسی عمرانی معاہدے کی احتیاج۔ بحر الکاہل سے بحیرۂ بالٹک تک اس کا سیاسی

اور اقتصادی تسلط ہے۔ ایک تمدن، ایک نظام، ایک معاشرت، ایک بولی اور ایک قیادت۔ لیکن اس کے برعکس مغربی اتحادی مختلف نسلی اور گروہی عقائد کا مجموعہ ہیں۔ اس میں برطانیہ کی ملوکیت، فرانس کی استعماریت اور امریکہ کی جمہوریت کو ایک ترکیب خاص سے یکجا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ مگر چوں کہ نظری اور فکری اعتبار سے ان دونوں گروہوں میں ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکتی، اس لیے ان میں سے ایک کے انفرادی اقدام سے دوسرے کے نام نہاد قومی پندار کو ٹھیس لگنے کا ہمیشہ اندیشہ رہتا ہے۔ مشرق وسطیٰ میں یہ دور انگریزی اقتدار کا دم واپسیں ہے۔ قبرص (CYPRUS) میں اس کی سیادت کا سلسلہ ٹوٹ چکا ہے۔ المغرب میں فرانس اپنے پرپرزے درست کر کے مسلمانوں کو آخری اور قطعی شکست دینے کا سامان کر چکا ہو مگر بظاہر بے کس اور مفلس مسلمان، علم بردارانِ تمدن کی ان فوجی تباہ کاریوں کے باوجود، تحریکِ آزادی سے دست کش ہوتا نظر نہیں آتا۔ جمہوریت کا مدعی امریکہ اس وقت انتخابات کی کشمکش میں مبتلا ہے، اس لیے فی الحال بنی اسرائیل کی براہ راست اعانت سے کسی قدر گریزاں معلوم ہوتا ہے۔ لیکن مغربی اتحادیوں کے یہ تینوں گروہ حصول اقتدار کے اتنے ہی خواہاں ہیں، جتنا وہ اس سلسلے میں روس کو مطعون کرتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ مغرب والوں کے عزائم اور طریق کار جدا جدا ہیں۔ لیکن روس کے عزائم اور طریق کار میں مطابقت ہے۔

اس جنگ زرگری میں کم ترقی یافتہ قوموں کی کیا حیثیت ہے۔ آیا انہیں امریکہ سے اپنی تقدیر کا وابستہ کر لینا زیادہ مفید ہے یا روس کے دامن میں پناہ لینے سے انہیں دائمی سکون حاصل ہو سکتا ہے۔ امریکہ آزادی کا علم بردار ہے اور روس بھی آزادی کا مدعی۔ امریکہ بھی کم زوروں کے لیے حوصلہ، امداد دینے کا اعلان کرتا ہے اور روس بھی گرتوں کے تھامنے کا حامی ہے۔ لیکن اگر ان دونوں کے عزائم کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو دوسروں کو آزادی کے تحفظ و بقا کا ان میں سے ایک بھی ضامن نہیں اور یہ ایک غلط تصور ہے کہ اپنی گاڑھی کمائی اور اپنی تمام تر توجہات ایک قوم، دوسری قوم کی فلاح و بہبود پر مرکوز کر دے۔ پچھلے دنوں ایک امریکی معمر خاتون برطانیہ کے اقتصادی نظام کے مطالعے کے لیے لندن تشریف لائیں۔ ان سے میری ملاقات یونی ورسٹی لائبریری ریکلٹری میں ہوئی۔ مشرق وسطیٰ اور پاکستان کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ دوران گفتگو میں موصوفہ نے فرمایا کہ امریکہ ہر سال اتنی رقم دوسری قوموں کو کچھ زیادہ دنوں تک نہیں دے سکتا۔ میں اسے ایک فرد کی گفتگو نہیں سمجھتا بلکہ اسے اس قوم کے پڑھے لکھے لوگوں کا نظریہ سمجھتا ہوں۔

یو۔ایس۔اے

حرفتی ترقی اس دور میں، آزادی اور دفاع کی خشتِ اول ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی یافتہ قومیں

اس معاملے میں دو ذہن ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانا چاہتے ہیں۔ صنعتی لحاظ سے اس وقت امریکہ، برطانیہ، فرانس یا کینیڈا سے بہت آگے جا چکا ہے۔ اس کی ایک وجہ اس کے وسائل کا ایک جا ہونا بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن ان اسباب سے قطع نظر موجودہ یورپ کے لیے ان بڑا کاروں کی تخلیق و تعمیر سے جو اہم آزاد خیالی کی وجہ سے یورپ کے گھٹے ہوئے سیاسی اور دینی ماحول کے باغی سمجھے جاتے تھے اور جنھیں انھیں حالات میں اپنے اس جرم کی پاداش میں ترک وطن پر مجبور ہونا پڑا۔ یہ لوگ جب امریکہ پہنچے تو ان کے سامنے علم و فن اور آزاد خیالی کا وہ ماحول تھا جو امریکہ منتقل ہو گیا جس کا یورپ کے ماحول میں کوئی مقام نہ تھا۔ اور لوگ آگے جس نظام کی بنیاد ڈالی اور ترقی کی وہ چلایا۔ اس کے اثرات آج امریکی زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں ہیں۔

امریکہ کی اس ترقی کی وجہ ہمارا اس کی مرفہ الحالی ہے۔ یعنی مختلف فنون کے ماہروں کی تعلیم و تربیت جو اسے مزید ترقی دے سکیں اسے آگے لے جائیں جس منزل پر انھوں نے اسے پایا ہے۔ یہ موجودہ صنعتی ترقی حادثاتی یا اتفاقی نہیں بلکہ ایک سوچی سمجھی منصوبہ بندی کا نتیجہ ہے۔ امریکہ کے ثانوی اور اعلیٰ اداروں میں صنعت و حرفت، تجارت، اور اقتصادیات کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی ہے تاکہ ہر طالب علم اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق اپنے لیے ایک پیشہ تجویز کرے اور پھر اس میں مہارت پیدا کرنے کی کوشش کرے کیونکہ صنعتی فروغ کے واسطے جارحانہ تحقیق اتنی ہی ضروری ہے جیسے انسانی زندگی کے لیے۔ صنعتی کارخانہ کوئی تصوراتی نظریہ نہیں بلکہ ایک جامع اور ٹھوس حقیقت ہے جس کی اساس اگرچہ تمام تر میکانکی ہے لیکن اس کی تخلیق انسانی ذہن اور اس کے ہنرمند کاریگروں کی مرہون منت ہے۔ ایک کارخانے کے چلانے کے لیے خام پیداوار، بجلی اور مشینوں کی ضرورت ہوتی ہے لیکن خام پیداوار، بجلی اور مشین بجائے خود علاحدہ علاحدہ یا مل کر کوئی چیز تیار نہیں کر سکتیں۔ ان سے کام لینے کے لیے انسان کی ضرورت ہوتی ہے جو بجا طور سے مشینوں کو حرکت میں لاتا ہے اور خام اشیا سے خوب صورت مصنوعات تیار کرتا ہے۔ کام کی نوعیت کے لحاظ سے کارخانے کے ہر شعبے میں اپنا اپنا کام کرنے کے لیے ایسے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے جو معمولی تربیت کے بعد اس میکانکی سسٹم کو اچھی طرح انجام دے سکیں۔ مثلاً ایک مشین پر کام کرنے والے کے لیے وقت کی پابندی اور ایک میکانکی کام ہے۔ جس کے لیے کسی ماہر کی ضرورت نہیں۔ اسے معمولی تربیت کے بعد ایک ان پڑھ آدمی بھی کر سکتا ہے۔ لیکن اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کی ملازمت سے کیا فائدہ ہے۔ اس کے لیے تکنیکی معلومات کے ساتھ ساتھ عملی تجربہ اور دستی مہارت بھی ضروری ہے۔ اگر کارخانے کے کارکنوں میں یہ ہنر موجود نہ ہو تو شاید زیادہ سے زیادہ اس کے ساتھ اور اتنی مقدار میں تیار نہ ہو سکے۔ اب اس طرح

جو مصنوعات تیار ہوں گی خواہ وہ دیو قامت مشینیں ہوں یا گھڑی کے ننھے ننھے پرزے۔ ان کے لیے بھی ماہروں اور صنعتوں کی ضرورت ہو گی جو اپنے مخصوص احاطۂ کار میں نئی نئی راہیں نکال سکیں، اس طرح مصنوعات کے تیار کرنے اور ان کے فروخت کرنے تک مختلف قسم کی پیشہ ورانہ مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر یہ مصنوعات دنیا کے مسابقتی بازار میں جاذبِ توجہ نہ بن سکیں تو حرفتی ترقی کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ اسی نکتے کے پیش نظر امریکہ نے اپنے تعلیمی نظام میں ایسا انداز پیدا کر لیا ہے کہ اس میں ایسے کاریگر اور صنعت کار بھی پیدا ہو سکیں جو آنے والے عصر کے حرفتی چیلنج کا جواب دے سکیں اور اس میں ایسے انتظام کار بھی پیدا ہو سکیں جو وقت کے رجحانات کو دیکھتے ہوئے اپنے صنعتی نظام میں ترمیم و اضافہ کرتے رہیں۔ چنانچہ آج یو۔ ایس۔ اے اپنی اسی حرفتی برتری کی بدولت صرف اپنی ہی ضروریات کا کفیل نہیں ہے۔ بلکہ اپنی مصنوعات سے دوسروں کو متمتع کر رہا ہے۔

امریکہ کی صنعتی ترقی میں اس کے مدرسوں اور بڑی بڑی درسگاہوں کا جو ہاتھ رہا ہے اس پر یہ قوم بجا طور پر فخر کر سکتی ہے اس دور میں صنعت و حرفت نے انسان کی معاشرتی زندگی کو اس حد تک متاثر کیا ہے کہ ریڈیو، ٹیلیفون، موٹر، ریل گاڑی اور جہاز اس کی ہستی اور وجود کا ایک جزو بن چکے ہیں۔ لیکن آج دنیا اس پر قانع نہیں معلوم ہوتی بلکہ مزید سہولتیں بہم پہنچانے کے لیے جدوجہد کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ ایٹمی سائنس کی تفصیل کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ امریکہ اپنی تمام تر کوششیں ایٹمی طاقت کی مزید تحقیق و تدقیق میں صرف کر رہا ہے۔ اس طرح اسے آج جو مادی سہولتیں میسر ہیں ان کا دنیا کی بعض قومیں تصور بھی نہیں کر سکتیں۔

دنیا کی سیاسی اور اقتصادی زندگی پر امریکہ کی حرفتی ترقی کا نمایاں اثر ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ روس کے اقتصادی نظام کی چھاپ بھی ایسی گہری ہے کہ اس کے رنگ و روغن کو دیکھ کر بعض اوقات مغرب کے زعمائے سیاست اور حرفتی اجارہ دار بھی گھبرا جاتے ہیں۔ یہاں اس سے بحث نہیں کہ دونوں کے اقتصادی نظام میں کون بہتر ہے اور کون خراب ہے۔ کون انسان کی روزمرہ ضروریات کے پورا کرنے میں پیش پیش ہے اور کون انسان کی نفسیاتی کمزوریوں کو [illegible] کر کے اپنی مصنوعات کے لیے نئی نئی منڈیاں تلاش کرتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ روس نے کس طرح اور کیوں کر اپنے نظام اقتصادیات میں حرفتی فروغ کا اہتمام کیا۔ آیا اس کی یہ ترقی امریکی یا دوسرے مغربی نظاموں کے تابع ہے یا اس نظام میں کوئی نیا جذبہ اور نیا طریق کار ہے جو ایک مختصر سی مدت میں روس کو دنیا کی ایک بہت بڑی طاقت بنا دیتا ہے۔

روس روس میں صنعتی تعلیم کی پرانی روایات کا ایک طویل سلسلہ ہے جو قدیم و جدید کو ایک رشتے میں منسلک کر دیتا ہے۔ بیسویں صدی میں اس کے اعلیٰ حرفتی مدارس میں جو طریق تعلیم رائج تھا اور ان اداروں میں کاریگروں اور فن کاروں کی جس

عنوان سے تربیت کی جاتی تھی اس کا اثر صرف یورپ ہی پر نہیں پڑا بلکہ امریکہ نے بھی اس نظام کی تقلید کی۔ یہ روسی نظام انیسویں صدی کے آخر تک امریکی صنعتی اداروں کے لیے چراغ راہ کا کام کرتا رہا۔ ۱۹۰۵ء سے روس میں صنعتی انقلاب کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔ لیکن پہلی عالمگیر لڑائی اور اشتراکی انقلاب کی وجہ سے اس کی رفتار قدرے سست ہو گئی۔ ۱۹۲۸ء میں اشتراکی روس نے از سر نو صنعت و حرفت کو فروغ دینے کے لیے صنعتی ترقی کا پانچ سالہ منصوبہ پیش کیا۔ اس منصوبے کا اہم ترین پہلو صنعتی مدارس کی تعمیر نو اور کاریگروں اور صنعت کاروں کی تعلیم و تربیت کا نیا پروگرام تھا۔ صنعت و حرفت کی ترقی میں اگرچہ سرمایے کا ایک اہم مقام ہے۔ لیکن اس کے فروغ کے لیے تعلیمی منصوبہ بندی اتنی ہی ضروری ہے۔ روس نے اپنے اس پہلے منصوبے میں صنعتی تعلیم کی طرف سب سے زیادہ توجہ دی جس کی بدولت بیس سال کی مختصر سی مدت میں روس دنیا کا ایک اہم ترین صنعتی ملک بن گیا۔ اب اس کی اقتصادیات کا دارومدار زرعی پیداوار پر نہ رہا۔ بلکہ اس کی ان مصنوعات پر ہو گیا جو اس کے کارخانوں میں تیار ہونے لگیں۔ اگر روس اس برق رفتاری سے صنعتی ترقی کی طرف توجہ نہ دیتا تو دوسری عالمگیر لڑائی میں وہ جرمنی جیسی ترقی یافتہ قوم کا مقابلہ نہ کر سکتا۔

روس کی اس صنعتی ترقی کے ظاہر دو سبب تھے۔ زار کے عہد حکومت میں روس کے صنعتی مراکز، یا ماسکو میں تھے یا ماسکو کے نواح میں۔ لیکن اشتراکی روس نے اس محدود مرکزیت کو توڑ کر مختلف علاقوں میں کارخانے اور صنعتی مدرسے کھولے۔ ما قبل انقلاب روسی ترکستان اور سائبیریا میں کوئی کارخانہ یا کوئی صنعتی ادارہ نہ تھا۔ لیکن مابعد انقلاب ان علاقوں میں بھی نئے نئے تعلیمی ادارے اور نئے نئے کارخانے کھلنے لگے۔ ۱۹۲۸ء کے بعد روس نے جس سرعت رفتار سے ترقی کی ہے اس کا اندازہ صنعتی مدارس کی بڑھتی ہوئی رفتار سے کیا جا سکتا ہے۔ ۱۹۲۸ء میں ثانوی مدارس کی مجموعی تعداد نو لاکھ اور مابعد ابتدائی صنعتی مدارس کی تعداد چار لاکھ تھی ۱۹۳۱ء میں یہی تعداد علی الترتیب چار لاکھ اور گیارہ لاکھ ہو گئی۔ اس طرح عام ثانوی مدارس کی تعداد پانچ لاکھ کم ہو گئی اور صنعتی مدارس کی تعداد میں سات لاکھ کا اضافہ ہو گیا۔ لیکن جب یہ ہنگامی حالات معمول پر آ گئے تو ثانوی مدارس کی تعداد میں بھی حسب ضرورت اضافہ ہونے لگا۔ روس کی اس حیرت انگیز کامیابی کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس کا تمام تر نظام تعلیم مرکزی ہے۔ حکومت ضرورت کے مطابق اسے جس سانچے میں چاہے ڈھال سکتی ہے۔ روس کی مختلف صنعتیں بھی حکومت کی ملک ہیں۔ اس لیے صنعتی ضروریات کے مطابق نظام تعلیم کے تبدیل کرنے میں بھی کوئی قباحت نہیں ہوتی۔ اگر تعلیم اور ملک کی صنعتوں پر حکومت اس طرح حاوی نہ ہو تو دونوں میں اس قسم کی ہم آہنگی کا پیدا کرنا مشکل ہی نا ممکن تھا۔

دوسری عالمگیر لڑائی میں اگرچہ برطانیہ، امریکہ اور فرانس کو بھی نقصان پہونچا۔ لیکن روس تو خود میدان کارزار تھا اس کی گلیوں اور کوچوں میں بھی جنگ ہوئی۔ چناں چہ اس لڑائی میں جو نقصان براہ راست روس اور جرمنی کو پہونچا یورپ کی دوسری قومیں اس سے محفوظ ہیں۔ اختتام جنگ کے بعد سب سے اہم کام تعمیر نو کا تھا۔ گویا یہ زمانہ روس کے لیے پھر ۱۹۲۶ء جیسا ہنگامی زمانہ تھا۔ برباد شدہ عمارتوں، کارخانوں اور تعلیم گاہوں کا از سر نو تعمیر کرنا اتنا آسان نہ تھا۔ لیکن جو قومیں عزم و حوصلے سے کام لینا جانتی ہیں ان کے لیے یہ کام اتنا مشکل بھی نہیں ہوتا۔ وہ اپنے وسائل و ذرائع کے مطابق اپنی اصلاح کر لیتی ہیں۔ روس کے ارباب اختیار نے رفتہ رفتہ ۱۹۴۵ء سے اس وقت تک صرف یہی نہیں کہ برباد شدہ عمارتوں اور کارخانوں کو درست کیا بلکہ ضرورت کے مطابق نئے کارخانے اور نئے ادارے بھی کھولے حتیٰ کہ اس کے حالیہ پانچ سالہ منصوبے نے مغرب کے مبصرین سیاست کو بھی چونکا دیا۔ اس منصوبے کی تکمیل کے بعد روس دوسرے صنعتی ملکوں کا معیار و مقدار دونوں میں مقابلہ کر سکے گا۔ اگر یہ مسابقت صرف مصنوعات کی مسابقت ہوتی تو اہل مغرب شاید اس قدر پریشان نہ ہوتے لیکن انہیں یقین ہے کہ روس کا اس مقدار میں انجینیر پیدا کرنا ان کے لیے ایک مسلسل خطرہ ہے کیوں کہ یہ روسی ہر غیر ترقی یافتہ ملکوں میں جا کر روسی اقتدار قائم کرنے کی کوشش کریں گے۔ روس کی اس حرفتی برتری کا اندازہ حسب ذیل خاکے سے بخوبی ہو سکے گا۔

حرفتی ماہروں کی تعداد کا موازنہ

نمبر شمار	ملک	آبادی	تعداد حرفتی ماہر	
۱	برطانیہ	ہر دس لاکھ میں	۵۷	۲۷۹ کل
۲	امریکہ	"	۱۳۶	
۳	مغربی جرمنی	"	۸۶	
۴	روس	"	۲۸۰	

ان اعداد و شمار سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس وقت روس، امریکہ، برطانیہ اور جرمنی کی مجموعی تعداد سے زیادہ حرفتی ماہر پیدا کر رہا ہے۔ اور یہ تعداد موجودہ پانچ سالہ منصوبے میں کم و بیش دوگنا ہو جائے گی۔ اسی طرح مصنوعات کی موجودہ رفتار پیداوار دوگنا ہو سکے گا۔ اور بعض حالات میں دس گنا ہو جائے گی جس میں بھاری مشینیں، ہوائی جہاز اور دوسرے سامان حرب شامل ہیں۔ برطانیہ حکومت روس کے اس اعلان کے بعد مغربی طاقتوں میں برطانیہ کی سب سے پہلے اپنی بے بضاعتی کا احساس

بنے کو تو برطانیہ صنعتی انقلاب کا علم بردار سب اور اس میں شک نہیں۔ یہی نہیں کہ موجودہ صنعتی ترقی بعض برطانوی ایجادات کی منت ہے لیکن یہ یاد کرنا کچھ اور ہے۔ صنعت و حرفت کی اس مسابقتی دوڑ میں برطانیہ کا اگرچہ کسی مغربی ملک سے کچھ نہیں لیکن بعض تاریخی حادثات نے برطانیہ کو زیادہ مستحکم اور مضبوط بنا دیا۔ اس کی امریکی، افریقی اور ایشیائی مستعمرات تو اتنا وسیع تھا کہ اسے اپنی مصنوعات کے لیے کسی منڈی کی ضرورت نہ رہی۔ جرمنی، جاپان یا روس صنعتی اعتبار سے بڑھ ہی کیوں نہ ہوں لیکن وہ تجارت میں برطانوی مال کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ دوسری عالمگیر لڑائی نے دنیا کا نقشہ بدل برطانوی مستعمرات کا ایک بڑا حصہ آزاد ہو چکا ہے اور جہاں ہنوز نہیں ہوا ہونے والا ہے۔ اس کا اثر و اقتدار رفتہ رفتہ ختم ہو رہا ہے۔ ایشیا میں ملایا، سنگاپور اس سلسلہ کی آخری کڑی ہیں جو غالباً مستقبل قریب میں آزاد ہو جائیں گے۔ شمالی افریقہ عرب ممالک میں بھی اس کی سیادت کا معراج ختم ہو رہا ہے۔ ان حالات میں برطانیہ کا چوکنا ہونا بدیہی اور لازمی تھا۔ اس وقت نظام تعلیم اس ملک میں رائج ہے وہ مستعمراتی ضروریات کو تو پورا کر سکتا ہے لیکن روس یا جرمنی کی صنعتی ترقی کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس کا اعلانیہ برطانیہ کے لیے مہیب ثابت ہوا اور اپنی قومی بقا کی خاطر اس کی نئی حکومت نے پانچ سالہ صنعتی تعلیم کے منصوبے کا اعلان کیا۔ اس منصوبے کی تکمیل پر حکومت دس کروڑ پونڈ خرچ کرے گی۔ اس رقم سے چند نئے ادارے تعمیر ہوں گے اور بعض پرانے اداروں کی توسیع کی جائے گی۔

قانون تعلیم مجریہ ۱۹۴۴ء سے پہلے برطانیہ میں حرفتی تعلیم کو سرکاری ذمہ داری تسلیم نہیں کیا جاتا تھا۔ اس لیے بالعموم لوگ دو گروہوں میں تقسیم تھے، ایک وہ جو اسے کارخانہ داروں کا فرض تصور کرتے تھے۔ اس کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو چیز روس اور جرمنی نے اس صدی کے ربع اول میں حاصل کر لی، برطانیہ اس کی طرف اس کے ربع ثالث میں متوجہ ہو رہا ہے۔ اس تاخیر کے تین سبب ہیں۔ اول یہ کہ دوسری عالمگیر لڑائی سے پہلے برطانیہ دنیا کی بہت بڑی طاقت تھا۔ اس لیے اسے حرفتی ماہروں سے زیادہ مستعمراتی انتظام کاروں کی ضرورت تھی۔ دوسرا سبب یہ کہ برطانیہ کا کسی دوسرے ملک سے حرفتی مقابلہ نہ تھا۔ اس کے کارخانوں میں جو مصنوعات تیار ہوتی تھیں انہیں ہندوستان، ایشیا اور غیر متمدن افریقہ خرید ہی لیتے۔ تیسرا سبب یہ کہ انگریزی کارخانے قومی ملکیت نہیں بلکہ سرمایہ داروں کی ذاتی املاک ہیں۔ اس لیے اگر صنعتی تعلیم کو فروغ دینے کا مسئلہ پیش ہوتا تو کنزرویٹو اس کی اس بنیاد پر مخالفت کرتی کہ یہ کام ان کارخانہ داروں کا ہے جو اس تعلیم سے فائدہ اٹھائیں گے۔ حکومت کا اس سے براہ راست کوئی تعلق نہیں پھر آخر قوم کی دولت حرفتی تعلیم پر کیوں صرف کی جائے۔ اس سلسلے میں حکومت نے ۱۹۴۳ء میں ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کیا۔

اس کمیشن نے لارڈ پرسی (PERCY) کی زیرِ صدارت بڑی تن دہی سے کام کیا۔ کمیشن نے ۱۹۴۵ء میں اپنی سفارشات پیش کیں۔ لیکن مابعد جنگ کی لیبر یا کنسرویٹو حکومتوں نے ان سفارشات کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی۔ اب جبکہ روس اس تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے تو برطانیہ کے اربابِ اقتدار کو صنعتی تعلیم کے فروغ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چناں چہ اس موجودہ منصوبے کی تخلیق خالص اقتصادی نہیں بلکہ ایک حد تک سیاسی بھی ہے۔

”ہم اس وقت جنگ کر رہے ہیں، اگرچہ بعض اوقات یہ سرد اور بے خون معلوم ہوتی ہے لیکن پھر بھی یہ جنگ ہے۔ جو لڑائی نظریاتی تنازعہ سے شروع ہوئی آج وہ بہت بڑی اقتصادی جنگ بن چکی ہے۔“

(ٹائمز ایجوکیشنل سپلی منٹ ۲۷ جنوری)

یہ جنگ جسے صاحب ٹائمز نظریاتی تنازع سے تعبیر کرتا ہے، دراصل نظریاتی جنگ نہ تھی، اقتدار کی جنگ تھی، جو ہنوز جاری ہے۔ اگر روس اب حرفتی فروغ کو حصولِ اقتدار کا وسیلہ بنا رہا ہے تو امریکہ اور برطانیہ اس پر پہلے ہی سے عامل ہیں۔ مغربی سیاست دانوں کی یہ تنقید کہ روس کی یہ چالیں اشتراکی نظامِ حیات کی توسیع کا ایک بہانہ ہیں۔ درست ہوگا لیکن یہ کہنا کہ روس کی نیت تو خراب ہے لیکن مغرب صاف دل اور پاک نہاد ہے اور وہ جو کچھ کرتا ہے خلق اللہ کی امداد کے لیے کرتا ہے کذب و افترا ہے نیت دونوں کی بخیر نہیں۔

بہ ہر صورت برطانیہ کو ”وقت کے فرمان“ کے آگے سر جھکانا پڑا۔ چناں چہ اب وہ پبلک اسکولوں اور گرامر اسکولوں کی ٹنگ ٹائے سے نکل کر حرفتی تعلیم کی تعمیر و توسیع پر اپنی ساری قوت صرف کر رہا ہے۔ سر ڈیوڈ ایکلز نے حرفتی تعلیم کے پانچ سالہ منصوبے کا ان الفاظ میں اعلان کیا۔

”یہ پروگرام ہر قسم کی تخفیف، تاخیر اور التوا سے مستثنیٰ ہوگا کیوں کہ حکومت یہ محسوس کرتی ہے کہ یہ ہماری اقتصادی فلاح کی اساس ہے“ (ٹائمز یکم مارچ ۵۶ء)

برطانیہ کے اربابِ اقتدار نے اب یہ محسوس کر لیا ہے کہ اگر وہ بہ حیثیت ایک قوم زندہ رہنا چاہتے ہیں تو ان کے لیے یہی راستہ ہے کہ اپنی صنعتوں کو توانا بنائے جائیں کہ روس، جرمنی، جاپان اور چین کا ہر بازار اور ہر منڈی میں مقابلہ کیا جا سکے۔ ظاہر ہے کہ گاہک وہی سودا خریدے گا جو زیادہ خوب صورت، دیدہ زیب اور مضبوط ہو، اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک دقیانوسی نظامِ تعلیم کو سرے سے بدلنے کی کوشش نہ کی جائے۔ گرامر اسکول اور پبلک اسکول اپنا کام انجام دے چکے۔ اب

ان کے پاس کوئی ایسا پروگرام نہیں کہ یہ قوم کو موجودہ اقتصادی بحران سے بچا سکیں۔ اس اقتصادی تعطل کے دور کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ صنعتی تعلیم کی از سر نو تنظیم کی جائے۔ سر ونسٹن چرچل نے اپنی ایک حالیہ تقریر میں اس کی یوں وضاحت کی ہے۔

> "وزارت معارف نے اب تک یونیورسٹیوں پر اعتماد کیا اور اس میں شک نہیں کہ انھوں نے اپنے تئیں بہت کچھ کیا۔ لیکن دوسروں کے دوش بدوش چلنے سے قطع نظر اگر ہم دنیا میں اپنی مناسب جگہ قائم رکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں فوراً ہی بہت بڑے بڑے حرفتی مدارس کھول کر اس میں پوری زندگی اور توانائی سے نفوذ کرنا چاہیے"۔
>
> (چرچل)

دنیا کی سیاسی اور اقتصادی تعطل نے برطانیہ کو اپنا مزاج بدلنے پر مجبور کر دیا اور وہ بڑی تیزی کے ساتھ اپنا مزاج بدلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ایسی قومیں جو وقت کی نبض کو ٹٹولنا جانتی ہے، ان کا نابود ہو جانا ممکن نہیں۔ چناں چہ برطانیہ اپنے موجودہ سیاسی زوال اور اپنی موجودہ اقتصادی بدحالی کے باوجود زندہ رہنے کا ساز و سامان پیدا کرے گا۔

روس اور برطانیہ روس اور برطانیہ دونوں کا مقصد اپنی صنعتوں کو فروغ دینا اور دنیا میں اپنا سیاسی اور اقتصادی وقار قائم کرنا ہے۔ روس کی رفتار زیادہ سریع اور زیادہ مستحکم معلوم ہوتی ہے۔ برطانیہ بھی اپنی تجویزی خاکے میں عمل کا آب و رنگ بھر کر روس سے سبقت لے جانا چاہتا ہے۔ لیکن جو چیز دونوں میں ما بہ الامتیاز ہے وہ روس کا جذبہ کار اور حصول مقصد کی لگن ہے اگرچہ برطانیہ میں بھی تدبر و حسن کار کی کمی نہیں۔ لیکن دونوں کے طریق کار میں ایک عظیم اختلاف ہے۔ برطانیہ کو اندرونی مخالفت کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ لیکن روس میں جب ایک مخصوص نظام تعلیم کے قیام کا فیصلہ کر لیا گیا تو یہ فیصلہ قطعی اور آخری ہوتا ہے۔ اس کے برعکس برطانیہ کی وزارت معارف کے اختیارات محدود ہیں۔ وہ اس تیزی کے ساتھ اپنے نظام تعلیم کو تبدیل نہیں کر سکتی یہی وجہ ہے کہ صنعت و حرفت میں برطانیہ کو جو مقام ڈیڑھ دو سو برس کی طویل مدت میں حاصل ہوا، روس نے اسے صرف بیس برس میں حاصل کر لیا۔

روس اور برطانیہ دونوں کی اقتصادی بنیاد پر سیاسی اقتدار کی جنگ جیتنا چاہتے ہیں۔ برطانیہ کم و بیش سو برس سے مشرق وسطیٰ کے مختلف علاقوں کی سیاسی اور اقتصادی زندگی کا مالک ہے۔ اس کے تیل کے کارخانے برطانیہ کی موجودہ اقتضاءات کا ایک ضروری جزو ہیں۔ اگر مشرق وسطیٰ سے برطانیہ کا سیاسی اقتدار اٹھ جائے تو گمان غالب ہے کہ رفتہ رفتہ اس کی اقتصادی ساکھ بھی قائم نہ رہ سکے گی۔ اس خطرے کے پیش نظر برطانیہ کے ارباب اختیار بہر حیثیت

مشرق وسطیٰ پر اپنا سیاسی اقتدار قائم رکھنا چاہتے ہیں لیکن پاکستان اور ہندوستان کی آزادی اور مصر سے برطانوی فوجوں کے انخلا کے بعد حالات بالکل بدل چکے ہیں۔ مشرق وسطیٰ میں برطانیہ اس وقت ایک سیاسی دوراہے پر ہے۔ ایک طرف عربوں کا قومی احساس اور دوسری طرف روس کا عربوں کی جانب دست تعاون دراز کرنا ان دونوں کے امتزاج سے برطانیہ کو ایک مسلسل خطرہ ہے جس کا احساس اس وقت یہاں بہت شدید ہوتا جا رہا ہے۔ اس احساس کا ایک نہایت دل چسپ تعلیمی پہلو بھی ہے۔ بعض ماہرین تعلیم اور سیاسی مفکر برطانوی مدرسوں میں عربی کی تدریس کو لازمی کرنے کے حق میں ہیں کیوں کہ اس وقت جو لوگ مشرق وسطیٰ میں انگریزی مفاد کے نگران ہیں ان میں سے بہت کم لوگوں کو عربی آتی ہے اس لیے وہ براہ راست عوام سے کوئی رابطہ پیدا نہیں کر سکتے۔ کویت کے ایک اخباری نمائندے نے تو یہ بھی مشورہ دیا ہے کہ برطانیہ کو اپنی سامراجی حکمت عملی کو بدل کر اپنے اقتصادی مفاد کی نگہبانی کرنی چاہیے مبادا دونوں کے حصول کی کوشش میں ایک بھی ہاتھ نہ آئے۔

جاپان اس سلسلے میں چوتھا ملک جاپان ہے جو اپنی صنعت و حرفت میں کسی مغربی ترقی یافتہ ملک سے پیچھے نہیں جاپان ایک ایشیائی ملک ہے جس پر انیسویں صدی میں استعماریت کا دست تطاول دراز نہیں ہو سکا۔ اس لیے اسے ترقی کے وہی وسائل میسر تھے جن کی بدولت یورپ اور امریکہ اس وقت تہذیب و تمدن کے اجارہ دار بن گئے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں جاپان نے ایک کروٹ لی۔ قدیم و جدید کی ٹکر ہوئی اور اس سے ایک نظام نو کی بنیاد پڑی۔ جاپانی مصلحین نے ۱۸۷۲ء میں ابتدائی لازمی تعلیم کا قانون منظور کیا۔ ۱۸۷۳ء میں صرف ۲۵ فی صد طلبہ ابتدائی مدرسوں میں داخل ہوئے لیکن ۱۹۰۰ء میں یہی تعداد ۹۰ فی صد ہو گئی اور اس وقت یہی تعداد ۹۹ فی صد ہے۔ جاپان نے ایک مختصر سی مدت میں جو ترقی کی ہے اس کی مثال کہیں اور مشکل سے مل سکے گی۔ یہ درست ہے کہ روس نے بھی ایک قلیل عرصے میں ایسی ہی حیرت انگیز ترقی کی لیکن اگر روس اور جاپان کے وسائل کا موازنہ کیا جائے تو اس سے جاپان کی برتری واضح ہو جاتی ہے۔ پچھلی عالم گیر لڑائی میں جاپان نے اتحادی فوجوں کو جنوب مشرقی ایشیا میں جس طرح شکست دی، اس کی تفصیلات ابھی لوگوں کے ذہنوں میں تازہ ہیں۔ برطانوی امریکی، ولندیزی اور فرانسیسی طاقتیں اسے شکست نہ دے سکیں۔ تا آں کہ امریکہ نے ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرا کر لاکھوں انسانوں کو تباہ کر دیا، اور جاپان نے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیے۔

امریکہ نے جاپان پر قبضہ کر لیا اور جاپان کو ان تمام مشکلات سے دوچار ہونا پڑا جو مفتوح کو فاتح کے ہاتھوں

منصور ہوتی ہیں۔ لیکن شکست کے باوجود جاپان نے اپنی حرفتی اور صنعتی شکست تسلیم نہ کی اور اب کہ امریکہ نے اسے آزاد کر دیا ہے، جاپان پھر اسی رفتار سے اپنی صنعت و حرفت کو فروغ دے رہا ہے۔ ایک جاپانی موٹر کارخانے نے، جرمنی وضع کی کار تین سو پونڈ میں مہیا کرنے کا اعلان کیا ہے۔ یہ نئی کار خوب صورت بھی ہوگی اور پائدار بھی۔ اس اعلانیے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ جاپان ایک مختصر سی مدت میں پھر ماقبل جنگ کے حالات پیدا کرے گا۔ صنعتی اور اقتصادی لحاظ سے بھی اور عسکری اور فوجی لحاظ بھی۔

جاپان نے یہ ترقی کیوں کر کی اس کے اسباب کیا ہیں؟ — جاپانیوں کی ترقی کا راز، ان کا قومی اتحاد اور ذوق کار ہے وہ بہ حیثیت قوم زندہ رہنا جانتے ہیں اور ان میں اپنی قومی ساکھ قائم رکھنے کا صحیح جذبہ ہے۔ پچھلے دنوں ہوکائیدو یونیورسٹی کے تعلیمی کلچر کے پروفیسر نے جاپان کی تعلیمی ترقی پر ایک مختصر سی تقریر کی۔ موصوف نے اپنی تقریر میں بتایا کہ ہم نے کس طرح تعلیم اور صنعت میں اتنی نمایاں ترقی کی۔ اس صدی کے ربع اول میں کم و بیش ہر ثانوی مدرسے میں حرفتی تعلیم کا مکمل اور باقاعدہ انتظام ہو چکا تھا۔ بالعموم طلبہ یا تو صنعتی مدرسوں میں تعلیم حاصل کرتے تھے یا عسکری مدرسوں میں اور اس وقت یہ دونوں تعلیمی ادارے جاپان میں یکساں طور پر مقبول عام تھے۔

پس چہ باید کرد میں نے ان چار ترقی یافتہ ملکوں کی تعلیمی اور صنعتی ترقی کا جو مختصر سا خاکہ پیش کیا ہے، اس سے میری تمام تر مراد یہ ہے کہ ان ملکوں کی اس حیرت انگیز ترقی سے ہم کیا سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ کیا ان میں سے کسی ایک کی تقلید ہماری تعلیمی کوتاہیوں کا حل ہے یا یہ کہ ہم ان سب سے کچھ نہ کچھ حاصل کر سکتے ہیں، یہ مسائل ایسے ہیں جن کی طرف فوری توجہ کی ضرورت ہے۔ ۱۳ سال کی طویل مدت میں ہم نے تعلیمی لحاظ سے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ اتنا وقیع نہیں کہ ہم چشموں میں رسوائی سے بچ سکیں۔

تعلیم کی تعمیر نو میں اس وقت تک ہم نے برطانیہ کی پیروی کی، بلکہ تقلید کی یہ رفتار آزادی کے بعد قدرے اور تیز ہو گئی ہے، اور ایک گم گشتہ راہ مسافر کی طرح کبھی ہماری نگاہیں برطانیہ کے پبلک سکولوں پر پڑتی ہیں اور کبھی گرامر سکولوں پر۔ پھر ہم اپنی تمام تر قوت ان اداروں کی تعمیر و توسیع پر صرف کر دیتے ہیں جس سے سفید پوشوں کی ایک جماعت تو پیدا ہو جائے گی لیکن وقت کی رفتار کا ساتھ نہیں دے سکے گی۔ آج برطانیہ خود ان اداروں کو اپنی معاشرتی زندگی کے لیے موزوں نہیں سمجھتا۔ یہی وجہ ہے کہ روس کی تقلید میں اس نے جس نظام تعلیم کی طرح ڈالی ہے، وہ پبلک سکولوں اور گرامر سکولوں کے نظام تعلیم سے بالکل

مختلف ہے، یہ ادارے قدیم اور پارینہ ہو چکے ہیں۔ ان کا تمام تر نظام استعماری ہے۔ پاکستان میں بھی اس قسم کے جو ادارے ہمیں برطانوی ہند سے ورثے میں ملے یا جنھیں ہم نے بزعم تجدد مابعد تقسیم خود قائم کیا۔ ہماری قومی تعمیر و ترقی میں قرار واقعی حصہ نہیں لے سکتے۔ یہ ادارے ایک ایسی قوم کی تخلیق کر سکتے ہیں جسے خود اپنی قوم سے نفرت ہو، کیوں کہ وہ ایک ایسی دنیا میں پرورش پاتی ہے جو بالکل مصنوعی ہے، اس کا اس دنیا سے کوئی تعلق نہیں جو پاکستان کی عام دنیا ہے۔

آج جب کہ ہم ایک نظام نو کی بنیاد ڈال رہے ہیں یہ ہمارا فرض ہے کہ اس بنیاد میں جو گارا چونا اختیار کریں، وہ پختہ، مضبوط اور دیرپا ہو، کیوں کہ جو بنیاد اس وقت ہم قائم کر رہے ہیں ہماری توقعات کا شیش محل اسی پر تعمیر ہوگا۔ ہمارے دوسرے معاشرتی مسائل کی طرح تعلیم بھی ایک اہم قومی مسئلہ ہے۔ اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ تعلیمی اصلاح کے بغیر ہم اس دنیا میں ترقی کر سکیں گے تو یہ ایک بہت بڑی بھول ہے۔ ممکن ہے وہ طبقہ جو انگریزوں کی ذہنی یادگار ہے۔ قوم کو ان خطوط پر چلانے کی کوشش کرے کہ ایک مختصر سی جماعت ملک کی تعمیر و ترقی کی ضامن بن سکتی ہے۔ لیکن یہ دوسری بڑی غلطی ہے جس کے ہم مرتکب ہوں گے۔ قوم افراد سے بنتی ہے۔ اگر افراد میں عزم و حوصلے کا فقدان ہو تو قوم بھی بے چارگی اور اضمحلال کے گرداب میں پھنس کر فنا ہو جائے گی۔ یہ کام ان لوگوں کا ہے جو اس وقت قوم کی تعلیمی تعمیر کے سربراہ کار اور تعلیمی حکمت عملی کے خالق ہیں۔ ان کی ایک غلطی قوم کو تباہ کر سکتی ہے۔ اور ان کا ایک صحیح قدم قوم کو منزل گذار بنا سکتا ہے۔

پاکستان بفضلہ تعالےٰ آج کسی تاج کا "تابندہ نگینہ" نہیں بلکہ ایک آزاد اسلامی جمہوریت ہے۔ یہ قوم کا ایک متفقہ مطالبہ تھا۔ ہم نے متحدہ ہندوستان میں پاکستان کی جنگ اسی اصول پر جیتی۔ اب کہ دستور نے جمہوریہ اسلامیہ کا اعلان کر دیا ہے ہماری ذمہ داری اور بڑھ جاتی ہے۔ اسلام طبقاتی اور گروہی تقسیم کا ضامن بن کر نہیں بلکہ اس قسم کے اداروں کو مٹانے کے لیے آیا ہے، اس لیے اب یہ ہمارا فرض ہے کہ قوم کی ذہنی، اقتصادی، سماجی، اخلاقی، معاشری اور قومی فلاح کے لیے ایک ایسے نظام تعلیم کی طرح ڈالیں جو موجودہ حرفتی دور میں اسلام کا صحیح نمائندہ ہو +

یونی فارم

مفتی محمد اقبال

مری کی مسرت انگیز پُر بہار فضاؤں میں جب راولپنڈی ڈویژن کے ہیڈ ماسٹر صاحبان کو انسپکٹر صاحب راولپنڈی ڈویژن کی صدارت میں یکجا جمع ہونے کا موقع ملا تو کئی ایک اہم اور ضروری امور کے متعلق غور و خوض ہوا جن میں سے ایک امر مدارس میں طلبہ کے لیے یونی فارم کی ترویج بھی تھا۔ بہت رد و کد کے بعد قرار پایا کہ علی گڑھ کالج کی طرح مدارس میں بھی تمام طلبہ کے لیے ایک ہی رنگ کے کپڑے تجویز ہونے چاہئیں تاکہ نہ صرف امیر و غریب سبھی ایک ہی صف میں کھڑے نظر آئیں بلکہ اس یک رنگی سے امیر غریب کی تفریق ہی سرے سے مٹ جائے۔ بعض تعیین کا خیال تھا کہ یہ طریق کار اس لحاظ سے ناقابل عمل اور غیر موزوں ہے کہ دنیا کے اس دھارے میں جہاں رزم گاہِ حیات کی دستانیز میں جب بالآخر تفریق اور امتیاز سے دوچار ہونا لابدی ہے تو کیوں نہ مدرسے کے اندر بھی اسی تفریق کی عملی تعلیم موجود ہو۔ لیکن کثرت رائے بالآخر یہ طے پا گیا کہ مدارس میں یونی فارم کا رواج ازبس ضروری ہے۔ چناں چہ ہیڈ ماسٹر صاحبان یہ فیصلہ کر کے اٹھے کہ مری کی بلندیوں سے اترنے کے ساتھ ہی پہلا کام جو کیا جائے گا وہ اپنے مدرسے میں ایک خاص یونی فارم کو اپنانا ہوگا۔ بعضوں کی نظر انتخاب ملیشیا کی قمیص اور شلوار (یا پاجامہ) پر پڑی اور بعضوں نے کوئی اور رنگ منتخب کیا۔ میں نے حالات کا جائزہ لینے کے بعد سفید قمیص اور شلوار یا پاجامہ کو مدرسے کی یونی فارم قرار دیا۔ چناں چہ نوٹس بورڈ پر اسی بارے میں نوٹس چسپاں کرا دیا گیا اور اساتذہ کی وساطت سے بچوں تک اپنے فیصلہ کو پہنچا دیا بلکہ اس بات کی وضاحت بھی کر دی گئی کہ ایک ہفتہ کے بعد تمام بچوں کے کپڑے سفید ہونے ضروری ہیں اور دھوتی یا تہ بند کا داخلہ مدرسہ میں بالکل ممنوع ہوگا۔ ایک ہفتہ گذرنے کے بعد صبح کے اجتماع میں دعائیہ نظم کے معاً بعد میں نے بچوں کی قطاروں کا جائزہ لیا تو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ بیشتر بچوں کے کپڑے سفید تھے۔ اگرچہ بعض بچے سفید مگر لکیر دار قمیص پہنے تھے۔ خال خال تہ بند اور دھوتیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ میں نے دل میں فیصلہ کیا کہ ان بچوں کو فرداً فرداً بلا کر سرزنش کروں گا تاکہ آئندہ کے لیے وہ مدرسے کی مقررہ یونی فارم ہی زیب بدن کر کے حاضر ہوں اور

اور اس طرح اس متفقہ فیصلہ کی عملی تعمیل ہوبہو مری کی بلندیوں میں طے پایا تھا۔

اس ضمن میں آٹھویں جماعت کے ایک طالب علم قدوس کو میں نے خاص طور پر نوٹ کیا تھا۔ وہ ایک رنگین ... دھوتی پہنے تھا جو غالباً ریشمی تھی۔ جونہی میں نے اس کی طرف نگاہ کی تو اس نے فوراً ہی اپنی نظریں جھکا لیں۔ گویا اس کو اس امر کا احساس تھا کہ وہ میرے حکم کی صریح خلاف ورزی کا ارتکاب کیے ہوئے تھا۔ چناں چہ جب بچے اپنی جماعتوں میں چلے گئے اور تعلیمی کام شروع ہو گیا تو میں نے قدوس کو دفتر میں طلب کیا۔ فوراً ہی وہ ایک مجرم کی طرح میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس وقت بھی اس کی آنکھیں زمین پر گڑی تھیں۔ میں نے بید اٹھایا اور فیصلہ یہ کیا کہ قدوس کو ایسی سزا دی جائے جس سے بچوں کو عبرت ہو اور آئندہ کے لیے وہ ہیڈ ماسٹر کے حکم کی خلاف ورزی کی جرأت نہ کر سکیں۔ لیکن قدوس کو سزا دینے سے پہلے یہ معلوم کر لینا ضروری تھا کہ اس نے حکم کی تعمیل میں کوتاہی کیوں کی ہے اس لیے میں بھویں سکیڑ کر آواز میں ایک خاص قسم کی درشتی پیدا کرتے ہوئے - بید کو فضا میں بلند کیے ہوئے غضب ناک لہجے میں اس سے پوچھا کہ وہ مدرسے میں رنگین دھوتی پہن کر کیوں آیا ہے اور کیوں اُس نے سفید پاجامہ نہیں پہنا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میری قہر آلود نگاہیں اور غضب ناک آواز قدوس کے بدن میں لرزہ پیدا کر دے گی اور وہ اس دبدبے کی تاب نہ رکھتے ہوئے تھرتھرا اُٹھے گا۔ لیکن وہ اس طرح ساکت و جامد کھڑا تھا گویا کہ اس نے نہ کچھ سنا ہے اور نہ کچھ دیکھا ہے۔ اس کے لب بھی متحرک نہ ہوئے وہ بت بنا خاموش کھڑا تھا۔ اس کی خاموشی نے میری طبیعت میں غصے کی آگ کو اور بھڑکا دیا۔ چنانچہ میں نے ایک بار پھر زیادہ کرخت لہجے میں اپنے سوال کو دہرایا۔ اس بار اس کی آنکھیں اوپر کو اٹھیں ان میں آنسو تیر رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کے لبوں نے حرکت اور وہ یوں گویا ہوا۔

جناب عالی! آپ کا حکم سر آنکھوں پر لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ دھوتی میری بڑی بہن کی ہے۔ جب میں مدرسے آتا ہوں تو وہ اپنا دوپٹہ تہ بند کے طور پر استعمال کرتی ہے اور یہ دھوتی مجھے مل جاتی ہے۔ مدرسے سے واپس جا کر یہ دھوتی میں اس کو واپس کر دیتا ہوں اور جانگیہ پہن لیتا ہوں۔ غالباً آپ نے کئی بار مجھے وہ جانگیہ پہنے بازار میں پھرتے دیکھا ہوگا۔ میں نے آپ کے حکم کا تذکرہ اپنے والد صاحب سے کیا تھا۔ انہوں نے ایک آہ سرد کھینچی اور کہا۔ بیٹا! ہمارے پاس سفید شلوار یا پاجامہ کہاں۔ البتہ اگر دن پھر جائیں تو ضرور تمہیں اچھے کپڑے بنوا دیے جائیں گے۔

میرا بید غیر ارادی طور پر میز پر جا ٹکا۔ میری تنی ہوئی بھویں اور پھولی ہوئی رگیں اپنی اصلی جگہ پر پھر پہنچ گئیں

میری آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک تھی مجھ میں قدوس کی طرف دیکھنے کی تاب نہ رہی میں نے ہاتھ کے اشارے سے اس کو چلے جانے کی اجازت دے دی۔ پھر درزی کو بلوایا اور ہیڈ کراس فنڈ سے اس کو قمیص اور شلوار بنوا دی ایک جوتا بھی دلوا دیا۔

اگلے دن شہر میں شور تھا۔ ہمارا ہیڈ ماسٹر کتنا عجیب آدمی ہے وہ امیر اور غریب میں تمیز ہی نہیں کر سکتا اس نے قدوس کو قمیص اور شلوار بنوا دی ہے جو ریشمی دھوتی پہنتا ہے۔ حالاں کہ مدرسے میں اس سے کہیں زیادہ غریب لڑکے بھی موجود ہیں۔

اس شور کا مجھ پر کوئی اثر نہ تھا۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ اگلے روز میں نے ایک اور نوٹس جاری کیا جس کا مضمون یہ تھا "میں مدرسے میں یونی فارم کے اجرا والا حکم واپس لیتا ہوں اور بچوں کو اجازت دیتا ہوں کہ وہ جو لباس ان کو میسر آئے پہنیں۔ البتہ وہ یہ کوشش ضرور کریں کہ حتی الامکان وہ شلوار یا پاجامہ پہنیں۔

اب بھی جب کبھی میں کسی لڑکے کو دھوتی پہنے دیکھتا ہوں تو اس سے ہرگز یہ استفسار نہیں کرتا کہ وہ دھوتی کیوں پہنتا ہے۔ ڈرتا ہوں کہ وہ کوئی ایسا دل دوز المیہ بیان کر دے جو مجھے کئی دن تک از خود رفتہ اور بے چین نہ کر دے لیکن ان سب باتوں کے باوجود میرے دل میں رہ رہ کر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ آخر تمام ہیڈ ماسٹر صاحبان نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیوں کر لیا کہ ہر مدرسے میں ایک یونی فارم کا ہونا ضروری ہے۔ جب زیادہ سوچ بچار کرتا ہوں تو اس نتیجہ پر پہنچتا ہوں کہ ہر ایک ہیڈ ماسٹر دل سے اس امر کا تمنائی ہے کہ اس کے مدرسے میں بچوں کا ایک رنگ ہو۔ جہاں کہیں وہ جائیں، اپنے مخصوص رنگ سے پہچانے جائیں۔ لباس میں یک رنگی اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ لیکن اصل مقصد ان میں وہ رنگ پیدا کرنا ہے جو دھونے سے اور زیادہ نکھرتا ہے۔

مدارس میں مذہبی تعلیم کو اسی لیے جگہ دی گئی تھی کہ ناقۂ بے زمام کو سوئے قطار لانے میں آسانی ہو لیکن مقام افسوس ہے کہ چند در چند وجوہ کی بنا پر یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی اور محکمہ کو کھلے بندوں اپنی ناکامی کا اعتراف کرنا پڑا۔

مدارس میں مذہبی تعلیم کے رواج نہ پانے اور یونی فارم کے نافذ العمل نہ ہونے کے باوجود بھی مدارس میں یک رنگی کی اشد ضرورت ہے۔ اس وقت تمام ملک کی آنکھیں اساتذہ پر لگی ہوئی ہیں کہ وہ حسن تدبیر سے اس عقدۂ لاینحل کی

گرہ کشائی کریں۔ لیکن سابقہ تجربے شاہد ہیں کہ جب تک پرانی ڈگر پہ چلتے جائیں گے۔ اس بارے میں کامیابی سے ہم کنار ہونا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ جہاں ہزاروں روپے اساتذہ کو بیرون ملک بھیج کر بیرونی تعلیم اور ترقی کے اطوار سے آگاہ کیا جاتا ہے۔ ٹریننگ کالج لاہور کے اساتذہ اور تلامذہ کی چند ٹولیاں ملک کے مختلف حصوں کے دورہ پہ مامور کی جائیں جو ملک میں اساتذہ کی مشکلات، مدارس کے ماحول اور ان میں ترقی کے امکانات پر پوری توجہ سے غور کریں، اور ٹھوس حقائق کو آنکھوں سے دیکھ کر درست اصلاحی نتائج پر پہنچیں۔ جب یہ پارٹیاں دورہ کر چکیں تو پھر سنٹرل ٹریننگ کالج میں ایک مجلس مشاورت کے ذریعہ سے لائحہ عمل ترتیب دیا جائے، امید ہے کہ ایسا کرنے سے بڑی بڑی سے بڑی مشکلات کا حل تلاش ہو سکے گا۔

میں امید کرتا ہوں کہ اس مفید تجویز پہ ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے بعد اس رنگ کی تلاش و جستجو میں آسانی ہوگی جو ہمارے مدارس میں نکھار اور ہمارے بچوں میں رعنائی افکار پیدا کرنے کا ضامن ہوگا۔

تحقیقاتی مطالعہ کیا کہتا ہے؟

ثانوی مدرسوں میں ریاضی کی تدریس

ادریس احمد

تحقیقاتی مطالعہ اور استاد جدید تعلیم کی ساری بنیاد نفسیاتی حقائق اور تجرباتی شہادت پر ہے۔ کوئی اصول یا طریق کار، خواہ وہ بظاہر کتنا ہی معقول اور اچھا معلوم کیوں نہ دے اس وقت تک نہیں اپنایا جاتا جب تک تحقیقاتی مطالعہ اس کے لیے ناقابل انکار اعداد وشمار کی ٹھوس بنیاد فراہم نہ کر دے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں یہ پیشہ ورانہ خدمت زیادہ تر استادوں کی تنظیموں نے اپنے ذمے لے رکھی ہے۔ مثلاً ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں استادوں کی سب سے بڑی قومی تنظیم۔ این۔ ای۔ اے (نیشنل ایجوکیشن ایسوسی ایشن) ہے۔ اس ہمہ گیر تنظیم کے مختلف شعبوں میں سے ایک اہم شعبہ تحقیق و مطالعہ کا ہے۔ یہ شعبہ کمرۂ جماعت میں پڑھانے والے استادوں کے مشاہدوں اور تجربوں کو بنیاد قرار دے کر تعلیمی تحقیقات کا کام جاری رکھتا ہے۔ حال ہی میں اس شعبے نے کتابوں کا ایک سلسلہ شائع کیا ہے جس کا نام ہے "تحقیقاتی مطالعہ استاد کو کیا بتاتا ہے؟" یہ رسالے جو مختلف مضامین کی تدریس سے بحث کرتے ہیں، نامور امریکی ماہرین تحقیقات کی زیر نگرانی تیار ہوئے ہیں۔ اس سلسلے کا ایک کتابچہ ریاضی کی تدریس پر ہے اور اس کا عنوان ہے "ثانوی مدرسوں میں ریاضی کی تدریس" اس مختصر سے مضمون میں اس کتابچے کے اہم نکات کا خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے۔

تحقیق کا مقام قارئین کو سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ بے لاگ تحقیق کسی مخصوص نقطۂ نگاہ کی وکالت کے درپے نہیں ہوا کرتی۔ اسے اس بات سے بھی کوئی غرض نہیں کہ معاشرے کے لیے کونسی چیز فائدہ مند ہے اور کونسی نقصان دہ اس بات کا فیصلہ کرنا معاشرے کا اپنا کام ہے۔ تحقیق کا کام بس یہ ہے کہ اہم حقائق کے چہرے سے پردہ اٹھا دے اور یہ ظاہر کر دے کہ اگر معاشرہ ان حقائق سے خدمت لینا چاہتا ہے تو اس کی بہترین صورت کیا ہے۔ تحقیقاتی مطالعہ کا انداز کار عموماً اس قسم کا ہوتا ہے: "اگر ہم یہ طریق کار اختیار کریں تو نتیجہ کیا نکلے گا؟"

تعلیمی تحقیقات سے عملی نتائج اسی وقت نکلیں گے جب کمرۂ جماعت میں اس کے نتائج کو کام کی بنیاد بنایا جائے گا۔ یہ اس وقت ہوگا جب تحقیقات کے نتائج کو اس انداز میں بیان کیا جائے اور اس طور پر مشتہر کیا جائے کہ کمرۂ جماعت میں

کام کرنے والے اور اس کام کی نگرانی کرنے والے ان نتائج کی اہمیت اور افادیت کے قائل ہو جائیں اور ان کی روشنی میں اپنے اسلوب کار پر نظر ثانی کریں۔

الجبرا ثانوی مدرسوں میں ریاضی کی تدریس کے متعلق جو تجرباتی شہادت جمع کی گئی اس نے ثابت کیا کہ کوئی ایک طریقہ تدریس سب طلبہ کے لیے ایک سا نہیں بعض طلبہ ایک طریقہ سے زیادہ اچھی طرح اخذ کرتے ہیں اور بعض دوسرے طریقے سے۔

الجبرا پڑھانے کا عام روایتی طریقہ یہ ہے کہ مجرد کلیات اور اصطلاحات کی تشریح کرکے انہیں رٹا دیا جائے مختلف اصطلاحات کی تعریفیں یاد کرادی جائیں اور پھر سوالات حل کرکے سمجھا دیا جائے کہ ان از بر شدہ اصطلاحات اور کلیات سے کس طرح کام لیا جاتا ہے۔ اس طور پر پڑھانے سے طلبہ الجبرا سیکھ جاتے ہیں۔

اس استخراجی طریقے کے مقابل استنباطی طریق تدریس ہے۔ یہاں آغاز مشاہدے اور ٹھوس تجربات سے کیا جاتا ہے یہاں طلبہ عملی کام کے ضمن میں بعض مجرد تصورات پر پہنچ جاتے ہیں اور انہیں عام نتائج کی شکل دے کر یاد کر لیتے ہیں طلبہ اس طور پر بھی الجبرا سیکھ جاتے ہیں۔ استاد خواہ روایتی استخراجی طریق تدریس استعمال کرے خواہ استنباطی، دونوں صورتوں میں وقت کم و بیش ایک سا لگے گا۔ دونوں طریقوں پر پڑھائے جانے والے بچوں کا جب کوئی تین ماہ بعد امتحان لیا جائے تو انہیں تقریباً ایک سا یاد ہوگا۔

یہاں تک تو دونوں طریقوں میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن بعض امور ایسے بھی ہیں جن میں استنباطی طریق کو واضح فوقیت حاصل ہے۔ مثلاً زیادہ ذہین بچے (یعنی ایسے بچے جن کا ذہنی خارج قسمت ۱۱۷ یا اس سے اوپر ہو) استنباطی طریق سے زیادہ فائدہ حاصل کرتے ہیں، جب زیادہ دیر پا نتائج پر نگاہ رکھی جائے تو تجرباتی اور استنباطی طریق کار کی برتری پورے طور پر ثابت ہو جاتی ہے۔ طلبہ خواہ زیادہ ذہین ہوں یا اوسط ذہانت کے۔ جو تصورات وہ ذاتی تجربے اور مشاہدے کی بنا پر اخذ کرتے ہیں۔ ان کا فہم کہیں زیادہ گہرا بامعنی اور دیرپا ثابت ہوتا ہے۔

فہم اور مہارت ریاضی کے استادوں میں دو نقطہ ہائے نگاہ عام ہیں۔ ایک گروہ کا کہنا ہے کہ "طلبہ کو سوال حل کرنا سکھا دیجیے وہ ان کا مطلب خود بخود سمجھنے لگیں گے" اس کے برعکس دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ "صحیح معنوں میں وہی چیز سیکھی جاتی ہے جس کا مطلب ذہن نشین ہو جائے۔"

حالیہ سالوں میں ۔۔۔ ۔۔ ۔۔

کمرۂ جماعت میں استعمال ہونے والے طریق دونوں مفروضوں پر مبنی نظر آتے تھے۔ تحقیقاتی مطالعہ نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ جو تدریس فہم کی اولیت پر مبنی ہو اس کے نتائج زیادہ موثر اور دیرپا ہوتے ہیں۔

ہندسہ کی تدریس میں دیکھا گیا ہے کہ طلبہ تین ہفتوں تک پڑھے ہوئے مسائل کا تقریباً ۷۰ فی صد یاد رکھ سکتے ہیں اس کے ساتھ ہی یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ تدریس جس قدر زیادہ باہم مربوط اور بامعنی ہوگی اسی قدر اس کے نتائج دیر تک باقی رہیں گے محض زبانی رٹ لینے سے تھوڑی دیر بعد ذہن میں کچھ باقی نہیں رہتا۔

تحقیق کے ان نتائج کا مطلب بالکل صاف ہے۔ اندھا دھند رٹنے سے کوئی پسندیدہ نتائج پیدا نہیں ہوتے۔ لیکن اگر سوجھ بوجھ اور حافظے دونوں سے کام لیا جائے اور اس طور پر حاصل شدہ تصورات کو ایک استخراجی شکل میں منظم کر دیا جائے تو یہ علم بہت کارآمد اور دیرپا ثابت ہوتا ہے تحقیق نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ اگر ریاضی کی تدریس میں کام کا آغاز ہی بلا سوچے سمجھے رٹنے سے کر دیا جائے تو طلبہ اس تخلیقی اسلوب فکر سے بڑی حد تک عاری ہو جاتے ہیں جس کی بالغ زندگی میں بہت اشد ضرورت ہے۔ ریاضی کو بہترین طور پر سیکھنے کی صرف ایک ہی صورت ہے۔ وہ یہ کہ اس کے ذریعہ معقول استدلال کی مشق ہو۔

ان حقائق کا ایک بدیہی مطلب یہ بھی ہے کہ جو طالب علم ہندسہ کے مسائل کا صحیح فہم پیدا کر کے انہیں یاد کرنا چاہتا ہو وہ خواہ کتاب سامنے کھلی رکھے یا اسے بند کر دے اس سے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ روایتی استادوں کا یہ اصرار کہ مسئلہ یاد کرتے وقت یا سناتے وقت کتاب کھلی نہ ہونی چاہیے بالکل بے معنی ہے حقیقت یہ ہے کہ جو طالب علم کتاب سامنے رکھ کر حل شدہ مسئلہ کے استدلال کی منطق کو اچھی طرح سمجھ لیتا ہے اور اس کے ہر قدم کی ناگزیر موزونیت کو دیکھ سکتا ہے وہ بوقت ضرورت نہ صرف اس مسئلہ کو حافظہ سے بہتر طور پر دوبارہ بیان کر سکتا ہے بلکہ نئے نئے اور پیچیدہ سوالات کے حل میں اس کا اطلاق بھی بہت بہتر طور پر کر سکتا ہے۔ یہ طالب علم ایک ایسی مفید مہارت اخذ کر لیتا ہے جس کی اسے زندگی میں ضرورت پیش آئے گی عملی زندگی میں اسے کتابوں سے حوالے تلاش کرنے ہوں گے۔ زبانی رٹی ہوئی باتیں اگلنی نہیں پڑیں گی۔

بصری امدادیں | مشاہداتی اور تجرباتی تدریس ریاضی بصری امدادوں کا بڑا سہارا لیتی ہے۔ حالیہ سالوں میں

فلموں اور فلمی پلیٹیوں سے بے پناہ خدمت لی گئی ہے۔ اس کے باوجود کوئی ایسی شہادت موجود نہیں جس کی بنا پر یہ کہا جائے کہ بصری امدادوں نے تدریس ریاضی کی خوبی کو بڑھا دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فلموں کے انتخاب کے لیے کوئی قابل اعتماد معیار قائم نہیں کیے جا سکے۔

جو فلمیں ریاضی کی تدریس میں استعمال ہوں ان کا پہلا خاصہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ درست ریاضی پیش کریں۔ بصری امدادیں حواس کو غیر معمولی شدت کے ساتھ متاثر کرتی ہیں اور اگر کوئی فلم ریاضی کا غلط قسم کا مواد پیش کرے گی تو اس سے بجائے فائدہ کے نقصان ہوگا۔ فلم کی دوسری خوبی ہونی چاہیے کہ وہ دلچسپی کو بیدار کرے اور موزوں نفسیاتی ماحول پیدا کر کے تدریسی مواد کو آگے لے جائے۔ جو کچھ سکھایا گیا ہے اس کی تلخیص تیار کر دے اور مزید تعلم کا شوق پیدا کر دے۔

تاہم فلموں کے علاوہ دوسری بصری امدادیں بھی موجود ہیں جن سے ریاضی پڑھانے میں مدد لی جا سکتی ہے۔ ان کی کامیابی کا انحصار درست نفسیاتی اصولوں کی پابندی پر ہے۔ ہر ذی فہم استاد اپنے لیے ایک مخصوص تکنیک تیار کر سکتا ہے جس کی بدولت وہ سیکھنے والوں کو آسانی سے مقرون اور ٹھوس شاہدات سے مجرد ریاضی کے تصورات کی طرف لے جا سکتا ہے۔ اس عمل کو عموماً مندرجہ ذیل منزلوں میں سے گذرنا پڑتا ہے۔

(۱) حواس اور عضلات کی موزوں تربیت جس کی مثال پرکار کے ساتھ دائرہ کھینچنے کی مشق کرنا ہے۔

(۲) مشاہداتی اور حرکاتی مشق جس کی مثال پروٹریکٹر کے ذریعہ زاویوں کو ناپنا اور دیے ہوئے درجوں کے زاویے بنانا ہے۔

(۳) ذہنی ارتباط جس کا مطلب یہ ہے کہ مخصوص علامات کو مخصوص ریاضی کے مطالب کے ساتھ منسوب کر دیا جائے مثلاً l^4 سے مراد ہے l × l × l × l مشاہداتی فہم سے ذہنی عمل کی طرف جانے کو یہ پہلا قدم ہے۔

(۴) تصورات کی تشکیل :- اس سے مراد ذہنی تصویروں کی تشکیل پذیری ہے۔ تعریفوں کے ذریعہ ان کا ایک دوسرے کے ساتھ الحاق اور عمل۔ اطلاق، امتیاز اور تعمیم کے اصولوں کا اخذ کرنا ہے۔ ان وسائل سے "ثبوت" کا تصور جنم لیتا ہے۔

(۵) مسائل کا حل۔ اس منزل پر مجرد اصولوں کی مدد سے زندگی کے مسائل اور عملی دشواریوں کے حل تلاش کیے جاتے ہیں استاد کا کام یہ ہے کہ وہ طلبہ کو حواس کی سطح سے آغاز کر کے نظریاتی سطح پر پہنچنے میں مدد دے۔ اگرچہ تمام ذہنی بالیدگی اسی مسلسل عمل سے عبارت ہے تاہم ریاضی میں اس اصول کی اہمیت غیر معمولی طور پر زیادہ ہے۔

انتقالِ تعلّم | انتقالِ تعلّم کا نظریہ روایت پرستِ تعلیم کا سنگِ بنیاد تھا۔ اب اس نظریے کی ہمہ گیری بے شک ختم ہو چکی ہے۔ پھر بھی ایک محدود دائرہ کے اندر اس کی صحت مسلم ہے۔ پچھلے وقتوں میں اقلیدس کی تدریس کو قوتِ استدلال کی ترقی کا زینہ سمجھا جاتا تھا۔ اب یہ غیر سائنسی یقین ختم ہو چکا ہے۔ مگر یہ امر قابلِ انکار ہے کہ اگر ریاضی کی تدریس موزوں اصولوں اور پسندیدہ طریقہ ہائے کار پر مبنی ہو تو یہ تربیت ریاضی کے علاوہ زندگی کے دوسرے میدانوں میں بھی کام دے سکتی ہے۔

ریاضی ایک ایسا مضمون ہے جس کی ہر شاخ میں ایک مخصوص منطق کام کرتی نظر آتی ہے خواہ حساب ہو یا الجبرا اور یا ہندسہ۔ تینوں کا استدلال ایک مقررہ وضع کی منطق پر نظر آئے گا۔ ریاضی کی تدریس کا ایک اہم مقصد یہ ہے کہ طلبہ اس مقصد کو سمجھیں اور اس سے کام لینے کے قابل ہو جائیں۔ بہت سے تحقیقاتی مطالعوں کے بعد اب یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اگر ریاضی کی تدریس کو عملی زندگی کے مسائل سے مربوط رکھا جائے تو صرف یہ کہ سیکھنے والوں میں ریاضی کی منطق کا بہتر فہم پیدا ہوتا ہے بلکہ وہ اس قابل بھی ہو جاتے ہیں کہ اس منطق سے ریاضی کے علاوہ دوسرے مواقع پر بھی کام لے سکیں۔

ریاضی کو زندگی کے ساتھ مربوط کرنے سے بہتر نتائج اس لیے حاصل ہوتے ہیں کہ اس طرح طالب علم اس کی منطق کو معاشرتی زندگی کے عام مسائل پر بھی چسپاں کر کے دیکھنے لگتے ہیں۔ مثلاً وہ کسی معاشرتی مسئلہ کے متعلق ایک مفروضہ قائم کر کے دیکھتے ہیں کہ اس مفروضے کے منطقی نتائج بالآخر کہاں لے جاتے ہیں۔ یوں انہیں اس منطقی استدلال کی دشواریوں اور اس کے احاطۂ اثر کا جو شعور یا احساس پیدا ہو سکتا ہے وہ اس صورت میں کبھی ممکن نہ ہوتا۔ اگر ان کے مفروضے نقطے، خط یا اس قسم کے دوسرے ہندسی تصورات تک ہی محدود رہتے۔ اس احساس کے بعد طلبہ ہندسی منطق سے ریاضی میں بھی بہتر طور پر کام لینا سیکھ جاتے ہیں۔ تجربوں نے ثابت کیا ہے کہ جن طالب علموں نے ریاضی کی منطق کو معاشرتی زندگی پر لاگو کرنا سیکھ لیا ہو وہ ہندسے میں اس کا زیادہ مؤثر استعمال کرنے لگتے ہیں، اس سے ان کی ہندسہ کی قابلیت کم ہونے کی بجائے بڑھ جاتی ہے۔ مزید براں زندگی کے مسائل کے متعلق اس کا تنقیدی فہم نمایاں طور پر ترقی پاتا ہے۔

ریاضی کی منطق سے زندگی کے دوسرے میدانوں میں کام لینے کے لیے مندرجہ ذیل اقدام ضروری ہیں۔

(۱) زیرِ بحث مسئلہ کے اہم پہلوؤں اور ان کو بیان کرنے والے الفاظ کے معانی متعین کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اس مطلب کے لیے طالب علم مختلف الفاظ کی تعریفیں کرتا ہے اور محسوس کرنے لگتا ہے کہ تمام لفظوں کی تعریفیں کرنا آسان بلکہ بعض اوقات ممکن بھی نہیں۔

(۲) طالب علم اب یہ کوشش کرتا ہے کہ ان تمام بیان شدہ اور مضمر مفروضات کی نشان دہی کر سکے جو مطلوبہ نتیجہ پر پہنچنے میں مدد دے سکتے ہیں۔

(۳) اگلا قدم یہ ہے کہ ان مفروضات کی اچھی طرح چھان بین کی جائے اور ان میں سے صرف انہی کو قبول کیا جائے جو گذشتہ تجربے کی روشنی میں معقول نظر آئیں۔

(۴) اب طالب علم ایسی منطقی شہادت کی تلاش کرتا ہے جو مطلوبہ نتیجے کی طرف لے جانے والی ہو۔

(۵) آخر میں طالب علم اس جمع شدہ مواد کو ریاضی کے استدلال کی شکل دے دیتا ہے۔

تاریخی طریقے | بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ریاضی کا بہترین فہم پیدا کرنے کی صورت یہ ہے کہ طالب علم کو ریاضیاتی فکر کی ان تمام منزلوں میں سے گذارا جائے جن میں گذر کر انسان نے ریاضی کا موجودہ واضح اور مکمل فہم پیدا کیا ہے۔ ابتدائی زمانے میں ریاضی کے متعلق انسان کا فہم بہت بھدا اور ادھورا تھا۔ رفتہ رفتہ ارتقائی منزلیں طے کرنی چاہئیں۔ اس نظریئے کو بنیاد قرار دے کر جو کتابیں لکھی گئی ہیں وہ کئی مقامات پر کسی منطقی بحث یا مثالوں کے حل کی بجائے ایک تصویر پر ہی اکتفا کرتی ہیں۔ تحقیق نے ثابت کیا ہے کہ یہ طریق تدریس اس قدر مفید نہیں جس قدر پہلے سے طے شدہ اور واضح منصوبے کے تحت تدریس۔ تاہم تاریخی پس منظر کی افادیت ناقابل انکار ہے۔ جن طلبہ کو یہ پس منظر حاصل تھا ان کا فہم زیادہ وسیع اور انسانیت نواز ثابت ہوتا ہے۔ وہ ریاضی کو انسانی برادری کی رنگارنگ زندگی کا ایک اہم پہلو سمجھتے اور اس کے اصولوں کا زیادہ باوقار فہم حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ پس منظر ریاضی اور اس کے اصولوں کو انسانی ثقافت کے ایک جزو لاینفک کا درجہ دے کر انہیں ایک زیادہ قابل احترام درجہ عطا کر دیتا ہے، کیوں کہ اب وہ ایسے آلوں کی شکل میں نظر آنے لگتے ہیں جن کے طفیل انسانی زندگی کو بہتر بنایا جا سکتا ہے۔

قیادت کے متعلق ہم کیا جانتے ہیں؟

انور علی قریشی

علم التعلیم اور قیادت کا باہمی رشتہ بہت گہرا ہے تعلیمی میدان میں جس سطح پر بھی نظر ڈالی جائے قیادت کا مسئلہ سر اٹھاتا نظر آئے گا۔ خواہ ہم طلبہ و استاد کمرۂ جماعت میں پڑھا رہے ہوں۔ خواہ طلبہ و انسپکٹر مدارس اس کام کی نگرانی کر رہے ہوں اور خواہ کسی تعلیمی ادارے کا انتظام ہمارے متعلق ہو۔ ان تمام حیثیتوں میں قائدانہ صلاحیت کی ضرورت محسوس ہوگی، جب ہم طلبہ کی تربیت پر نگاہ ڈالتے ہیں تو وہاں بھی یہ ضرورت بدستور نظر آتی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ طلبہ کی تربیت اس طور پر ہو کہ ان کی قائدانہ صلاحیت زیادہ سے زیادہ ترقی پائے۔ بالغوں کو تعلیم دیتے وقت بھی پیش نظر مقاصد میں سے ایک اہم مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ بوقت ضرورت قیادت کا بوجھ سنبھال سکیں۔

غرض تعلیم اور قیادت کی حدیں آپس میں اس قدر ملی جلی ہیں کہ ایک کے متعلق کچھ نہ کچھ واقفیت حاصل کیے بغیر دوسری کو بخوبی سمجھنا ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علم التعلیم اور نفسیات دونوں نے قیادت کے فن پر مختلف نقطہ ہائے نگاہ سے نظر ڈالی ہے۔ اب تک اس موضوع پر جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں سے تقریباً ہر ایک نے کسی مخصوص نظریے کو اچھی قیادت کی شرح کے طور پر پیش کیا ہے۔ ان تمام نظریات کو ایک نگاہ دیکھ لینے سے ہم قیادت کے صحیح مفہوم کے متعلق بہتر تصور قائم رکھ سکتے ہیں۔

ذاتی خصائص کی اہمیت

قیادت کے متعلق ایک نظریہ یہ ہے کہ اس کی کامیابی کا انحصار قائد کے ذاتی خصائص پر ہے۔ پچھلے پچاس برس میں راہ نماؤں اور پیروؤں کے سیکڑوں مطالعے کیے گئے ہیں جن میں ان کے جسمانی، ذہنی اور شخصی خصائص پر نگاہ رکھی گئی ہے۔ ان میں سے ہر مطالعہ کا نتیجہ خصائص کی ایک فہرست تھی۔ مطالعہ کرنے والے نے ان خصائص کو قیادت کی کامیابی کا سبب ٹھہرایا۔ مگر اس قسم کے سیکڑوں مطالعے ہو چکنے کے بعد اب یہ بات عموماً تسلیم کر لی گئی ہے کہ قیادت کو خصائص کے ترازو میں تولنا صحیح طریق کار نہیں۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ خصائص کو بنا قرار دے کر قیادت

۱۰۶ مطالعے کیے گئے ان میں صرف پانچ فی صد خصائص ایسے نظر آئے جو چار یا اس سے زیادہ اشخاص میں مشترک پائے گئے اس ضمن میں ایک بہت سبق آموز مثال ہماری اپنی حالیہ تاریخ کی ہے۔ قائداعظم اور مہاتما گاندھی دورحاضر کے بہت بڑے رہنماؤں میں شمار ہوتے ہیں۔ اپنی اپنی قوموں کے لیے ان کا وجود ایک نجات دہندہ کا ہے۔ مگر ذاتی خصائص کے بارے میں جب ہم دونوں کی شخصیتوں پر نگاہ ڈالتے ہیں تو بہت کم چیزوں کو مشترک پاتے ہیں۔

غرض مختلف کامیاب رہنماؤں کے مطالعہ سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک اپنے شخصی خصائص ماحول اور وراثتی پس منظر کے اعتبار سے بالکل مختلف تھا۔ یہ تفاوت اس بات کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ کامیاب قیادت کا انحصار ذاتی خصائص کے کسی مخصوص مجموعے پر ہرگز نہیں۔

وقتی حالات کی اہمیت

بعض لوگوں نے قیادت کو وقتی حالات کی پیداوار قرار دیا ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ راہنما کا ردعمل مختلف حالات میں اس کے قائدانہ مقام کو زیادہ سے زیادہ بلندی بخشے۔ اس نقطۂ نگاہ کے مطابق قائد کو اس کا قائدانہ مقام دینے والی قوتیں صرف دو قسم کی ہیں:۔

اول۔ اندرونی یعنی ذاتی مقاصد کی قوت۔

دوم۔ بیرونی یعنی معاشرتی تقاضے۔

بعض لوگ قیادت کے مقام کی طرف اس لیے بڑھتے ہیں کہ اس طرح ان کی ذاتی اغراض کی تشفی ہوتی ہے، اس کے برعکس بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ معاشرتی قوتیں از خود انہیں قائدانہ مقام تک پہنچا دیتی ہیں۔ اور انہیں اس کی خبر بھی نہیں ہونے پاتی۔ لیکن ایسا نسبتاً کم ہوتا ہے کہ ان میں سے صرف ایک ہی قوت مصروف کار ہو۔ زیادہ حالتوں میں یہ دونوں قوتیں بیک وقت کام میں لگی ہوتی ہیں۔ ان دونوں کا باہمی امتزاج مختلف حالتوں میں مختلف ہوتا ہے۔ بعض صورتوں میں ذاتی اغراض معاشرتی مقاصد پر غالب ہوتی ہیں اور بعض اوقات معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔

طرز عمل کی اہمیت

بعض عالموں نے قائد کے طرز عمل کو ساری توجہ کا مرکز قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک کامیاب قیادت کی پرکھ اس بات سے ہوتی ہے کہ قائد نے اپنی قائدانہ حیثیت میں کیا رویہ اختیار کیا۔ قائد کے طرز عمل کا انحصار گو اس کی مخصوص حیثیت پر ہوگا

ہر بھی ہر قائد کسی نہ کسی حد تک مندرجہ ذیل چار فرائض کو انجام دیتا نظر آئے گا۔

(۱) رہنما کو اپنے رسمی مقام کو پُر کرنا ہوگا جس طرح آج ملکۂ انگلستان اپنے روائتی مقام کو پُر کر رہی ہے۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ جن رہنماؤں نے اس رسمی مقام کو ختم کرنے کے لیے قیادت حاصل کی بالآخر انھیں بھی یہ مقام پُر کیے بغیر چارہ نظر نہ آیا۔ کرام ویل نے تاج انگلستان کا مقام ختم کر دینا چاہا۔ مگر خود دانستہ یا نادانستہ طور پر اسی مقام پر جا پہونچا اور نہ صرف خود لارڈ پروٹیکٹر کا خطاب اختیار کیا بلکہ اپنے بیٹے کو بھی اس مقام کے لیے نامزد کر گیا۔

(۲) قائد کا دوسرا اہم کام فیصلہ کرنا ہے۔ سیاسی میدان میں اکثر رہنماؤں کا سب سے بڑا کام یہی ہے۔ جمہوری ملکوں میں یہ لوگ اس بات پر مجبور ہیں کہ پس پردہ کیے گئے فیصلوں کو جماعت کے سامنے اس طور پر پیش کیا جائے کہ اسے منظوری دینے کے سوا اور کوئی چارہ ہی نظر نہ آئے۔ بہرحال جہاں قائد خلوص نیت سے عوامی تائید کا خواہاں ہو وہاں وہ پیروؤں کے دل میں اپنے یقین اور اپنی سرگرمی کی چنگاری اس طرح روشن کرے گا کہ قائد کا فیصلہ صحیح معنوں میں عوام کا فیصلہ بن جائے۔

(۳) تیسرا کام جو کم و بیش ہر قائد کو کرنا پڑتا ہے وہ مشورہ دینا یا معلومات بہم پہونچانا ہے۔ پیروکار بجا طور پر قائد کو علم و حکمت اور خلوص کا سرچشمہ خیال کرتے ہیں اور اپنے مسائل میں اس سے رہنمائی چاہتے ہیں۔

(۴) ایک اور کام جو اکثر رہنماؤں کو سرانجام دینا پڑتا ہے وہ منصوبوں کو عملی جامہ پہنانا ہے۔ ہر کامیاب قائد پیروؤں کے سامنے زندگی کا حسین نقشہ پیش کرتا ہے۔ اول اول یہ خاکہ الفاظ میں کھینچا جاتا ہے۔ لیکن زود یا بدیر اس کو حقیقت کا جامہ پہنائے بغیر قیادت کا مفہوم قائم نہیں رکھا جا سکتا۔ مذہبی میدان میں ایسے رہنما موجود ہیں جو اس کام کو آخرت کی زندگی پر ملتوی کر کے خود عملی ذمہ داری سے عہدہ برا ہو جاتے ہیں۔ مگر زندگی کے باقی میدانوں میں یہ حیلہ کام نہیں دے سکتا۔

جیسا پہلے کہا گیا ہے۔ ہر قائدانہ مقام پر ان چاروں فرائض کی تھوڑی بہت بجا آوری ضروری ہے۔ تاہم بعض حالتوں میں کوئی ایک فرض باقی تینوں پر سبقت حاصل کر لیتا ہے۔

انداز قیادت کی اہمیت

پچھلے پندرہ سالوں میں قیادت کے مسئلہ کو ایک اور زاویۂ نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء میں

یونی ورسٹی آف آئی اووامیں یہ معلوم کرنے کے لیے تجربے کیے گئے کہ قائد کے مختلف انداز کس قسم کی جماعتی فضا پیدا کرسکتے ہیں۔ ان تجربوں نے ثابت کیا کہ قیادت تین قسم کے انداز اختیار کر سکتی ہے۔

(۱) مطلق العنانی کا انداز (۲) مزاجی کا انداز (۳) جمہوری انداز

ان تینوں اندازوں کا امتیازی نشان قوت فیصلہ سازی کا محل وقوع ہے۔ اگر قوت فیصلہ سازی قائد کی ذات میں بستی ہے تو قیادت مطلق العنان ہے۔ اگر قوت فیصلہ سازی گروہ کے ہر فرد کے ہاتھ میں ہے تو قیادت مزاجی مزاج کی حامل ہے۔ اگر قوت فیصلہ سازی جماعت کے ہاتھ میں ہے تو قیادت جمہوری انداز رکھتی ہے۔

یونی ورسٹی آف اووا کے ان مطالعوں کے بعد عملی زندگی کے مختلف میدانوں کی قیادت کا مطالعہ کیا گیا۔ صنعت حکومت اور بڑے بڑے اداروں میں بالغوں کے چھوٹے بڑے گروہ جس قسم کی قیادت کے زیر سایہ کام کرتے ہیں وہ ان تینوں قسموں کی قیادت سے جداگانہ پائی گئی جن کا ذکر اوپر گذرا ہے۔ اس قیادت کو نفع رساں مطلق العنان قیادت کا نام دیا جاسکتا ہے۔ مقاصد کے اعتبار سے نفع رساں مطلق العنان قیادت اور جمہوری قیادت میں بظاہر کچھ فرق نہیں مگر دونوں میں ایک فرق بہت نمایاں ہے، وہ یہ کہ نفع رساں مطلق العنان قائد انسانی مراسم کی اس مہارت سے بالکل کورا ہوتا ہے جس کی بدولت کام کاج میں نئی مسائل کا طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔

بعد کے تحقیقی مطالعوں نے یہ بات ثابت کی ہے کہ کسی قائد کو مستقل طور پر کسی مخصوص انداز قیادت کے تحت شمار کرنا درست نہیں۔ عملاً ہوتا یوں ہے کہ ایک قائد ایک خاص موقع پر ایک انداز قیادت اختیار کرے گا تو اس سے مختلف مواقع پر دوسرا انداز قیادت۔

عملی افادیت کی اہمیت

قیادت پر نگاہ ڈالنے کا ایک اور نقطہ نظر یہ ہے کہ اس کی عملی افادیت کو تولا جائے۔ اس نظریے کے حامی یہ کہتے ہیں کہ ہر گروہ اپنے مخصوص وقتی حالات میں ایک مخصوص طریق کار کی ضرورت رکھتا ہے۔ یہ طریق کار گروہ کو اس طریق کار کے معلوم کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کے قابل بنا دیتا ہے۔ قیادت کے اس تصور میں خصائص کے نظریے کو چھوڑ کر، قیادت کے باقی تمام تصورات شامل نظر آتے ہیں۔ مختلف گروہ ایک دوسرے سے بہت سی باتوں میں اختلاف رکھتے ہیں۔ ہر گروہ اپنے مخصوص حالات اور اپنی مخصوص ضرورتیں رکھتا ہے۔ یہ مختلف حالات اس بات کا فیصلہ کریں گے کہ کون سے فرائض کی

بجا آوری ضروری ہے اور وہ فرائض کون انجام دے۔

ہر گروہ کو بظاہر دو مقاصد کے حصول کی ضرورت پڑتی ہے۔ اوّل ۔ جماعتی مقاصد کی تکمیل۔ دوم۔ گروہ کا استحکام قائد کو گروہ کی یہ دونوں بنیادی ضرورتیں پوری کرنا ہوتی ہیں بعض اوقات ایک ہی پتھر سے دو شکار مارے جا سکتے ہیں یعنی قائد کوئی ایسی راہ ڈھونڈ نکالتا ہے جس سے جماعتی مقاصد کی تکمیل بھی ہوتی ہے اور گروہ کا استحکام بھی۔ تاہم ایسا بہت شاذ ممکن ہوتا ہے۔ بسا اوقات ایسی راہ بھی اختیار کرنی پڑتی ہے جو اگر ایک مقصد کو تقویت پہنچاتی ہے تو دوسرے کو نقصان۔ اس کی ایک اچھی مثال ہمارے اپنے ملک کی بعض بے حد غیر مقبول تنظیمیں ہیں۔ اپنے گروہ کے حوصلے برقرار رکھنے کے لیے انہوں نے غیر ملکوں میں شاخیں قائم کر رکھی ہیں۔ ان شاخوں کو چلانے کے لیے لامحالہ کافی روپیہ چاہیے جو بیرون سے بھاری چندوں کی شکل میں وصول کیا جاتا ہے۔ آئے دن کے چندوں کی یہ بھرمار یقینی طور پر گروہ کے استحکام کو نقصان پہنچاتی ہے۔ مگر یہ راہ اختیار کرنے کے سوا چارہ بھی نظر نہیں آتا۔

قیادت کے فرائض کی تقسیم مختلف طریقوں پر ہو سکتی ہے۔ نظری طور پر اس کی ایک انتہائی صورت یہ ہے کہ تمام فرائض قائد کے کندھوں پر ہوں لیکن عملاً یہ ممکن نہیں۔ دنیا کے جابر سے جابر آمر کو بھی بہت سے کام دوسروں کو سونپنے پڑتے ہیں اور دوسروں کو بھروسے میں لینا پڑتا ہے۔ ایک پختہ کار گروہ میں مختلف افراد خود بخود وہ جماعتی ذمہ داریاں قبول کر لیتے ہیں جو جماعتی مقاصد کی تکمیل کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ اس ضمن میں جو مطالعے کیے گئے ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ فرائض قیادت کی تقسیم جس قدر وسیع ہوگی اسی قدر نتائج بہتر نکلیں گے۔ مثلاً جن کارخانوں میں عام کاریگروں اور مزدوروں کو بھی انتظامی امور میں شریک مشورہ کیا جاتا ہے اور انتظامی کام سونپا جاتا ہے وہ پیداوار کے اعتبار سے ایسے کارخانوں سے بہت آگے نکل جاتے ہیں جہاں نظم ونسق کا سارا بوجھ چند گنے چنے کندھوں پر ہو۔ گروہ کے جو افراد جماعتی ذمہ داری اختیار کرتے ہیں ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض یہ بوجھ جماعتی بہبود کی خاطر اٹھاتے ہیں بعض کام سے محبت کی وجہ سے اور بعض اپنی ذات کو نمایاں کرنے کی غرض سے۔ ان لوگوں کی اغراض خواہ کچھ بھی ہوں اس میں کلام نہیں کہ وہ اہم جماعتی خدمات انجام دیتے ہیں۔

گروہی زندگی کو برقرار رکھنے اور اسے ترقی دینے کے لیے افراد جو بھی جماعتی ذمہ داریاں قبول کرتے ہیں ان میں سے ہر ایک کی اپنی مخصوص نوعیت ہوتی ہے۔ ان فرائض کو عام طور پر مندرجہ ذیل اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) حوصلہ افزائی کرنا یعنی ہر غلطہ جماعتی زندگی کے روشن پہلو پر نگاہ رکھنا اور تاریک سے تاریک لمحہ میں بھی روشنی کی کرن کو نظر سے اوجھل نہ ہونے دینا۔

(۲) جذبات کی ترجمانی کرنا یعنی جماعت کے عام خیالات کو ایسے موزوں پیرایہ اور چیدہ الفاظ میں ادا کرنا کہ ہر فرد یہ محسوس کرے کہ اس کے دلی خیالات کی ترجمانی کی گئی ہے۔

(۳) ہم آہنگی پیدا کرنا یعنی مختلف جماعتی سرگرمیوں پر نگاہ رکھ کر ان کے درمیان ایسا ربط پیدا کرنا کہ نتائج بہترین شکل میں نمودار ہوں۔

(۴) سمجھوتہ کرنا یعنی جماعت کے مختلف عناصر کے فطری اختلافات کو اس طرح ایک حد کے اندر رکھنا کہ ان کے درمیان کھلا ہوا ٹکراؤ نہ ہونے پائے بلکہ یہ تمام عناصر مل کر ایک ہی سمت میں حرکت کریں۔

(۵) معیار قائم کرنا یعنی مختلف جماعتی سرگرمیوں میں اس طرح بڑھ چڑھ کر حصہ لینا کہ اوروں کے لیے اچھی مثال قائم ہو جائے اور نیم سرگرم افراد بھی پوری سرگرمی سے مصروف عمل ہو جائیں۔

(۶) اجماع افراد کا تخمینہ کرنا یعنی عام ردعمل سے یہ اندازہ لگانا کہ جماعت کا کتنا فی صد حصہ کسی تجویز کے حق میں ہے۔

(۷) اتباع یعنی جماعتی طور پر طے شدہ طریق کار پر کاربند ہونا۔ یہ آخری فرض وہ ہے جو اگرچہ ہر فرد پر واجب ہوگا لیکن جماعت کی بھاری اکثریت ایسی ہوگی جس نے اپنے ذمے اس کے سوا غالباً کوئی دوسرا فرض نہیں لیا ہوگا جس قدر کوئی گروہ بڑا ہوگا اور وسیع جغرافیائی رقبے میں پھیلا ہوگا، اسی قدر زیادہ امکان یہ ہے کہ اس کی اکثریت کو محض اسی فرض کی بجا آوری سے سروکار ہو تاوقتیکہ مقامی تنظیموں کے ذریعہ تمام افراد کو قیادت کی ذمہ داریوں میں شریک نہ کر لیا گیا ہو

جماعتی زندگی کے روزمرہ کے کاموں میں یہ کام زیادہ اہم ہیں:-

کسی نئی چیز کی تحریک کرنا۔ واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کرنا۔ واقفیت بہم پہونچانا۔ رائے معلوم کرنا۔ امور کی وضاحت کرنا۔ نکات کی شرح بیان کرنا۔ امور کی تلخیص کرنا۔

عملی افادیت کی حامل صرف وہی قیادت کہلائے گی جس میں افراد کو قیادت کے فرائض میں حصہ دار بنایا گیا ہو۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ گروہ کسی شخص کو اپنا قائد نامزد ہی نہیں کرے گا۔ نامزد قائد کا ہونا ضروری ہے۔ اس کا

ام یہ ہوگا کہ جماعت کی عملی فرمودگوں کا کوئی احساس پیدا کرے اور دیکھے کہ یہ فرقہ میں اچھی طرح پوری ہو رہی ہیں۔

غرض قیادت کے مسائل کو جماعتی زندگی کے مسائل سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ قیادت کا مفہوم سمجھنے کے لیے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ گروہی زندگی کیوں کر وجود میں آتی ہے، اور کس طرح ترقی پاتی ہے۔

سرکاری اور کاروباری زندگی میں بہت سے رہنما یہ کہتے سنے جاتے ہیں کہ:- "جمہوری قیادت یعنی حل مسائل کا راستہ ایک بہت اچھا طے ہے مگر اس پر وقت بے حد صرف ہوتا ہے اور مجھے یہ کام جلد ختم کرنا ہے"۔

اس میں کلام نہیں کہ خود اکیلے فیصلے کر لینے یا چال بازی سے اپنے فیصلے کو دوسروں کا فیصلہ ظاہر کرنے کے لیے کم وقت چاہیے اور گروہ کے تمام افراد کو بھروسے میں لے کر فیصلے کرنے کے لیے نسبتاً زیادہ وقت درکار ہے۔ لیکن بعض حالیہ مطالعوں نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ کفایت وقت کے نقطۂ نگاہ سے بھی جمہوری قیادت قابل ترجیح ہے۔ وہ اس طرح کہ وقت شمار کرتے وقت ہمیں صرف فیصلے پر پہنچنے کا وقت ہی شمار نہ کرنا چاہیے بلکہ مسئلہ کے منظر عام پر آنے کے وقت سے لے کر اس کے حل تک کے سارے وقت کو شمار کرنا چاہیے۔ جمہوری قیادت میں فیصلہ پر پہنچنے کے لیے زیادہ وقت لگتا ہے۔ مگر اس فیصلہ کو عملی جامہ پہنانے میں کم وقت۔ وجہ بالکل عیاں ہے۔ جو فیصلہ گروہ کا اپنا فیصلہ ہوگا اس پر عمل درآمد پوری سرگرمی سے ہوتا ہے، اور جو فیصلہ اس پر تھوپا گیا ہو اس پر نیم دلی سے۔

اسلامی قیادت پر عمل

مندرجہ بالا بحث سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ جمہوری قیادت فی الحقیقت اسلامی قیادت کا ہی دوسرا نام ہے کیوں کہ اسوۂ نبوی اسی قسم کی قیادت کی تصویر کھینچتا ہے۔ ایک حدیث میں کہا گیا ہے کہ تم میں سے ہر ایک گلہ بان ہے اور ہر ایک سے اس کے گلہ کی نگہ بانی کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ ایک اسلامی معاشرہ اسی حد تک مضبوط ہوگا جس حد تک ہر گلہ بان اسلامی قیادت کے طریقے کو اپنائے گا۔ اسلامی قیادت پر عمل پیرا ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ہادی اکمل صلی اللہ علیہ وسلم کی تئیس سالہ عملی قیادت کا صحیح تصور حاصل کریں اور اس تصور کی روشنی میں خود قائدانہ فرائض انجام دیں اور دوسروں میں قائدانہ صلاحیت کی پرورش کریں۔

والدین کیا کر سکتے ہیں؟

اویس احمد

انسان ایک معاشرتی حیوان ہے۔ مل جل کر رہنا اس کے خمیر میں داخل ہے۔ ہم خواہ بچے ہوں یا نوجوان۔ لڑکے ہوں یا لڑکیاں۔ نو عمر ہوں یا بوڑھے۔ اپنے ہم عمروں اور ہم جنسوں کے ساتھ اوقات فراغت گزارنے میں لذت محسوس کرتے ہیں۔ یہ اجتماعی زندگی بہت سے انسانی جوہروں کو ابھرنے کا موقع دیتی ہے، انسانی ذہن کے بہت سے بوجھوں کو کم کر دیتی ہے اور تفریح طبع کا اچھا سامان بہم پہونچاتی ہے۔ لیکن اس اجتماعی زندگی کے اپنے خطرات بھی ہیں۔ ہر گروہ اپنے طرز عمل کے بعض معیار مقرر کر لیتا ہے۔ گروہی زندگی میں حصہ لینے والا ہر فرد چار و ناچار ان معیاروں کو قبول کرتا ہے۔ اگر گروہی زندگی کے معیار بلند و پاکیزہ ہوں تو اس زندگی میں حصہ لینا نہایت پسندیدہ اخلاقی تربیت کے مترادف ہو جاتا ہے اگر بدقسمتی سے گروہی زندگی کے معیار پست اور قابل نفرت ہوں تو اس میں حصہ لینا اخلاق کی تباہی کا سبب بن جاتا ہے۔

جدید معاشرتی آداب

ہائی سکولوں کی اعلیٰ جماعتوں اور کالجوں میں پڑھنے والے طلبہ اور طالبات کے والدین کو عموماً ان معاشرتی آداب کی سخت شکایت ہے جو ان نونہالوں نے اختیار کر رکھے ہیں، رات کو دیر سے دوستوں کی محفلوں یا تصویر گھروں سے لوٹ کر آنا صبح دن چڑھے تک سوئے پڑے رہنا۔ سگرٹ اور پان کا دلدادہ ہونا۔ کرکٹ وغیرہ کے میچوں میں کئی کئی دن ضائع کر دینا۔ احکام دین سے لاپرواہی برتنا یہ اور اسی طرح کی کئی اور شکایتیں والدین کو اپنی نوجوان اولاد کے خلاف عام ہیں جب والدین دل سوزی کے ساتھ انہیں ان تمام نہاد "ترقی پسند" معاشرتی آداب سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہمیشہ بنا بنایا جواب مل جاتا ہے کہ "میں اکیلا تھوڑا ایسا کرتا ہوں۔ آج کل سبھی یوں کرتے ہیں"۔

یہ جواب والدین کو خاموش کر دیتا ہے۔ مگر جی میں وہ بہت کڑھتے ہیں کہ ان کی اولاد کو کیسا زمانہ نصیب ہوا جب معاشرتی آداب اس قدر ناپسندیدہ قسم کے ہیں۔

اس معاملے میں بعض والدین کا طرز عمل بے حد غیر معقول قسم کا ہے۔ وہ اپنے نور نظر کی بے راہ روی کا سارا الزام

اس کے ساتھیوں کے سر تھوپتے ہیں اور بڑی معصومیت سے دلیل یہ دیتے ہیں کہ اس بیچارے کو تو ان باتوں کی خبر تک نہ تھی جب سے فلاں فلاں کے ساتھ دوستی گانٹھی ہے اسی وقت سے اس نے یہ طور طریقے اختیار کیے ہیں، یہ استدلال خود فریبی کے سوا کچھ نہیں۔ بہت اغلب یہ ہے کہ بیٹے کے جن ساتھیوں پر الزام دھرا جا رہا ہے اگر ان کے والدین سے پوچھا جائے تو وہ اسی معصومیت کے ساتھ ساری ذمہ داری ان صاحب کے برخوردار کے سر دھریں اور اس کو سب برائیوں کا سرچشمہ ٹھہرائیں۔

حقیقت پسندی کی ضرورت

اصل معاملہ یہ ہے کہ انسانی فطرت کے حقائق سے آنکھیں بند کر لینے سے کبھی کچھ فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ والدین کو یہ بات سمجھ لینا چاہیے کہ گروہی زندگی میں حصہ لینا ان کے نوجوان بچے یا بچی کے لیے بالکل ناگزیر ہے، اسے اس کے ہم جولیوں سے الگ تھلگ نہیں رکھا جا سکتا۔ ان کی یہ شکایت بجا ہے کہ ان کے فرزند نے نئے معاشرتی طور طریقے اس گروہی زندگی سے اخذ کیے ہیں لیکن اس کے لیے گروہ کے کسی خاص فرد پر سارا الزام نہیں دھرا جا سکتا۔ یہ درست ہے کہ گروہ کے بعض افراد ہمیشہ زیادہ قائدانہ کردار ادا کرتے ہیں لیکن گروہی طور طریقوں کے معیار قائم کرنے میں ہر فرد کچھ نہ کچھ حصہ ضرور لیتا ہے۔

اگر والدین غلط وضع کے معاشرتی طور طریقوں کا سد باب کرنا چاہتے ہیں تو اس کی صورت یہ ہے کہ وہ مل کر کوئی سائنسی طریق کار اختیار کریں، دوسرے ملکوں میں والدین کی مجلسیں قائم ہیں جو نہ صرف مدرسے کا ہاتھ بٹاتی ہیں بلکہ بعض امور میں خود بھی مثبت اصلاحی قدم اٹھاتی ہیں۔ نوجوانوں کے معاشرتی آداب کو بدلنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کی گروہی زندگی کے معیاروں کی اصلاح ہو۔ جب یہ معیار پسندیدہ ہوں گے تو گروہی زندگی میں حصہ لینے والوں کے طور طریقے از خود درست ہونے لگیں گے۔

نوخیز نوجوانوں کے معاشرتی طور طریقوں کے متعلق صرف ہمیں ہی شکایت نہیں۔ یہ شکایت تقریباً عالمگیر ہے۔ اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ایک ترقی یافتہ ملک کے کچھ والدین نے جو طریق کار حال میں اختیار کیا تھا اس کا حال معلوم کرنا پاکستانی والدین کے لیے دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

والدین کی تشویش اور اس کا علاج

فلاڈلفیا (ریاست ہائے متحدہ امریکہ) کے ایک نواحی قصبے میں واقع مدرسوں کے ذمہ دار لوگوں کو نوعمر طلبہ کے معاشرتی آداب کے متعلق بہت تشویش ہونے لگی۔ والدین بھی یکساں طور پر پریشان تھے۔ پریشانی کی وجوہ یہ تھیں کہ نوجوان طلبہ اور طالبات رات کو غیر معمولی طور پر دیر کر کے گھروں میں آتے تھے۔ ان کی شبینہ محفلوں میں خوب پرشور ہنگامے ہوتے تھے

شراب نوشی کی شکایت عام ہو رہی تھی، موٹروں کے حادثوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ جب والدین اپنے نوجوان بچوں کو ان باتوں سے منع کرتے تو فوراً جواب ملتا۔ "واقعی ہر شخص اسی طرح کرتا ہے"۔ یا۔ "آیا جان میں اکیلا ہی تو ایسا نہیں کرتا"۔

بالآخر مجلس والدین متعلقہ ثانوی مدارس نے اپنا اجلاس بلایا۔ یہ مجلس سترہ ثانوی مدرسوں کی نمائندہ تھی۔ اجلاس کی غرض یہ تھی کہ علاقے کے نوجوانوں کے اخلاق کی اصلاح کے لیے قابل عمل ذرائع سوچے جائیں۔

مجلس نے پہلا کام یہ کیا کہ والدین اور طلبہ دونوں کے نام ایک سوالنامہ جاری کیا۔ اس کے جوابوں کا تجزیہ کرنے پر معلوم ہوا کہ والدین کی غالب اکثریت اپنی اولاد کے معاشرتی طور طریقوں سے سخت نالاں ہے۔ مگر ان طور طریقوں کو "زمانے کی ہوا" سمجھ کر با دل ناخواستہ انہیں برداشت کیے جا رہی ہے۔ ان جوابوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ والدین "سبھی اس طرح کرتے ہیں" کے جواب کے سامنے عاجز ضرور ہیں۔ مگر ان کی دلی خواہش یہ ہے کہ کوئی اجتماعی کوشش انہیں اس عاجزی سے نجات حاصل کرنے میں مدد دے۔

نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی طرف سے جو جواب موصول ہوئے ان سے ظاہر ہوتا تھا کہ ان کی اکثریت ان معاشرتی طور طریقوں کو دل سے ناپسند کرتی ہے لیکن گروہ میں ہر دلعزیز ہونے کی خواہش اور ساتھیوں میں نمایاں ہونے کا جذبہ انہیں یہ "ناپسندیدہ" اطوار اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ کئی نوجوانوں نے کھلے الفاظ میں یہ کہا کہ :- "اگر گروہ کے لیے اچھے معیار قائم کرائے جائیں تو ہمارے لیے انکار کرنا مشکل نہ رہے گا"۔

سوالناموں کے جواب موصول ہو جانے کے بعد متعلقہ مدرسوں میں استادوں نے اپنی اپنی جماعتوں میں اس موضوع پر بات چیت کی۔ طلبہ اور طالبات نے بڑی آزادی سے اپنے دلی خیالات کا اظہار کیا۔ انہوں نے اپنی محفلوں میں ہنگامہ بازی کو سخت ناپسند کیا۔ مگر ساتھ ہی کہا۔

"ہم ہنگامہ بازوں کے ساتھ کس طرح عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ اس کا علاج یہی ہے کہ اس صورت حال پر قابو پانے کے لیے والدین ہمارا ہاتھ بٹائیں۔ یہی اودھم مچانے والے اکثر شراب بھی لے کر آتے ہیں"۔

بعض دوسرے نوجوانوں نے کہا کہ ہم یہ پسند نہیں کرتے کہ والدین ہماری تفریحی محفلوں میں شریک ہوں، لیکن ہم یہ ضرور چاہتے ہیں کہ بوقت ضرورت ان کی مدد حاصل کی جا سکے۔ اوقات کے متعلق بھی ہم لچک کو پسند کرتے ہیں تاہم یہ بھی چاہتے ہیں کوئی معیار ضرور قائم ہو جائیں۔

اس طور پر جب صحیح صورت حال کا پورا جائزہ لیا جا چکا تو مجلس والدین نے طلبہ کے ساتھ مل کر معاشرتی آداب کا ضابطہ لیا جسے اخلاقی پیمانے کا درجہ دیا گیا۔ ان اصولوں کو ایک کتابچے کی شکل میں شائع کیا گیا۔ ان اصولوں میں سے مثال کے طور پر ے یہ تھا کہ والدین کو پوری طرح معلوم ہونا چاہیے کہ جب ان کے نوجوان بچے گھر سے باہر ہیں تو وہ کہاں اور کس کے ساتھ وقت نار رہے ہیں۔ مقررہ معیاروں میں ایک یہ بھی تھا کہ نوجوانوں کی معاشرتی سرگرمیوں کا مرکز گھر ہونا چاہیے۔ نیز ان سرگرمیوں کا منصوبہ ی عرصہ پہلے سے والدین کے علم سے تیار ہونا چاہیے۔ ایسے موقعوں پر والدین کو گھر پر موجود رہنا چاہیے اور بلانے پر فوراً پہنچ جانا چاہیے۔ ہ تحاشہ طور پر لمبی محفلوں کی حوصلہ افزائی نہ ہونی چاہیے ۔

اس کتابچے میں کاروں کو احتیاط سے چلانے کے متعلق مفید ہدایات درج تھیں اور بتایا گیا تھا کہ کار کو احتیاط سے چلانا ار چلانے والے اور کار کے سواروں کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔ بہت سی تو بس سواروں کے حوصلہ دلانے اور تمسخر اڑانے سے واقع ہو جاتی ہیں۔ ان ہدایات کے علاوہ اس بات کا اہتمام بھی کیا گیا کہ ایک تجربہ کار موٹر ڈرائیور نوجوانوں کو تربیت دے۔ شراب نوشی کی عادت کو والدین کی ذاتی ذمہ داری قرار دیا گیا اور یہ وضاحت کر دی گئی کہ والدین کے سوا اور کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ ان کے بچوں کو شراب پیش کرے۔ نوجوانوں کو یہ خیال ترک کر دینا چاہیے کہ پیش کردہ شراب سے انکار کرنا ایک بے عزتی ہے۔

اس ساری کوشش کے نتائج بہت حوصلہ افزا ثابت ہوئے۔ مدرسوں اور والدین دونوں کو نوجوانوں کے معاشرتی آداب کے متعلق نسبتاً کم شکایت باقی رہ گئی •

امتحان بلا نگرانی کا ایک
کامیاب تجربہ

صفدر علی۔

غالباً اس سے زیادہ وثوق سے تاریخ کی کوئی بات نہیں کہی جا سکتی کہ امتحان بلا نگرانی کا تجربہ سب سے پہلے اس علیم و خبیر نے شروع کیا جو اگر چاہتا تو باقی مخلوقات کی طرح انسان بھی اس کے قوانین سے یک سرِ مو ادھر ادھر نہ ہو سکتا۔ لیکن اس نے اسے نجدین کی ہدایت دے کر اور رشد کو غی سے بین کر کے فرمایا۔ اب تیرے لیے کوئی اکراہ و مجبوری نہیں ہے ۔ اِمَّا شَاکِرًا وَّاِمَّا کَفُوْرًا۔

امتحانات نظامِ تعلیم کا ایک لازمی جزو قرار پا چکے ہیں۔ ہر مدرس کچھ عرصہ پڑھانے کے بعد یہ جاننا چاہتا ہے کہ اسکی محنت کہاں تک کامیاب ہوئی ہے۔ لیکن امتحانی پرچہ کا ایک لازمہ کڑی نگرانی ہے۔ اس کے بغیر استاد کو یہ یقین ہی نہیں ہو سکتا کہ کسی خاص طالب علم نے جو جواب دیا ہے وہ فی الواقع اس کا اپنا جواب ہے۔ لیکن نگرانی کا واضح مطلب یہ ہے کہ طلبہ کی دیانت اور امانت پر بھروسہ نہیں کیا جا رہا۔ یہ احساس ان کے دلوں میں کئی قسم کی نفسیاتی الجھنیں پیدا کر سکتا ہے۔ اس خرابی کو دور کرنے کے لیے امتحان بلا نگرانی کے تجربے کیے گئے ہیں۔ بہرحال یہاں ایک ایسے تجربے کو بیان کیا جا رہا ہے جو ملت ہائی سکول ملتان میں کیا گیا۔ ایک تو اپنی نوعیت کا پہلا تجربہ ہونے کی حیثیت سے اور دوسرے سکول میں ہال نہ ہونے کے سبب ہر کلاس میں سے پہلے دس دس رول نمبروں کو لے کر ایک کمرے میں ساٹھ طلبہ بٹھائے گئے۔

کلاس مانیٹروں کو ہی ناظمین مقرر کیا گیا تھا کہ اگر کسی کو ردی کاغذ سیاہی یا کسی دیگر چیز کی ضرورت پڑے تو وہ پوری کریں۔ لڑکوں کو کلاس وار اور اتنے ہی قریب قریب بٹھایا گیا جتنے دوسرے کمروں میں باقی طلبہ تھے۔ تاکہ انہیں اپنے صحیح اور غلط جائز و ناجائز ارادوں کے مطابق عمل کرنے کی کھلی چھٹی ہو۔

ناظمین کو خفیہ ہدایت تھی کہ کسی کو کمرۂ امتحان میں نہ ٹوکیں خواہ وہ کچھ کریں۔ جب تمام پرچے حل ہو چکے تو ایک سوالنامہ مرتب کر کے طلبہ کو دیا گیا جس کا جواب طلبہ نے تحریری اور خفیہ طور پر دیا۔

سوالنامہ یہ تھا :-

ہید :- آپ مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات بالکل سچ سچ بیان کریں۔ اپنی کوتاہی کا اعتراف کریں۔ یہ ایک اچھی عادت ہے

(۱) کیا آپ نے خود نقل کی ہے ؟

(۲) کیا آپ نے کسی کو نقل کرائی ہے یا کچھ مدد کی ہے ؟

(۳) کیا آپ کے علم میں ہے کہ کمرہ امتحان میں کسی طالب علم نے نقل کی ہے ؟

(۴) کیا آپ اس طریقہ امتحان کو پسند کرتے ہیں ؟

نتیجتاً صرف دو کیس نکلے ایک لڑکے نے تاریخ کے پرچے میں کچھ نقل کی تھی جس نے خود اعتراف کیا۔ سوال نمبر ۳ کے جوابات میں بھی صرف ان ہی دو کیسوں کا حوالہ دیا گیا۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ ناظمین نے بھی صرف انہی کی بابت رپورٹ کی۔ سوال نمبر ۴ کا جواب متفق طور پر اثبات میں تھا اور بعض ذہین طلبہ نے باختلاف الفاظ اس امر کا بھی اظہار کیا کہ اگر مستقبل میں بھی انہیں اسی طرح قابل اعتماد سمجھا گیا تو وہ اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کریں گے۔

لیکن یہ بات اس سکول کی ہے جہاں بچے کی شخصیت کا قدم قدم پر خیال رکھا جاتا ہے۔ جسمانی سزا وہاں نظم کے علاوہ بالکل نہیں۔ بچوں کو ہمیشہ "آپ" کے لفظ سے خطاب کیا جاتا ہے۔ عربی لازمی ہے۔ کلاس میں مختلف فرائض مختلف طلبہ کے سپرد ہیں۔ مانیٹر واقعی نائب معلم ہے۔ سکول کے اکثر امور طلبہ سرانجام دیتے ہیں۔ سکول کے کسی معاملے میں طلبہ اپنے نمائندگان کے ذریعے کھلے طور پر بات چیت کر لیتے ہیں اور ان کے جائز مطالبات کو کبھی نہیں ٹھکرایا جاتا۔ اس سب کے ساتھ ساتھ سٹاف بہترین اور جذبہ ایثار سے یکسر خالی ہے ؟

تعلیمی دُنیا پر ایک نظر

کیا تعلیم غیر معمولی قابلیت کے بچوں کا اجارہ ہونی چاہیے؟

ریاست ہائے متحدہ امریکہ دنیا کے ان ممالک میں سے ہے جہاں ہر قسم کی تعلیم کے دروازے ہر شخص پر کھلے ہیں۔ تاہم اس ملک میں بھی کہیں کہیں یہ آواز بلند ہوتی رہتی ہے کہ اعلیٰ تعلیم قابل اور ذہین بچوں کا اجارہ ہونی چاہیے۔ معمولی قابلیت کے طالب علموں پر اس کے دروازے بند ہونے چاہئیں۔

حال ہی میں نیویارک شہر کے ایک طب کے طالب علم سالک نامی نے بچوں کے فالج کا ایک موثر ٹیکہ دریافت کر کے نہ صرف طبی دنیا میں ایک تہلکہ پیدا کر دیا ہے بلکہ محدود تعلیم کے حامیوں کے پاؤں تلے سے زمین بھی سرکا دی ہے۔ وہ یوں کہ سالک کی شہرت کے چمکتے ہی اخباری لوگوں کو اس کے حالات زندگی کی تلاش ہوئی۔ وہ اس کے باپ کے پاس پہونچے اور اس کے بچپن کے حالات پوچھے۔ اس پر بڑے میاں نے بلا تامل کہا، مجھے اس کے متعلق کوئی ایسی بات یاد نہیں جسے غیر معمولی کہا جا سکے۔ وہ بالکل ایک سیدھا سادا اوسط بچہ تھا۔ مدرسے کے طالب علمی کے زمانے میں اس نے کبھی کوئی غیر معمولی امتیاز حاصل نہیں کیا۔ میں اس کے متعلق صرف اسی قدر کہہ سکتا ہوں کہ اگر میں اپنا آبائی ملک چھوڑ کر امریکہ میں نہ آجاتا تو سالک کو شاید مدرسے میں جانا بھی نصیب نہ ہوتا۔ اس ملک میں اسے تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا اور یہی چیز اس حیرت انگیز طبی ایجاد کا موجب بنی۔

اس واقعہ نے اہل امریکہ کے اس یقین کو پھر سے تازہ کر دیا ہے کہ ایجاد و اختراع کا ملکہ کسی خاص درجہ کے ذہنی خارج قسمت یا کسی خاص معاشرتی طبقے کے ساتھ مخصوص نہیں، اس کی ترقی اور تلاش کی اکیلی صورت یہ ہے کہ ہر بچے کو اپنی استعداد اور پسند کے مطابق تعلیم حاصل کرنے کی کھلی چھٹی ہو۔ تاکہ کوئی قابل جوہر ضائع نہ ہونے پائے۔

نئے ٹیکے کے امکانات

بچوں کے فالج کو روکنے کے لیے جو ٹیکہ ایجاد کیا گیا ہے ابھی تک اس کی بہم رسانی مانگ کے برابر نہیں۔ ایک طبی ادارے کے صدر نے اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ سنہ ۱۹۵۶ء کے خاتمہ تک یہ دوائی اتنی مقدار میں پیدا ہونے لگے گی کہ ساری ضرورتوں کو پورا کر دے۔

اس نئی طبی ایجاد پر تبصرہ کرتے ہوئے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے سرجن جنرل نے کہا کہ یہ بے حد حوصلہ افزا ایجاد ہے جن ستر لاکھ بچوں کو اس دوائی کا ٹیکہ لگایا گیا ہے وہ ۵۰ سے ۸۰ فی صد تک پولیو کے حملہ سے بچے رہے ہیں ۔

مدرسوں میں موٹر ڈرائیوری کی تعلیم

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں موٹر ڈرائیوری مدرسے کا ایک مقبول مضمون ہے۔ اس مضمون کی مقبولیت دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ سال رواں میں تین ریاستوں نے خاص قوانین منظور کر کے نوعمر ڈرائیوروں کی تسلی بخش تربیت کے لیے بجٹ میں رقمیں مہیا کیں ۔

استاد کا مقام

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے سابق صدر ٹرومین نے اپنی خود نوشت سوانح حیات میں لکھا ہے، "مجھے کسی ایسے استاد سے سابقہ نہیں پڑا جو برا ہو۔ بے شک میرے مختلف استادوں میں بڑا اختلاف تھا لیکن وہ ذہین کا نمک تھے۔ انہوں نے ہمیں بہت بلند مقاصد عطا کیے"

اسی طرح امریکہ کے ایک اور سابق صدر ہربرٹ ہوور نے اپنے استادوں کے متعلق یہ الفاظ لکھے ہیں :-

"تعلیم کی سمت میں میں نے پہلا قدم پبلک سکولوں میں اٹھایا۔ اس وقت کے استادوں کے ساتھ میرے دل میں اب تک محبت باقی ہے ۔ مدرسے کے دنوں میں جو دوستیاں قائم ہوئی تھیں ان میں سے اکثر بعد کی زندگی میں بے حد مستحکم ثابت ہوئیں ۔

امریکی پریس بے ٹیرین چرچ کی ۱۶۷ ویں جنرل اسمبلی نے تعلیم پر رائے زنی کرتے ہوئے کہا۔ ہم اس بات کی طرف توجہ مبذول کرانے ہیں کہ ہمارے مدرسوں کو مزید عمارتوں اور استادوں کی ضرورت ہے۔ اس الزام کو قابل افسوس قرار دیتے ہیں کہ ہمارے پبلک مدرسے لادینی ادارے ہیں۔ استاد تعلیمی افسر اور تعلیمی انجمنیں اخلاقی اور روحانی قدروں پر زور دینے کے لیے بہت کچھ کر رہے ہیں۔ نوجوانوں کو یہ احساس دلانا ضروری ہے کہ پبلک مدرسوں میں پڑھانا عیسائیت کی خدمت ہے۔ ہم اپنے چرچ کے اراکین سے پرزور طور پر اپیل کرتے ہیں کہ وہ ایسی تنظیموں میں حصہ لیں جن کا مقصد تعلیمی سہولتوں اور استادوں کی تنخواہوں کو بہتر بنانا ہو۔

نئی پود کا اخلاقی معیار | دنیا کے تقریباً ہر ملک میں یہ رجحان عام ہے کہ نئی پود کے اخلاقی انحطاط کو نمایاں کیا گیا

امریکہ کے چیف آف سٹاف جنرل سکیویل ڈی ٹیلر نے اس کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے کہا ہے کہ:-

میں پسند نہیں کرتا کہ کوئی شخص ہمارے نوجوانوں کے عام انحطاط کے متعلق ہمہ گیر الفاظ میں بات چیت کرے آج کل کے نوجوان بدستور ان تمام اوصاف کے حامل ہیں جنہوں نے پچھلے سالہا سال میں پسندیدگی کی سند حاصل کر لی ہے اور جن کو ہم اپنے نوجوانوں میں موجود دیکھنے کے خوگر ہو چکے ہیں۔ یہ اوصاف مندرجہ ذیل ہیں۔

(ا) بنیادی فہم جس پر باقی عمارت کی تعمیر ہوتی ہے۔

(ب) بیدار مغزی۔

(ج) جن چیزوں میں دلچسپی پیدا ہو جائے ان کے لیے سرگرمی۔

(د) اپنے ساتھیوں اور اپنے اداروں کے ساتھ دوستی اور وفاداری۔

یونیسکو کی سرگرمیاں

حبشہ کے رکنیت حاصل کر لینے سے یونیسکو کے اراکین ملکوں کی تعداد ۷۰ کو جا پہونچی ہے۔ آج تک رکنیت کی تعداد اس بلندی کو نہ پہونچی تھی۔

کتابوں کے حقوق کو عالمگیر طور پر محفوظ کرنے کے لیے یونیسکو نے جو تجویز پیش کی تھی وہ اب کامیاب ہو چکی ہے بارہ اراکین ملک نے اس تجویز کی تصدیق کر دی ہے۔ منظوری کے لیے صرف اسی قدر تعداد کی تائید ضروری تھی۔ مختلف ملکوں میں کتابوں کے حقوق کے متعلق جو قوانین مروج ہیں انہیں ایک رابطے میں لے آنے سے عالمگیر ثقافتی مراسم کو ترقی ملے گی۔

یونیسکو کی ایک رپورٹ مظہر ہے کہ دو سو سال کے عرصہ میں اس سال پہلی بار یہ ممکن ہوا ہے کہ یورپی یونیورسٹیوں کے بیشتر نمائندے ایک مقام پر جمع ہوں۔ یہ اجتماع کیمبرج کے مقام پر ہوا۔ اس میں ۲۰۰ مندوبین نے شرکت کی بہت سے مشترکہ مسائل پر تبادلہ خیالات ہوا۔ زیر بحث مسائل میں سے ایک یہ بھی تھا کہ عام تعلیم کو نظر انداز کر کے کسی ایک مضمون میں خصوصی مہارت پر توجہ مرکوز کر دینے کے خطرات کیا ہیں۔

جنیوا میں منعقد ہونے والی یونیسکو کانفرنس میں مشرقی اور مغربی حکومتوں کے ۷۰ نمائندوں نے متفقہ طور پر یہ سفارش کی کہ اسلحہ کی بجائے تعلیم پر زیادہ روپیہ خرچ کیا جائے۔ تعلیمی صورت حال پر اظہار رائے کرتے ہوئے کانفرنس نے کہا کہ کوئی ایک انداز کار ساری دنیا کے لیے کارآمد نہیں ہو سکتا بعض ملکوں میں مقامی خود اختیاری زیادہ موزوں ہو گی۔

اور بعض میں رہنمائی کا کام زیادہ تر یا تمام تر مرکز کے ہاتھ میں رہنا ہی مناسب ہوگا۔ اسی طرح قومی میزانیہ کا جو حصہ تعلیم پر صرف ہو رہا ہے وہ بھی مختلف ملکوں میں بہت مختلف ہے۔ یونیسکو کے اعداد و شمار ظاہر کرتے ہیں کہ اس میدان میں رہنمائی کا شرف جاپان۔ فلپین، کوسٹاریکا اور آئرش لینڈ کو حاصل ہے۔ یہ وہ ملک ہیں جو قومی میزانیہ کا بیس فی صد تعلیم خرچ کرتے ہیں۔

تربیت یافتہ اشخاص کی کمی۔

امریکی سیکرٹری آف لیبر جیمز پی مچل نے اپنے ایک حالیہ مضمون میں کہا ہے کہ امریکہ میں فنی ماہروں اور مشین کاروں کی جو خطرناک کمی محسوس ہونے لگی ہے اس کے مختلف اسباب ہیں۔ اس کا ایک سبب یہ ہے کہ ۴۵ سال سے اوپر عمر کے لوگوں کو ملازم رکھنے میں ہچکچاہٹ سے کام لیا جاتا ہے، دوسرا سبب یہ ہے کہ ابتدائی تربیت کے معاملے میں حبشیوں اور عورتوں سے برابر کا سلوک نہیں کیا جاتا۔ تیسرا سبب یہ ہے کہ تربیتی منصوبوں میں کوئی ہم آہنگی موجود نہیں۔

تربیت یافتہ فنی کاری گروں کی کمی کا ذکر کرتے ہوئے مضمون نگار کہتا ہے کہ :- ہماری بالغ شہری آبادی کی تعداد ساڑھے چھ کروڑ ہے۔ اس میں فنی ماہروں کی کل گنتی صرف نوّے لاکھ کو پہنچتی ہے۔

اسی قسم کے ایک اور مضمون میں بتایا گیا ہے کہ سنہ ۱۹۷۰ء تک دفتروں میں کام کرنے والے لوگوں کی بہم رسانی بھی مانگ سے کم ہو جائے گی۔

ایٹمی قوت کے کمیشن کے صدر لوئس ایل سٹراس نے کہا ہے کہ روس اور امریکہ کے مقابلے میں تیز رفتار سے سائنس دانوں اور انجینئروں کو تربیت دے رہا معلوم ہوتا ہے۔ اس نے مزید کہا کہ آج امریکہ کو جس قدر انجینئروں کی ضرورت ہے ہم ان سے صرف کوئی آدھی تعداد کو تربیت دے رہے ہیں۔

اعلیٰ تعلیم کے اخراجات

امریکہ کی پرائیویٹ اور سرکاری یونیورسٹیوں میں پڑھائی کے اخراجات بہت بڑھ چکے ہیں۔ تاہم کالجوں اور یونیورسٹیوں کی فیسوں میں جو اضافہ ہوا ہے اس کے مقابلے میں اہل امریکہ کی اوسط انفرادی آمدنی تین گنا بڑھ چکی ہے۔ اس کے باوجود امریکہ میں اعلیٰ قابلیت کے ایسے لڑکے اور لڑکیاں موجود ہیں جو اخراجات برداشت کرنے کے ناقابل ہونے کی وجہ سے کالج میں پڑھائی جاری نہیں رکھ سکتے۔

حال ہی میں اعلیٰ قابلیت رکھنے والے ثانوی مدارس کے طلبہ کا ایک قومی مطالعہ کیا گیا۔ اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ اعلیٰ قابلیت کے جو طلبہ اور طالبات ہائی سکول کے بعد آگے کالج میں نہیں جاتے۔ اگر انہیں وظائف کی شکل میں مدد مل سکے تو چار میں سے تین ایسے ہوں گے جو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہیں گے۔ اس مطالعہ سے یہ بھی ظاہر ہوا ہے کہ ہر سال چوٹی کی قابلیت کے تقریباً دو لاکھ طلبہ اور طالبات اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے کالجوں کا رخ نہیں کرتے۔ کوشش اس امر کی ہو رہی ہے کہ کالج اور یونیورسٹیاں وظائف کی تعداد اس حد تک بڑھا دیں کہ یہ تمام نوجوان آسانی سے آگے تعلیم جاری رکھ سکیں۔

وائٹ ہاؤس کانفرنس

۲۸ نومبر ۱۹۵۵ء کو صدر آئزن ہاور نے وائٹ ہاؤس میں ایک تعلیمی کانفرنس طلب کی تھی۔ یہ اپنی نوعیت کی پہلی کانفرنس تھی۔ اس سے پہلے بھی وائٹ ہاؤس میں تعلیمی معاملات پر بات چیت کے لیے کانفرنسیں بلائی گئی ہیں مثلاً ۱۹۳۰ء میں دیہی تعلیم پر ایک کانفرنس طلب کی گئی تھی۔ مگر پچھلی کانفرنسیں کسی مخصوص موضوع یا محدود تعلیمی پہلو سے متعلق رہی ہیں۔ جبکہ نومبر ۱۹۵۵ء کی کانفرنس کا موضوع مدرسوں میں دی جانے والی تعلیم تھا۔ اس کانفرنس میں ۴۸ امریکی ریاستوں اور پانچ امریکی علاقوں سے کوئی دو ہزار لوگوں نے شرکت کی۔ ان لوگوں میں نہ صرف تعلیم کے نمائندے شریک تھے بلکہ زندگی کے باقی تمام گوشوں کے بھی۔ کانفرنس نے جن سوالوں پر خصوصی توجہ صرف کی وہ مندرجہ ذیل تھے:-

(۱) ہمارے مدرسوں کو کون سے مقاصد حاصل کرنے چاہئیں؟

(۲) نظام مدارس کو زیادہ کفایت اور زیادہ بہتر تدریس کے لیے کس طور پر منظم کرنا چاہیے۔

(۳) مدرسوں کی عمارات کے متعلق ہماری ضرورتیں کیا ہیں؟

(۴) کافی تعداد میں اچھے استاد حاصل کرنے اور انہیں اس پیشے میں رکھنے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟

(۵) مدرسوں کے مالیات سے عہدہ برآ ہونے کی کیا صورت ہو کہ ہم انہیں تعمیر بھی کر سکیں اور چلا بھی سکیں؟

(۶) تعلیم میں عوامی دلچسپی برقرار رکھنے کی کیا صورت ہو؟

عوضی استاد

دوسرے لوگوں کی طرح زندگی کی مجبوریاں بعض اوقات استادوں کو بھی اس بات پر مجبور کرتی ہیں کہ کام سے تھوڑے لمبے عرصے کے لیے غیر حاضر رہیں۔ اس اثناء میں ان کی جگہ دوسرے لوگوں کی تقرری کر دی جاتی ہے، جو عوضی استاد کہلاتے ہیں

ن لوگوں کو عموماً قابل التفات نہیں سمجھا جاتا۔ مدرسے کے استاد انہیں اپنے میں سے خیال نہیں کرتے۔ متعلم ان کی رائے معلوم کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ مدرسہ کے منتظم حضرات ان لوگوں کی تنخواہ اور شرائط ملازمت کے بارے میں غیر معمولی سختی سے کام لیتے ہیں۔ تاہم یہ بات قابل انکار ہے کہ عوضی استاد تعلیمی دنیا میں ایک اہم خدمت انجام دیتے ہیں۔

امریکی استادوں کی قومی تنظیم این۔ ای۔ اے نے اس مسئلہ کا سائنسی مطالعہ کیا ہے۔ اس مطالعہ کے نتائج مارچ ۱۹۵۵ء میں شائع کیے گئے تھے۔ اس جامع رپورٹ میں عوضی استادوں کی تنخواہ ان کے کام اور ان کی شرائط ملازمت پر پوری بحث کی گئی ہے۔ اس تحقیقی مطالعہ سے متاثر ہو کر ریاست ویسٹ ورجینا کے ایک سپرنٹنڈنٹ تعلیم نے اصلاح حال کے لیے مندرجہ ذیل منصوبہ تیار کیا :-

(۱) مدرسے کے نئے سال کے آغاز پر استادوں کے جو اجتماع ہوتے ہیں ان میں عوضی استادوں کو بھی بلایا جائے گا خواہ وہ اس وقت کام سے فارغ ہی ہو چکے ہوں۔

(۲) عوضی استادوں کا ایک خاص جلسہ طلب کیا جائے گا تاکہ این۔ ای۔ اے کے تحقیقی مطالعہ کے بعض اہم نکات پر بحث کی جا سکے۔

(۳) عوضی استادوں سے درخواست کی جائے گی کہ وہ ایسی قابل عمل تجاویز پیش کریں جن سے ان کی حیثیت میں اضافہ ہو اور کمرۂ جماعت میں ان کی کارکردگی کی خوبی بڑھ جائے۔

(۴) استادوں کی ایک تربیتی درس گاہ میں عوضی استادوں کے لیے تجدیدی نصاب کا بندوبست کیا جائے گا۔ بالخصوص ایسے عوضی استادوں کے لیے جن کی پیشہ ورانہ قابلیت ادنیٰ درجہ کی ہے۔

(۵) مستقل استادوں سے درخواست کی جائے گی کہ وہ اس بات پر خاص توجہ دیں کہ عوضی استادوں کی موثر مدد کس طور پر کی جا سکتی ہے اور وہ خود اس سلسلے میں کیا خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ استادوں سے یہ بھی درخواست کی جائے گی کہ رخصت پر جانے سے پہلے عوضی استاد کے لیے ایک مستقل لائحہ کار تیار کر دیا کریں۔

Regd. No. L. 5327

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اور

آموزش (اردو)

۱ - پاکستا بھر میں یہ دو ھی تعلیمی رسالے ھیں - جنکو سرکاری سرپرستی اور امداد حاصل ہے -

۲ - پاکستان بھر میں یہی دو تعلیمی رسالے ھیں - جو مرکزی اور صوبائی درسگاھوں اور تعلیمی حلقوں میں مقبول ھیں -

۳ - ان رسالوں کے متعلق ادارتی خطوط اور چھپنے والے مضامین ایڈیٹر (پرنسپل) سنٹرل ٹریننگ کالج لاھور کو بھیجے جائیں - ان رسالوں میں چھپے ھوئے مضامین کیلئے معاوضہ دیا جاتا ہے -

۴ - یہ رسالے ھر مہینے کے دوسرے ھفتہ میں چھپتے ھیں اور ان کا چندہ آٹھہ روپیہ (انگریزی) اور چھہ روپیہ (اردو) ہے - جو کہ مینجر کو بھیجنا چاھئے -

۵ - ان رسالوں میں اشتہار دینے سے آپکی اشیاء مقبول ھونگی - تجارتی معاملات کیلئے خط و کتابت منیجر سے کریں -

مینجر
پنجاب ایجوکیشنل جرنل
اموزش

۲ کچہری روڈ - لاھور (پاکستان)